آج

٦٢

فرانز کافکا

نیر مسعود

شمس الرحمٰن فاروقی

رالف رسل

ترتیب

اجمل کمال

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

آج

ادبی کتابی سلسلہ شمارہ 62

مارچ 2009

سالانہ خریداری:
پاکستان: ایک سال (چار شمارے) 500 روپے (بشمول ڈاک خرچ)
بیرون ملک: ایک سال (چار شمارے) 60 امریکی ڈالر (بشمول ڈاک خرچ)

رابطہ:
پاکستان: آج کی کتابیں، 316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400
فون: 5213916 5650623
ای میل: ajmalkamal@gmail.com

دیگر ممالک:
Dr. Baidar Bakht, 21 White Leaf Crescent, Scarborough,
Ontario M1V 3G1, Canada.
Phone: (416) 292 4391Fax: (416) 292 7374
E-mail: bbakht@rogers.com

Scanned with CamScanner

ترتیب

❄

کافکا کے افسانے

ترجمہ: نیر مسعود

نیر مسعود

8

کافکا

فرانز کافکا

17	شکاری گریکس
24	گیلری میں
26	ایک قدیم مخطوطہ
29	پاس سے گذرنے والے
30	خانہ دار کی پریشانیاں
32	بے خیالی میں کھڑکی سے دیکھنا
33	حویلی کے پھاٹک پر دستک
35	پل

Scanned with CamScanner

37 بالٹی سوار
41 ایک عام خلفشار
43 ایک چھوٹی سی کہانی
44 دوغلا
47 لباس
48 قصبے کا ڈاکٹر
56 درخت
57 نیا وکیل
59 اگلا گاؤں
60 گیدڑ اور عرب
65 ریڈ انڈین ہونے کی خواہش
66 فیصلہ

❁

نیر مسعود: بارہ مضامین

نیر مسعود

85 میر کا مسکن اور مدفن
96 ذکرِ میر کا بین السطور
115 میر اور خان آرزو
125 رجب علی بیگ سرور کے نثری اسالیب
136 توبۃ النصوح منظوم

Scanned with CamScanner

159 اکبر کی علامت سازی

174 خوفناک دنیا

199 خواہش زدہ تحقیق

214 فسانۂ عجائب مرتبہ رشید حسن خاں

219 ناول کی روایتی تنقید

235 خان چاچا

245 الہ آباد

❄

شمس الرحمٰن فاروقی

261

نول کشور پریس

❄

رالف رسل

269

کچھ کھویا کچھ پایا

(خودنوشت سوانح کا دوسرا حصہ — باب 12-10)

Scanned with CamScanner

اس شمارے کا آغاز فرانز کافکا (Franz Kafka) کی بیس مختصر تحریروں کے ترجموں سے کیا جا رہا ہے۔ یہ ترجمے اردو کے ممتاز افسانہ نگار نیر مسعود کے کیے ہوئے ہیں۔ ان ترجموں پر مشتمل مختصر مجموعہ کافکا کے افسانے کے عنوان سے 1978 میں ہندوستان سے شائع ہوا تھا۔ یہ ترجمے پاکستان میں کبھی نہیں چھپے اور مذکورہ مجموعہ اب ہندوستان میں بھی نایاب ہے۔ کافکا کی تحریروں پر یوں تو اردو کے متعدد مترجموں نے طبع آزمائی کی ہے، لیکن یہ ترجمے ان تمام کوششوں میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ اپنے تعارفی مضمون میں نیر مسعود نے کافکا کی تحریروں کی معنویت اور اردو فکشن پر ان کے اثرات پر نہایت خوبی اور اختصار سے اظہار خیال کیا ہے۔

Scanned with CamScanner

فرانز کافکا

کافکا کے افسانے

انگریزی سے ترجمہ
نیر مسعود

Scanned with CamScanner

کافکا

3 جون 1924 کو جب فرانز کافکا کی وفات ہوئی تو اسے کوئی بڑا ادبی سانحہ نہیں سمجھا گیا۔ اس وقت تک وہ جرمن زبان کا ایک غیر معروف سا افسانہ نگار تھا جس کی تحریریں اپنے نہایت واضح بیانیہ انداز کے باوجود مفاہیم کے اعتبار سے اہمال کی حد تک مبہم تھیں اور ان کی تعداد بھی زیادہ نہیں تھی۔ اس نے کچھ غیر مطبوعہ تحریریں بھی چھوڑی تھیں لیکن اس وصیت کے ساتھ کہ اُن کا ایک ایک حرف بغیر پڑھے جلا دیا جائے۔ اس وصیت پر عمل نہیں کیا گیا اور نہ صرف یہ تحریریں بلکہ ان کے وہ جملے اور الفاظ بھی چھاپ دیے گئے جن کو اس نے قلم زد کر دیا تھا یا بدل دیا تھا۔

بیس سال کے اندر اندر ان تحریروں میں چھپے ہوئے آسیب نگاہوں کے سامنے آنے لگے۔ ہٹلر کے نازی جرمنی کو یہ آسیب اپنی بنیادیں ہلاتے محسوس ہوئے اور ان تحریروں کی اشاعت ممنوع قرار دے دی گئی؛ مگر اس وقت بھی یہ سمجھنا مشکل تھا کہ کافکا کا شمار جدید ادب پر سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والی شخصیتوں میں ہو جائے گا، یہاں تک کہ اشتراکی دنیا بھی ایک مدت تک اس کو نظر انداز کرنے کے بعد اسے غور سے پڑھنا شروع کر دے گی۔

اس وقت کافکا کو دستوئیفسکی کی طرح ادبیات میں پیچیدہ ترین دماغ کا مالک سمجھا جاتا ہے۔ اس کی تحریروں کی مذہبی و روحانی، صوفیانہ، فلسفیانہ، مابعد الطبیعیاتی، سماجی، اخلاقی، نفسیاتی، جنسی تاویلیں کی جا رہی ہیں اور اس کی تحریروں میں ہر تاویل کا جواز موجود ہے۔ خود کافکا ان تحریروں کو اپنی خواب نما باطنی زندگی کی عکاسی قرار دیتا ہے اور تاویلیں اب تک اس باطنی زندگی کو پوری طرح گرفت میں نہیں لا سکی ہیں۔ اتنا البتہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ کافکا کی یہ باطنی زندگی اس کی ظاہری زندگی سے بہت مختلف ہے۔

Scanned with CamScanner

فرانز کافکا 3 جولائی 1883 کو پراگ (چیکوسلوویکیا) میں پیدا ہوا۔[1] اس نے پراگ کے جرمن اسکولوں میں تعلیم پائی اور بعد میں اپنے طور پر چیک زبان وادب کا بھی غائر مطالعہ کیا۔ وہ بھائی بہنوں میں سب سے بڑا تھا اور اس کے بعد والی بہن اس سے چھ برس چھوٹی تھی۔ عمر کے اسی فرق کی وجہ سے اس کا بچپن تنہائی کی کیفیت میں گذرا اور اسے کھیل کود میں کوئی خاص دلچسپی پیدا نہ ہو سکی۔ البتہ اپنے ماں باپ کی سالگرہ کے موقعوں پر وہ چھوٹے چھوٹے ڈرامے لکھتا تھا جو گھر میں کھیلے جاتے تھے، لیکن کافکا خود ان ڈراموں میں کام نہیں کرتا تھا۔ وہ خود کو بدصورت سمجھتا، اسی وجہ سے اس کو عمدہ نئے کپڑوں کی خواہش نہیں ہوتی تھی اور وہ پرانے خراب سلے ہوئے کپڑے پہن کر دبا سکڑا ہوا چلتا تھا۔

کافکا کا باپ ہرمان کافکا ایک کیم شحیم آدمی تھا جو زندگی میں بڑی جدوجہد اور جفاکشی کے بعد کامیاب ہوا تھا۔ کافکا اپنے باپ سے خائف تھا۔ وہ خود کو اس کے ساتھ ایک مستقل سرد جنگ میں مبتلا پاتا تھا۔ یہ ذہنی جنگ تھی۔ کافکا اپنے باپ سے کہیں زیادہ ذہین تھا لیکن اس کے باوجود، اور اغلباً اسی وجہ سے، وہ اپنے باپ کو اپنی ذہنی اذیت کا احساس نہیں کرا پاتا تھا۔ اس کو اپنا باپ بے رحم، سرد مہر اور بے حس معلوم ہوتا تھا، اگرچہ حقیقت شاید یہ نہ تھی۔ شاذ و نادر ایسے موقعے بھی آتے تھے (مثلاً کافکا کی بیماری) جب اسے اپنا باپ مہربان انسان معلوم ہوتا اور ان موقعوں پر کافکا خوشی سے رونے لگتا تھا۔ باپ کے سلسلے میں کافکا کی ذہنی کشمکش کی بہترین روداد وہ طویل خط ہے جو اس نے نومبر 1919 میں لکھا تھا اور اسے باپ تک پہنچوانے کی ناکام کوشش کی تھی۔ اس کے علاوہ اس کی مشہور ترین طویل کہانی ''قلبِ ماہیت'' اور ایک اور کہانی ''فیصلہ'' میں بھی باپ کے ساتھ اس کے تعلقات کی نہایت عمدہ آئینہ داری ہوئی ہے۔ خوش گفتار کافکا باپ سے گفتگو کرتے وقت اٹکنے اور ہکلانے لگتا تھا (''آپ کے سامنے میری خود اعتمادی رخصت ہو جاتی ہے اور ایک طرح کا احساسِ جرم اس کی جگہ لے لیتا ہے'')۔ اس نفسیاتی کشمکش سے کافکا کبھی چھٹکارا نہ پا سکا لیکن جوانی میں اس کی ظاہری شخصیت سے اس کشمکش کا سراغ نہیں ملتا تھا۔

---

[1] کافکا کے حالاتِ زندگی میکس براڈ کی لکھی ہوئی سوانح عمری سے لیے گئے ہیں۔

Scanned with CamScanner

دیکھنے میں وہ ایک تندرست نوجوان تھا جس کی صحبت بہت خوشگوار ہوتی تھی ۔ دوستوں میں وہ جی کھول کر ہنستا ہنساتا اور شگفتہ اور پر مغز گفتگو کرتا تھا۔ سماجی زندگی میں وہ ایک روشن فکر اور بڑے سلجھے ہوے دل و دماغ کا انسان تھا جس کے ذہن میں ہر خیال نہایت واضح ہوتا تھا اور اتنی ہی وضاحت کے ساتھ وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتا تھا۔ اگر کوئی دوست کسی مشکل میں پڑ جاتا تو کافکا اس کو مناسب ترین مشورے دیتا تھا جو مصلحت اور عقل دنیا سے مملو ہوتے اور عموماً مشکل کو حل کر دیتے تھے۔ لیکن اپنے نجی معاملات میں وہ بے دست و پا اور شش و پنج میں مبتلا نظر آتا تھا۔ وہ خود کو کمال انسانی کے بلند ترین معیاروں پر جانچتا تھا جس کی وجہ سے اس میں ایک موہ لینے والی حیا اور کم آمیزی پیدا ہوگئی تھی جو مافوق الفطرت سی لگتی تھی اور کبھی کبھی اس کی شخصیت کے گرد تقدس کا ہالہ بنا دیتی تھی۔

شروع شروع میں کافکا نے اپنی ادبی سرگرمیوں کو صیغۂ راز میں رکھا۔ وہ اپنی ابتدائی تحریریں ضائع کر دیتا تھا۔ اس کا قریب ترین دوست میکس براڈ بھی ایک عرصے تک اس بات سے بے خبر رہا کہ کافکا لکھتا بھی ہے۔ جب کافکا نے ایک اخبار کے تحریری مقابلے میں اپنا افسانہ بھیجا اس وقت براڈ کو اس کے اس مشغلے کا علم ہوا۔ 1907 میں برلن کے ایک ہفت روزہ رسالے میں براڈ نے قابل ذکر مصنفوں کی فہرست میں کافکا کا نام بھی شائع کر دیا۔ اُس وقت تک کافکا کی کوئی تحریر منظر عام پر نہیں آئی تھی۔ اس پر کافکا نے اس کا خاصا مضحکہ اڑایا۔[2]

پراگ کی یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد کافکا نے دستور کے مطابق ایک سال تک عدالت میں بلا اُجرت پریکٹس کی۔ 1908 میں بڑی دوادوش کے بعد اس کو پراگ کی ایک بیمہ کمپنی میں کلرکی مل گئی۔ وہ کمپنی کے انسداد حادثات والے شعبے میں تھا اور اسے حادثات کا شکار ہونے والوں کے معاملات دیکھنا ہوتے تھے۔ کمپنی کی سالانہ رپورٹ کے لیے کافکا نے ایک خالص دفتری نوعیت کا مضمون لکھا لیکن اس مضمون میں بھی اس کے منفرد ذہن کی رَو دوڑی ہوئی ہے۔ وہ پوری توجہ اور دلچسپی سے اپنے منصبی فرائض انجام دیتا تھا اور بظاہر اس دفتری زندگی سے بالکل مطمئن تھا؛ لیکن اس کی ڈائریوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ذہنی اذیت میں مبتلا تھا اور اسے اس بات کی شدید

---

2 کافکا کی موت کے بعد براڈ ہی نے اس کی غیر مطبوعہ اور مسترد تحریریں تلاش کر کر کے شائع کیں۔

Scanned with CamScanner

کوفت تھی کہ دفتری مصروفیت اس کی ادبی صلاحیتوں کو ابھرنے نہیں دے رہی ہے۔(''میرے ذہن میں کیسی زبردست دنیا آباد ہے مگر اسے کیونکر باہر لاؤں؟'') ان ڈائریوں میں مختلف تحریروں کے خاکے، پلاٹ اور ناولوں یا افسانوں کی شروعات لکھی ہوئی ہے۔ ان میں سے بہت کم تحریریں مکمل ہو سکیں۔ کافکا کا خیال تھا کہ فرصت اور یکسوئی میسر ہو تو وہ کئی دن تک شبانہ روز مسلسل لکھ سکتا ہے۔ اسے یقین تھا کہ اس کے اندر تخلیقی صلاحیتیں جوش مار رہی ہیں اور ان کو بروئے کار لانے سے خود اس کی الجھنیں حل ہو سکتی ہیں، لیکن اسے لکھنے کا زیادہ موقع نصیب نہیں ہوتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خودکشی کے بارے میں سوچنے لگا۔

1909 سے کافکا کی تحریروں کی اشاعت شروع ہوئی، لیکن ان کی طرف کوئی خاص اعتنا نہیں کی گئی اور بظاہر خود کافکا کو اپنی ادبی شہرت اور کامیابی یا اپنی تحریروں کے چھپنے میں کوئی دلچسپی بھی نہیں تھی۔

اگست 1912 میں کافکا کی ملاقات ایک لڑکی ف سے ہوئی (جس کے نام اس کی کہانی ''فیصلہ'' معنون ہے) اور اس کے دل میں شادی کے خیالات نے شدت پکڑی۔ دو سال تک ان دونوں کے تعلقات میں مدوجزر آتے رہے اور کافکا ف کے ساتھ شادی کرنے یا نہ کرنے کے تذبذب سے اذیت میں مبتلا رہا۔ 1914 کے وسط میں ف کے ساتھ اس کی منگنی ہوئی اور تین مہینے کے اندر ٹوٹ گئی۔ اس کے دو مہینے کے بعد کافکا نے اپنا شاہکار ناول مقدمہ لکھنا شروع کیا (جسے چھپوانا اس نے پسند نہیں کیا تھا اور اسے جلا دینے کی وصیت کی تھی)۔ ف کے ساتھ اس کی خط و کتابت بھی جاری تھی اور وہ اس کے ساتھ شادی نہ کرنے کے فیصلے سے مطمئن نہیں تھا۔ پانچ سال تک وہ اسی کشمکش میں مبتلا رہا۔ اسی اثنا میں اس نے اپنے گھریلو ماحول سے پیچھا چھڑانے کی بھی کوشش کی اور الگ ایک کمرہ لے کر رہنے لگا۔ یہ پہلی جنگِ عظیم کا زمانہ تھا۔ اس نے فوج میں بھرتی ہونا چاہا لیکن خرابی صحت کی بنا پر کامیاب نہ ہو سکا۔ اس دوران اس کی تخلیقی صلاحیتیں عروج پر تھیں اور حلقۂ احباب میں اس کی صحبت بہت خوشگوار تھی۔ ایک بار پھر اس نے ف سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس کی تیاریاں بھی شروع کر دیں، لیکن اس پر بیماری کا حملہ ہوا اور وہ خون تھوکنے لگا۔ بالآخر اس نے ف سے شادی نہ کرنے کا حتمی فیصلہ کر لیا۔ ف کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا اور اپنے ہمراز دوست میکس براڈ کے پاس آ کر زندگی

Scanned with CamScanner

میں پہلی اور آخری بار پھوٹ پھوٹ کے رویا۔ اس کے ڈیڑھ سال بعد فے کی شادی ہوگئی۔

1915 میں کافکا نے اپنی ڈائری میں لکھا تھا: ''یہاں کوئی نہیں جو مجھ کو پوری طرح سمجھتا ہو۔ اگر ایسا کوئی مل جائے تو گویا مجھے خدا مل جائے۔'' زندگی کے آخری دور میں ڈورا کی دوستی نے کافکا کی یہ مراد شاید پوری کر دی۔ 1923 میں ڈورا سے اس کی دوستی کا آغاز ہوا۔ اس وقت وہ چالیس سال کا اور ڈورا انیس بیس سال کی لڑکی تھی۔ کافکا نے طے کر لیا کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر برلن میں ڈورا کے ساتھ زندگی گذارے گا۔ چنانچہ جولائی میں وہ اپنے گھر والوں کی مخالفت کو نظر انداز کر کے برلن چلا گیا اور پہلی بار اس نے اعتراف کیا کہ وہ خوش ہے۔ اس کی صحت کچھ زیادہ ہی خراب ہوگئی تھی مگر وہ خوش تھا۔ یہیں اس کی یہ دیرینہ تمنا بھی پوری ہوگئی کہ والدین کے سائے میں پلنے والے بیٹے کے بجائے خود مختار انسان کی حیثیت سے زندگی بسر کرے۔ اس کا تخلیقی کام بھی جاری تھا، لیکن اسی زمانے میں جرمنی میں اشیا کی قلت اور گرانی کا دور شروع ہو گیا۔ سردی ہولناک تھی اور کوئلہ نایاب۔ کرسمس (1923) اور سالِ نو (1924) کے درمیان کافکا پر تپ کے کئی حملے ہوئے۔ گرانی نے اس کو پریشان کرنا شروع کیا اور اب اسے زندگی کی گاڑی آگے بڑھانا دشوار معلوم ہونے لگا۔ وہ کبھی کبھی اپنے دوستوں سے ان پریشانیوں کا ذکر بھی کرتا مگر مزاح کے پیرائے میں۔

آخر کار کافکا کی بیماری نے واضح طور پر تشویشناک صورت اختیار کر لی۔ 17 مارچ 1924 کو میکس براڈ اسے پراگ لے آیا۔ کچھ دن بعد ڈورا بھی پراگ آ گئی۔ کافکا اب پھر اپنے والدین کے ساتھ رہ رہا تھا اور محسوس کر رہا تھا کہ آزاد زندگی کے لیے جدوجہد میں وہ ناکام ہو چکا ہے۔ گھر والوں کی پوری توجہ اور خدمت کے باوجود اس کی حالت بگڑتی گئی۔ وہ دق کا مریض تھا۔ اسے ایک سینے ٹوریم میں داخل کیا گیا، وہاں سے ویانا کے ایک اسپتال میں منتقل کیا گیا اور اپریل کے آخر میں ایک اور سینے ٹوریم میں بھرتی کیا گیا، لیکن کہیں کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اب یہ بات یقینی ہوگئی، اور کافکا خود بھی سمجھ گیا، کہ وہ مر رہا ہے۔ اس پر رہ رہ کر درد کے دورے پڑتے تھے۔ کچھ نگلنے اور کھانسنے سے یہ درد اور بھی شدید ہو جاتا، اور اب محض مارفیا وغیرہ کے انجکشن دے کر تکلیف کا احساس کم کرانا ہی اس کا علاج رہ گیا تھا۔

2 جون 1924 کی شام کو وہ اچھا بھلا اور خوش و خرم نظر آ رہا تھا۔ اس دن اس نے اپنی ماں

Scanned with CamScanner

اور باپ کے نام ایک خط لکھا اور اپنی ایک زیرِ طبع کتاب کے پروف دیکھے۔ نصف شب کے قریب وہ سو گیا لیکن صبح ہوتے ہی اس کا تنفس بگڑ گیا۔ نزع کی شدت میں وہ ڈاکٹر پر خفا ہونے لگا۔ وہ کوئی ایسی دوا چاہتا تھا جو اس کی تکلیف کا خاتمہ کردے۔ وہ زہر چاہ رہا تھا۔ اس نے ڈاکٹر سے کہا:

''مجھے مار ڈالو، نہیں تو میرا خون تمھاری گردن پر ہوگا۔''

اس کا دوست ڈاکٹر کلاپستاک اس کے پاس سے اٹھنے لگا، کافکا نے اسے روکا۔ ڈاکٹر نے کہا، ''میں تمھیں چھوڑ کر جا نہیں رہا ہوں۔'' کافکا بولا:

''مگر میں تمھیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔''

اسی دن، سہ شنبہ 3 جون 1924 کو، اکتالیس سال کی عمر میں فرانز کافکا مر گیا۔

کافکا کی طویل کہانی ''قلبِ ماہیت'' کا ہیرو ایک صبح سو کر اٹھتا ہے تو دیکھتا ہے کہ وہ انسان سے ایک بہت بڑے مکوڑے میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اس کے ناول مقدمہ کے ہیرو کو ایک دن اچانک بتایا جاتا ہے کہ اس کو گرفتار کر لیا گیا ہے اور اس پر مقدمہ چلایا جائے گا؛ مگر اسے یہ نہیں بتایا جاتا کہ اس کا جرم کیا ہے، مقدمہ کس قانون کے تحت دائر ہوا ہے، اس کی سماعت کب اور کہاں ہوگی؛ اور وہ ان سب باتوں سے بے خبر، اپنی صفائی کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ آزاد گھومتا ہے لیکن جانتا ہے کہ وہ زیرِ حراست ہے۔ بالآخر اس کو موت کی سزا ہو جاتی ہے۔ اسے نہیں معلوم کہ یہ سزا کب اور کس عدالت میں کس نے سنائی، بلکہ اسے کوئی یہ بھی نہیں بتاتا کہ اس کو موت کی سزا سنائی گئی ہے، پھر بھی جب دو مسخرے قسم کے جلاد اس کے پاس آتے ہیں تو وہ چپ چاپ اُن کے ساتھ ہو لیتا ہے اور جلاد اس کو لے جا کر ذبح کر دیتے ہیں۔ کافکا کے ایک اور ناول قلعہ کے ہیرو کو ایک قلعے میں ملازمت مل جاتی ہے لیکن جب وہ کام پر پہنچتا ہے تو اس کو قلعے میں داخلہ نہیں ملتا، اسے یہ بھی نہیں معلوم ہو پاتا کہ اس کو ملازم رکھنے والے کون ہیں، ملازمت کی شرائط کیا ہیں، اور اس کے ذمے کون سے کام ہیں، لیکن وہ اپنے فرائض انجام دیتا رہتا ہے اور مرتے دم تک اسے ان سوالوں کے جواب نہیں ملتے۔

ظاہر ہے یہ سب تمثیلی کہانیوں کے پلاٹ ہیں، لیکن فرانز کافکا کا فن یہ ہے کہ اس کی تحریر کو پڑھتے وقت اس پر تمثیل کا گمان نہیں گذرتا اور اس کا قاری انہونی سے انہونی بات کو ایک حقیقت کی

طرح قبول کر لیتا ہے۔ ''قلبِ ماہیت'' کے ہیرو کا مکوڑا بن جانا خود ہیرو اور اس کے ماں باپ کے ساتھ قاری کو بھی ذہنی دھچکا پہنچاتا ہے، لیکن اس کے بعد وہ اس حقیقت کو تسلیم کر لیتا ہے، اور پھر اس حقیقت کی اہمیت بھی اتنی نہیں رہ جاتی جتنی اس بات کی کہ مکوڑا بن جانے کے بعد اس کے مسائل کیا ہیں۔ مقدمہ میں مقدمے کی ہر بات کا نامعلوم ہونا قاری کو کچھ دیر کے لیے متحیر کرتا ہے لیکن آخر ہیرو کے ساتھ اس کے ذہن میں بھی مقدمے کا جواز پیدا ہو جاتا ہے اور زیادہ اہمیت اس کی ہو جاتی ہے کہ اس مقدمے میں کامیابی کیونکر ممکن ہے۔ اور ہیرو کا سزائے موت پانا بھی کسی انجانے قانون کی رو سے عین انصاف معلوم ہوتا ہے اور جب ذبح ہو کر دم توڑتے وقت ہیرو کہتا ہے، ''ایک کتے کی طرح،'' تو قاری کا ذہن بھی اس کی ہم نوائی کرتا ہے۔ اسی طرح قلعہ میں ملازمت کی بے سروپائی کا احساس بہت جلد ختم ہو جاتا ہے اور اصل سوال یہ سامنے آتا ہے کہ اس صورت میں ملازم اپنے فرائض کیونکر انجام دے اور مخالف عناصر سے کس طرح بچے۔

یہی نہیں، انسان کا مکوڑا بن جانا، ایک انجانے قانون کے تحت کسی پر مقدمہ چلنا اور سزائے موت، ایک بے سروپا ملازمت، کافکا کے یہاں یہ سب باتیں مہمل لگنے کے بجائے کسی نہایت پراسرار منطق پر مبنی اور بالکل قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہیں جن کی بنیادوں پر اٹھنے والے مسائل قاری کو کبھی دہشت زدہ کر دیتے ہیں، کبھی مایوس اور کبھی اس کے جذبات کو کچل کر رکھ دیتے ہیں۔

دستوئیفسکی کی تحریروں کے برخلاف، جنھیں پڑھ کر انسان اپنے آپ کو بدلا ہوا محسوس کرتا ہے، کافکا کی تحریر پڑھ کر اسے دنیا بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ شروع شروع میں کافکا کی تحریر خوابِ پریشاں کا تاثر دیتی ہے لیکن آخر آخر یہ خواب حقیقت بن جاتا ہے، اور مطالعہ ختم کر لینے کے بعد جب قاری اپنی مانوس دنیا میں واپس آتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک نئے خوابِ پریشاں میں داخل ہو گیا ہے، لیکن اس خوابِ پریشاں میں انتشار نہیں ہے بلکہ کسی مرموز نظام کے تحت اس میں سب کچھ ایک دوسرے سے مربوط ہے۔ ربط کا یہ احساس قاری کے دماغ میں ہلچل پیدا کر دیتا ہے اور اس کو ہر چیز میں ایک نہایت مبہم مگر نہایت اہم قسم کی معنویت نظر آنے لگتی ہے۔ یہ معنویت مذہبی سے لے کر جنسی تک ہو سکتی ہے۔ کافکا کی تحریروں کی کثیر التعداد تاویلوں کا یہی سبب ہے اور یہی کافکا کی انفرادیت ہے۔

نئے اردو افسانے پر بھی براہ راست یا بالواسطہ کافکا کا اثر پڑا ہے، لیکن عموماً یہ اثر خوشگوار سے زیادہ ناگوار صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ کافکا کی تحریروں کا اصل مفہوم، مقصد، پیغام — جو بھی کہہ لیجیے — کتنا ہی مشکل، مبہم، پیچیدہ کیوں نہ ہو، اس کا بیانیہ نہایت واضح و روشن، مربوط اور جزئیات کے انتخاب میں اس کی حیرت خیز چابکدستی کا ثبوت ہے۔ اسے پڑھ کر فلابیر کی یاد آتی ہے (جس سے کافکا بہت متاثر تھا — کافکا ہی نہیں، دستوئیفسکی بھی)۔ اسے پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ اس روشن بیانیے کے پیچھے بہایت دقیق، دوررس اور پیچ در پیچ معانی کی ایک نیم تاریک دنیا آباد ہے۔ نئے اردو افسانہ نگاروں میں سے بیشتر نے یہ کیا کہ پیچ در پیچ معانی پیدا کرنے کی فکر میں اپنے بیانیے ہی کو مبہم، نیم تاریک اور پیچ در پیچ کر دیا، جسے پڑھ کر اندیشہ ہوتا ہے کہ اس پیچاک کے پیچھے جو مفاہیم ہیں وہ کہیں بہت سرسری اور پیش پا افتادہ نہ ہوں۔ کافکا بہت سلجھے ہوئے اسلوب میں بات کہتا ہے اور اس کا قاری از خود اس کے مفاہیم کو الجھانے اور پیچ دینے پر مجبور ہوتا ہے؛ یہ افسانہ نگار الجھے ہوئے جملوں میں بات کہتے ہیں اور ان کے قاری پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اس الجھی ہوئی بات کو سلجھا کر اصل مفہوم تلاش کرے۔ اور اسی تلاش کے سوال پر قاری اور افسانہ نگار دونوں ایک دوسرے سے بدگمان اور آزردہ ہو جاتے ہیں۔ البتہ جن نئے افسانہ نگاروں نے کافکا کی طرح اپنے بیانیے کو روشن رکھا ہے اور اُن کے یہاں ایک ایسی معنویت کا احساس ہوتا ہے جس تک قاری ہمدردی کے ساتھ پہنچنا چاہے، انھیں کافکا سے صحیح طور پر متاثر کہا جا سکتا ہے۔

اس مجموعے میں کافکا کی چھوٹی بڑی بیس تحریریں شامل ہیں۔ میں نے 1971 میں کافکا کی پانچ مختصر تحریروں کا ترجمہ ماہنامہ شب خون میں شائع کیا تھا۔ عزیز دوست شمس الرحمٰن فاروقی نے فرمائش کی کہ میں اس کی کچھ اور تحریروں کو ترجمہ کر کے اسے کتابی صورت دے دوں۔ انھوں نے ترجمے کی متعدد مشکلیں بھی حل کیں۔ فروری 1974 تک یہ سب ترجمے مکمل ہو گئے، مگر طباعت کے ہفت خواں طے کرنے کی ہمت نہ تھی۔ اس لیے میں نے مسودے کو طاق نسیاں پر رکھ دیا۔ 1974 کے آخر میں ڈاکٹر مسیح الزماں کی نظر اس مسودے پر پڑی اور وہ اسے اپنے ساتھ الہ آباد لے گئے۔ دس دن کے اندر اس کی کتابت شدہ کاپیاں انھوں نے مجھ کو بھیج دیں اور لکھا کہ اس کا مقدمہ اور تصحیح شدہ کاپیاں

Scanned with CamScanner

بھیج دو، کتاب ایک ہفتے کے اندر تیار ہو جائے گی۔ میں نے مقدمے کا مسودہ تیار کر لیا لیکن اس کو آخری شکل میں صاف نہیں کرنے پایا تھا کہ فروری 1975 میں ڈاکٹر مسیح الزماں کی اچانک وفات ہو گئی اور میں اس مجموعے سے برگشتہ خاطر ہو گیا۔

اب خدا خدا کر کے اس کی اشاعت کی نوبت آ رہی ہے۔ قمر احسن، انیس اشفاق، محمد مسعود، شہنشاہ مرزا، شاہ نواز اور دوسرے نوجوان ادیب دوستوں کو اس کی اشاعت میں دلچسپی تھی اور یہ مجموعہ انھیں نوجوان دوستوں اور ان کے ہم قلم ساتھیوں کی نذر ہے۔

نیر مسعود

شکاری گریکس

بندرگاہ کی دیوار پر دو لڑکے بیٹھے ہوئے پانسے سے کھیل رہے تھے۔ تاریخی یادگار کی سیڑھیوں پر بیٹھا ایک شخص اخبار پڑھ رہا تھا اور اس سورما کے سائے میں سستا رہا تھا جو تلوار علم کیے ہوئے تھا۔ ایک لڑکی چشمے سے بالٹی بھر رہی تھی۔ ایک پھل والا اپنی ترازو کے پاس لیٹا سمندر کو گھور رہا تھا۔ ایک کیفے کی کھلی ہوئی کھڑکی اور دروازے میں سے دو آدمی کیفے کے اُس سرے پر شراب پیتے دیکھے جا سکتے تھے۔ کیفے کا مالک سامنے ہی میز کے پیچھے بیٹھا تھا اور اونگھ رہا تھا۔ ایک بادبانی جہاز چھوٹی سی بندرگاہ کی طرف ایسی خاموشی کے ساتھ بڑھتا چلا آ رہا تھا جیسے کوئی غیر مرئی شے اسے پانی کے اوپر چلا رہی ہو۔ نیلی وردی پہنے ہوئے ایک شخص جہاز سے اتر کر کنارے پر آیا اور ایک حلقے میں سے جہاز کی رسی گذار کر کھینچنے لگا۔ اس جہاز والے کے پیچھے پیچھے دو اور آدمی، سنہرے بٹنوں والے سیاہ کوٹ پہنے ہوئے، ایک ارتھی لیے ہوئے چل رہے تھے جس پر پڑے ہوئے ریشمی چھینٹ کے جھالر دار کپڑے کے نیچے کوئی آدمی لیٹا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

گھاٹ پر کسی نے بھی ان نوواردوں کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا، حتیٰ کہ جب انھوں نے جہاز والے کے انتظار میں جو ابھی تک رسی سے الجھا ہوا تھا، ارتھی زمین پر رکھ دی تب بھی کوئی ان کی طرف نہیں بڑھا، کسی نے ان سے کوئی سوال نہیں کیا، کسی نے ایک بار بھی ان کی طرف استفہامی نظروں سے نہیں دیکھا۔

جہاز والے کو ایک عورت کی وجہ سے مزید رکنا پڑا جو ایک بچے کو چھاتی سے لگائے، بال کھولے ہوئے، اب عرشے پر نظر آ رہی تھی۔ پھر وہ آگے بڑھا اور اس نے ایک زردی مائل رنگ کے دومنزلہ

مکان کی طرف اشارہ کیا جو سمندر کے کنارے بائیں طرف ڈھلوان پر بنا ہوا تھا۔ ارتھی والوں نے اپنا بار اٹھایا اور اس کو نیچے نیچے مگر شاندار کھمبوں والے دروازے پر لے گئے۔ ایک چھوٹے سے لڑکے نے عین اس موقعے پر ایک کھڑکی کھول کر اس جماعت کو مکان کے اندر غائب ہوتے دیکھا، پھر جلدی سے کھڑکی بند کر دی۔ اب دروازہ بھی بند تھا۔ یہ سیاہ شاہ بلوط کا بہت مضبوط بنا ہوا دروازہ تھا۔ فاختاؤں کی ایک ٹکڑی جو گرجا گھر کے گھنٹے کے گرد چکر لگا رہی تھی مکان کے سامنے سڑک پر اتر آئی۔ فاختائیں دروازے کے آگے اس طرح اکٹھا ہو گئیں جیسے ان کا راتب مکان کے اندر ہو۔ ان میں سے ایک اُڑ کر مکان کی پہلی منزل پر پہنچی اور کھڑکی کے ایک شیشے پر ٹھونگیں مارنے لگی۔ یہ شوخ رنگ کے اچھی طرح پالے پوسے ہوئے خوبصورت پرندے تھے۔ جہاز والی عورت نے ہاتھ پھرا کر ان کو دانہ ڈالا۔ انھوں نے دانہ چگ لیا اور اُڑ کر عورت کے پاس چلی گئیں۔

اب ایک آدمی اونچا ہیٹ لگائے ہوئے، جس میں کریب کا فیتہ ٹکا ہوا تھا، بندرگاہ کو آنے والی تنگ اور بہت ڈھلوان گلیوں میں سے ایک گلی اتر کر نیچے آیا۔ اس نے بڑی چوکسی کے ساتھ چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کو ہر چیز ناگوار گذری ہے۔ ایک گوشے میں کچھ آخور دیکھ کر اس کا منھ بگڑ گیا۔ یادگار کی سیڑھیوں پر پھلوں کے چھلکے پڑے تھے۔ اس نے رواروی میں اپنی چھڑی سے ان کو سرکا دیا۔ اس نے مکان کا دروازہ دھیرے سے کھٹکھٹایا اور ساتھ ہی ساتھ سیاہ دستانہ چڑھے ہاتھ سے اپنا ہیٹ اتار دیا۔ دروازہ فوراً ہی کھل گیا اور ڈیوڑھی میں کوئی پچاس چھوٹے چھوٹے لڑکے دو قطاریں بنائے ہوئے نمودار ہوئے اور اس کو جھک کر آداب بجا لائے۔

جہاز والا زینے سے اتر کر آیا، اس نے اس سیاہ پوش شخص کو سلام کیا، اسے پہلی منزل پر لے گیا۔ بچوں کی بھیڑ ان سے تھوڑا سا فاصلہ رکھے پیچھے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ صحن کے چاروں طرف بنے ہوئے روشن اور پرشکوہ برآمدے میں سے ہوتے ہوئے وہ دونوں عقبی رُخ ایک سرد کشادہ کمرے میں داخل ہوئے جس کی کھڑکی میں سے پتھر کی ایک سیاہی مائل ننگی دیوار کے سوا کوئی عمارت نظر نہیں آتی تھی۔ ارتھی والوں سے ارتھی کے سرہانے بہت سی لمبی لمبی شمعیں لگوا کر روشن کرائی جا رہی تھیں۔ لیکن ان شمعوں نے روشنی نہیں پھیلائی بلکہ اُن پرچھائیوں کو جو ابھی تک غیر متحرک تھیں، اس طرح ڈرا دیا کہ وہ دیواروں پر بھاگ کر لرزنے لگیں۔ ارتھی کو جو کپڑا ڈھانکے ہوئے تھا وہ ہٹا دیا گیا تھا۔

Scanned with CamScanner

ارتھی پر ایک آدمی لیٹا تھا جس کے بال بے طرح الجھے ہوئے تھے اور وہ کچھ شکاری سا معلوم ہوتا تھا۔ وہ بے حس وحرکت پڑا ہوا تھا اور بظاہر اس کی سانس بھی نہیں چل رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں، تاہم یہ اندازہ فقط اس کی ارتھی اور پوشش وغیرہ ہی سے ہوتا تھا کہ غالباً یہ آدمی مر چکا ہے۔

سیاہ پوش شخص بڑھ کر ارتھی کے پاس آ گیا۔ اس نے اس پر پڑے ہوئے آدمی کی پیشانی پر ہاتھ رکھا، پھر دوزانو بیٹھ کر دعا کرنے لگا۔ جہاز والے نے ارتھی والوں کو کمرے سے نکل جانے کا اشارہ کیا۔ وہ باہر نکل گئے۔ انھوں نے لڑکوں کو، جو باہر بھیڑ لگائے ہوئے تھے، بھگایا اور دروازہ بند کر دیا۔ مگر اس سے بھی سیاہ پوش شخص مطمئن نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اس نے کنکھیوں سے جہاز والے کی طرف دیکھا۔ جہاز والا سمجھ گیا اور پہلو کے ایک دروازے سے ہو کر دوسرے کمرے میں غائب ہو گیا۔ اچانک ارتھی پر پڑے ہوئے آدمی نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنا چہرہ سیاہ پوش شخص کی طرف گھمایا اور پوچھا:

"تم کون ہو؟"

ذرا بھی تعجب کا اظہار کیے بغیر سیاہ پوش شخص بیٹھے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا:

"ریوا کا برگوماسٹر۔"[1]

ارتھی پر کے آدمی نے سر کو جنبش دی، بازو کی ہلکی سی حرکت سے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا اور برگوماسٹر کے بیٹھ جانے کے بعد بولا:

"یہ تو مجھے معلوم ہی تھا، برگوماسٹر، لیکن ہوش میں آنے کے فوراً بعد چند لمحوں تک مجھے کبھی کچھ نہیں یاد آ پاتا۔ ہر چیز میری آنکھوں کے سامنے چکرانے لگتی ہے اور بہتر یہی ہوتا ہے کہ جو کچھ مجھ کو معلوم ہو اس کے بارے میں بھی دریافت کر لوں۔ تم بھی شاید جانتے ہو کہ میں شکاری گریکس ہوں۔"

"یقیناً،" برگوماسٹر نے کہا۔ "تمھارے آنے کی اطلاع مجھے رات کو دے دی گئی تھی۔ ہم دیر کے سوئے ہوئے تھے کہ آدھی رات کے قریب میری بیوی چلائی: 'سالواتور!' — یہ میرا نام ہے — 'وہ دیکھو کھڑکی پر فاختہ!' سچ مچ وہ فاختہ ہی تھی لیکن اتنی بڑی جیسے مرغ۔ وہ اُڑ کر میرے پاس آ گئی اور

[1] برگوماسٹر: جرمنی اور چیکوسلواکیہ کے شہروں کا صدر بلدیہ۔

Scanned with CamScanner

میرے کان میں بولی: ''مرا ہوا شکاری گریکس کل آ رہا ہے، شہر کے نام پر اس کا استقبال کرو۔''
شکاری نے سر ہلا دیا اور زبان کی نوک اپنے ہونٹوں پر پھیری۔
''ہاں۔ فاختائیں مجھ سے پہلے ہی اُڑ کر یہاں چلی آئیں۔ لیکن برگو ماسٹر، کیا تم سمجھتے ہو کہ میں ریوا ہی میں رہوں گا؟''
''یہ تو میں ابھی نہیں کہہ سکتا،'' برگو ماسٹر نے جواب دیا۔ ''کیا تم مرے ہوئے ہو؟''
''ہاں!'' شکاری بولا، ''جیسا کہ تم دیکھ ہی رہے ہو۔ برسوں ہوئے، ہاں یہ صدہا برس پہلے کی بات ہوگی، میں کالے جنگل میں — یعنی جرمنی میں — سانبھر کا شکار کھیلتے ہوئے ایک کگار پر سے نیچے گر پڑا تھا۔ تب سے میں مرا ہوا ہوں۔''
''لیکن تم زندہ بھی تو ہو،'' برگو ماسٹر نے کہا۔
''ایک لحاظ سے،'' شکاری بولا۔ ''ایک لحاظ سے میں زندہ بھی ہوں۔ میرا موت کا جہاز راستہ بھٹک گیا۔ معلوم نہیں یہ چرخے کی غلط گردش تھی یا ناخدا کی ایک لمحے کی غفلت، یا خود میری اپنے پیارے دیس کی طرف گھوم پڑنے کی خواہش، میں کہہ نہیں سکتا کیا بات تھی۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ میں دنیا ہی میں پڑا رہ گیا۔ اور اُس وقت سے اب تک میرا جہاز ارضی سمندروں کو کھنگال چکا ہے۔ تو میں، جس کو اپنے کوہساروں کے درمیان رہنے سے بڑھ کر کچھ پسند نہیں تھا، مرنے کے بعد سے دنیا کی تمام سرزمینوں کا سفر کرتا پھرتا ہوں۔''
''اور دوسری دنیا سے تمھیں کوئی واسطہ نہیں؟'' برگو ماسٹر نے بھنویں سکیڑ کر پوچھا۔
''میں ہمیشہ کے لیے اُس دنیا کو جانے والی زبردست سیڑھیوں پر ہوں،'' شکاری نے جواب دیا۔ ''اُن بے تحاشا چوڑی اور کھلی ہوئی سیڑھیوں پر میں گرتا پڑتا چلتا رہتا ہوں۔ کبھی اوپر کی جانب، کبھی نیچے کی طرف، کبھی داہنے رُخ، کبھی بائیں سمت۔ مسلسل گردش میں ہوں۔ شکاری تتلی بن کر رہ گیا ہے۔ مت ہنسو۔''
''میں ہنس نہیں رہا ہوں،'' برگو ماسٹر نے صفائی پیش کی۔
''تمھاری بڑی مہربانی ہے،'' شکاری نے کہا۔ ''میں مسلسل گردش میں ہوں لیکن جیسے ہی میں زینوں کا پورا سلسلہ چڑھ جاتا ہوں اور دروازہ مجھے اپنے سامنے چمچماتا ہوا نظر آنے لگتا ہے، ویسے ہی

Scanned with CamScanner

میں اپنے پرانے جہاز پر جاگ اٹھتا ہوں جو اسی طرح بے بسی کے ساتھ کسی نہ کسی فانی سمندر میں پھنسا ہوتا ہے۔ میں اپنی کوٹھری میں پڑا ہوتا ہوں اور میری مدتوں پرانی موت کی بنیادی غلطی مجھ پر ہنستی ہے۔ ناخدا کی بیوی جولیا دروازہ کھٹکھٹاتی ہے اور جس ملک کے سواحل سے ہم اس وقت گذر رہے ہوتے ہیں اس کا صبح کا مشروب مجھے ارتھی میں لا دیتی ہے۔ میں لکڑی کے تختے پر پڑا رہتا ہوں۔ میں میلا کچیلا کفن لپیٹے رہتا ہوں۔ کوئی میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کرے گا۔ میرے سر اور داڑھی کے کھچڑی بال ایسے الجھ کر رہ گئے ہیں کہ سلجھائے نہیں جا سکتے۔ میرے بدن کو لمبی جھالر والی چھینٹ کی بڑی سی زنانی چادر ڈھانپے رہتی ہے۔ ایک مقدس شمع میرے سرہانے لگی ہوئی ہے اور مجھ پر روشنی ڈالتی رہتی ہے۔ میرے سامنے والی دیوار پر ایک چھوٹی سی تصویر ہے، بظاہر کسی قدیم وحشی نسل کے انسان کی، جو مجھ پر اپنا نیزہ تانے اور خود کو ایک خوبصورت رنگی ہوئی ڈھال کے پیچھے جہاں تک چھپ سکتا ہے چھپائے ہوئے ہے۔ جہاز کی سواری میں آدمی اکثر پوچ قسم کے تصورات کا شکار ہو جاتا ہے لیکن یہ ان سب میں پوچ ترین ہے۔ باقی میرا چوبی قفس بالکل خالی ہے۔ پہلو کی دیوار کے ایک موکھے سے جنوب کی رات کی گرم ہوا آیا کرتی ہے اور میں جہاز پر پانی کے تھپیڑے پڑنے کی آواز سنتا رہتا ہوں۔

''میں یہاں اُس وقت سے پڑا ہوا ہوں جب کالے جنگل میں رہنے والے شکاری گریکس کی حیثیت سے میں ایک سانبھر کے پیچھے لگا اور ایک کگار پر سے گرا تھا۔ سب کچھ بہت قاعدے سے ہوا۔ میں نے تعاقب کیا، میں گرا، ایک کھڈ میں میرا خون نکل گیا، میں مر گیا، اور چاہیے تھا کہ یہ جہاز مجھے دوسری دنیا میں لے جاتا۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ پہلی مرتبہ میں کیسی خوشی سے اس تختے پر دراز ہو گیا تھا۔ کوہساروں نے بھی کبھی مجھ سے ایسے گیت نہیں سنے تھے جیسے اس وقت ان تاریک دیواروں نے سنے۔

''میں جینے میں بھی خوش رہا تھا اور میں مرنے میں بھی خوش تھا۔ جہاز پر سوار ہونے سے پہلے اپنا تمام فضول بوجھ، سارے کارتوس، تھیلا اور اپنی شکاری رائفل جسے میں بڑے فخر کے ساتھ لے کر چلتا تھا، سب اُتار پھینکا تھا۔ اور میں اپنے کفن میں یوں ملبوس ہوا تھا جیسے کوئی دوشیزہ اپنے عروسی لباس میں، میں لیٹ گیا اور انتظار کرنے لگا۔ تب وہ سانحہ ہو گیا۔''

''ہولناک مقدر!'' برگو ماسٹر نے مدافعانہ انداز میں ہاتھ اٹھا کر کہا: ''اور اس میں تمہارے سر کوئی الزام نہیں؟''

''کوئی نہیں،'' شکاری نے کہا۔ ''میں ایک شکاری تھا۔ اس میں کوئی گناہ تھا؟ شکاری کی حیثیت سے کالے جنگل میں، جہاں ابھی تک بھیڑیے موجود تھے، میں اپنے پیشے کے تقاضوں کو پورا کرتا تھا۔ میں گھات میں بیٹھتا تھا، نشانہ لگاتا تھا، اپنے شکار کو مار دیتا تھا، شکار کی کھال اتارتا تھا، اور اس میں کوئی گناہ تھا؟ میری محنت کی داد ملتی تھی، 'کالے جنگل کا عظیم شکاری' میرا نام پڑ گیا۔ اس میں کوئی گناہ تھا؟''

''یہ فیصلہ کرنا میرا کام نہیں ہے،'' برگو ماسٹر بولا۔ ''تاہم میرے نزدیک بھی ایسی باتوں میں کوئی گناہ نہیں۔ لیکن پھر، آخر خطا کس کی ہے؟''

''جہاز والے کی۔'' شکاری نے کہا۔ ''جو کچھ میں یہاں کہہ رہا ہوں کوئی اُسے پڑھے گا نہیں، کوئی میری مدد کو آئے گا نہیں، حتیٰ کہ اگر تمام خلقت کو میری مدد پر مقرر کر دیا جائے تب بھی ہر دروازہ اور ہر کھڑکی بند پڑی رہے۔ ہر ایک اپنے بستر میں گھس جائے اور سر سے چادر تان لے، ساری دنیا ایک شب سرائے بن جائے۔ اور بات سمجھ میں آنے والی ہے، اس لیے کہ کسی کو میرا اپتا نہیں، اور اگر کسی کو میرا اپتا ہو بھی تو اسے یہ نہ معلوم ہوگا کہ میں کہاں ملوں گا، اور اگر اس کو یہ معلوم بھی ہو جائے کہ میں کہاں ملوں گا تو اس کی سمجھ میں نہ آئے گا کہ میرا کیا کیا جائے، اس کی سمجھ میں نہ آئے گا کہ میری مدد کس طرح کرے۔ میری مدد کرنے کا خیال ایک ایسی بیماری ہے جس کے علاج کے لیے بستر میں گھس رہنا پڑتا ہے۔

''مجھے یہ معلوم ہے اور اسی لیے میں مدد حاصل کرنے کے لیے پکارتا نہیں، حالانکہ کبھی کبھی — جب مجھے اپنے اوپر قابو نہیں رہتا، جیسے مثال کے طور پر اسی وقت — میں اس بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگتا ہوں۔ لیکن ایسے خیالات کو دور بھگانے کے لیے مجھے بس اپنے چاروں طرف دیکھ لینا اور یہ تحقیق کر لینا ہوتا ہے کہ میں کہاں ہوں، سیکڑوں برس سے کہاں ہوں۔''

''عجیب و غریب،'' برگو ماسٹر نے کہا۔ ''عجیب و غریب۔ اور اب تم یہاں ریوا میں ہمارے ساتھ رہنے کو سوچ رہے ہو؟''

''میں نہیں سوچتا،'' شکاری مسکرا کر بولا اور اپنی برائت کے لیے اس نے برگوماسٹر کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''میں یہاں ہوں، اس سے زیادہ میں جانتا نہیں، اس سے آگے میں بڑھ نہیں سکتا۔ میرے جہاز میں سکّان نہیں، اور اس کو وہ ہوا ہنکائے پھرتی ہے جو موت کے پاتالوں میں چلتی ہے۔''

گیلری میں

اگر سرکس میں کسی مریل مدقوق سی کرتب دکھانے والی کو کوئی کوڑا گھماتا ہوا بے درد رنگ ماسٹر کسی بدلگام گھوڑے کی پیٹھ پر بٹھا کر مجبور کرتا کہ وہ کبھی سیر نہ ہونے والے تماشائیوں کے سامنے مہینوں تک رُکے بغیر چکر پر چکر لگائے جائے، گھوڑے پر زناٹے کے ساتھ گھومتی رہے، بوسے اچھالتی رہے، اس کی کمر جھٹکے کھاتی رہے، اور اگر ایسا لگتا کہ یہ تماشا اکتا دینے والے مستقبل کے لامتناہی راستے پر اسی طرح چلتا رہے گا، اور اسی طرح آرکسٹرا گرجتا رہے گا، اور ہوادان بھنبھناتے رہیں گے، اور تماشائیوں کی تالیوں کا رہ رہ کے دبتا اور پھر سے ابھرتا ہوا شور کانوں میں ہتھوڑے چلاتا رہے گا، تب، شاید، گیلری کا کوئی نوجوان تماشائی ساری قطاروں کے زینے پھلانگتا ہوا اُترتا، رنگ میں گھس جاتا اور آرکسٹرا کے بھونپوؤں میں دم توڑتے ہوئے نغمے کے بیچ ہی میں چیخ کر کہتا: ''بند کرو!''

لیکن چونکہ ایسا نہیں ہے، ایک میدے شہاب کی سی رنگت والی خوبصورت بی بی کے لیے دو تک چڑھے وردی پوش ملازم پردے سرکاتے ہیں اور وہ ان کے درمیان سے خراماں خراماں نمودار ہوتی ہے، رنگ ماسٹر اس کی نظر پڑتے ہی مودب ہو کر کسی پالتو جانور کی سی جاں نثاری دکھاتا ہوا اس کی طرف لپکتا ہے، اسے اتنی آہستگی سے اٹھا کر ابلق گھوڑے پر بٹھاتا ہے جیسے وہ اس کی چہیتی پوتی ہو اور کسی خطرناک سفر پر روانہ ہو رہی ہو؛ وہ اپنے کوڑے سے سگنل دیتے ہچکچاتا ہے، بالآخر خود پر قابو حاصل کر کے کوڑا زور سے پھٹکار دیتا ہے، گھوڑے کے ساتھ ساتھ منہ کھولے دوڑے جاتا ہے، سوار کی ہر جست پر چوکسی کے ساتھ نظر رکھتا ہے، اس کی فنی مہارت کو قریب قریب ناقابل یقین پاتا ہے، اس کو خبردار کرنے کے لیے انگریزی کے نعرے لگاتا ہے، حلقہ بردار سائیسوں کو ڈپٹ ڈپٹ کر قریب رہنے

Scanned with CamScanner

کی تاکید کرتا جاتا ہے، بڑی قلابازی سے پہلے ہاتھ اوپر اٹھا کر آرکسٹرا کو خاموش کراتا ہے، آخر میں ننھی بی بی کو اس کے کانپتے ہوئے گھوڑے پر سے اتارتا ہے، اس کے کلّوں پر پیار کرتا ہے اور تماشائیوں کے تمام شورِ تحسین کو بس یوں ہی سا کافی سمجھتا ہے؛ اور خود وہ بی بی اس کا سہارا لے کر، غبار کے بادلوں میں پنجوں کے بل کھڑی ہوئی، ہاتھ پھیلائے ہوئے اور چھوٹا سا سر اٹھائے ہوئے، پورے سرکس کو اپنی فتح میں شریک ہونے کی دعوت دیتی ہے۔

چونکہ ایسا ہے، اس لیے گیلری کا تماشائی اپنے سامنے کے کٹہرے پر چہرہ ٹیک دیتا ہے، اختتامی موسیقی میں یوں ڈوب جاتا ہے جیسے خواب میں، اور نادانستہ روتا ہے۔

Scanned with CamScanner

ایک قدیم مخطوطہ

ایسا لگتا ہے کہ ہمارے ملک کے دفاعی نظام میں بہت سی کوتاہیاں رہنے دی گئی ہیں۔ اب تک ہم نے اس معاملے سے کوئی سروکار نہیں رکھا تھا اور اپنے روزمرہ کے کاموں میں لگے رہتے تھے لیکن حال میں جو باتیں ہونے لگی ہیں انھوں نے ہمیں تنگ کرنا شروع کر دیا ہے۔

شاہی محل کے سامنے والے چوک میں میری جوتے بنانے کی دکان ہے۔ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ جوں ہی میں دکان کھولتا ہوں، مجھے چوک کو آنے والی ہر سڑک کے ناکے پر مسلح سپاہی تعینات نظر آتے ہیں، لیکن یہ ہمارے سپاہی نہیں ہیں۔ بظاہر یہ شمال کے صحرانشین ہیں۔ کسی ایسے طریقے سے جو میری سمجھ سے باہر ہے، یہ صحرانشین دارالسلطنت کے اندر گھس آئے ہیں، حالانکہ دارالسلطنت سرحد سے بہت فاصلے پر ہے۔ کچھ بھی ہو، یہ سپاہی یہاں موجود ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر صبح ان کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

جیسی کہ ان کی سرشت ہے، یہ کھلے آسمان کے نیچے پڑاؤ ڈالتے ہیں، اس لیے کہ انھیں مکانوں سے نفرت ہے۔ یہ سپاہی تلواروں پر باڑھ رکھنے، تیروں کی نوکیں بنانے اور گھڑسواری کی مشقیں کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ یہ پرامن چوک جس کی صفائی ستھرائی کا ہمیشہ خاص خیال رکھا جاتا تھا، اس کو ان صحرائیوں نے صحیح معنوں میں اصطبل بنا کر رکھ دیا ہے۔ کچھ کچھ وقفے کے بعد ہم لوگ کوشش کرتے ہیں کہ اپنی دکانوں سے جھپٹ کر باہر نکلیں اور کم از کم بدترین ہی غلاظتوں کو ہٹا دیں، لیکن ایسا بھی کم ہو پاتا ہے اس لیے کہ ہماری محنت کا کچھ حاصل نہیں ہوتا، اور اس کے علاوہ اس کوشش میں اس کا بھی اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں ہم گھوڑوں کی ٹاپوں تلے نہ آ جائیں یا کوڑوں کی مار

Scanned with CamScanner

سے اپاہج نہ ہو جائیں۔

ان صحرائیوں سے گفتگو کرنا ممکن نہیں ہے۔ وہ ہماری زبان نہیں جانتے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی اپنی زبان بھی برائے نام ہی ہے۔ ان کا آپس میں بولنے کا انداز بہت کچھ کوّوں سے ملتا ہوا ہے۔ کوّوں کی تیز کریہہ چیخ کی سی کوئی نہ کوئی آواز برابر ہمارے کانوں میں آتی رہتی ہے۔ ہمارا رہن سہن اور ہمارے رسم و رواج ان کی سمجھ میں نہیں آتے، اور ان کو اِنھیں سمجھنے کی فکر بھی نہیں ہے، اس لیے اگر ہم اُن سے اشاروں میں بات کرتے ہیں تو وہ اسے بھی سمجھنے پر تیار نہیں ہوتے۔ آپ ان کے سامنے اشارے کرتے رہیے، یہاں تک کہ آپ کے جبڑے بیٹھ جائیں اور کلائیوں کی ہڈیاں اتر جائیں، پھر بھی وہ آپ کی بات نہیں سمجھیں گے، کبھی نہیں سمجھیں گے۔ اکثر وہ طرح طرح کے منھ بنانے لگتے ہیں۔ اس وقت ان کی پتلیاں پھر جاتی ہیں اور ان کے ہونٹوں پر جھاگ آ جاتا ہے، لیکن اس سے ان کی مراد کچھ نہیں ہوتی، دھمکی بھی نہیں۔ وہ ایسا بس اس لیے کرتے ہیں کہ یہی ان کی فطرت ہے۔ ان کو جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے، لے لیتے ہیں۔ آپ اس کو استحصال یا جبر بھی نہیں کہہ سکتے۔ بس وہ کسی چیز پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں اور آپ چپ چاپ وہ چیز ان کے لیے چھوڑ کر الگ ہٹ جاتے ہیں۔

میرے یہاں سے بھی وہ بہت سا بڑھیا مال لے چکے ہیں لیکن میں اس کی شکایت بھی نہیں کر سکتا، اس لیے کہ میں دیکھتا ہوں کہ مثلاً قصاب ہی بیچارے پر کیا گذرتی ہے۔ جیسے ہی وہ گوشت لے کر آتا ہے، وحشی سارے کا سارا گوشت اس سے لپک لیتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ہڑپ کر جاتے ہیں۔ ان کے گھوڑے بھی خوب گوشت کھاتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ گھوڑا اور سوار دونوں برابر برابر لیٹے ہیں اور گوشت کا ایک ہی لوتھڑا، ایک اِس سرے سے، ایک اُس سرے سے، بھنبھوڑ رہے ہیں۔ قصاب کے اوسان گم ہیں لیکن اس کی اتنی ہمت نہیں پڑتی کہ گوشت لانا بند کر دے۔ ہم لوگ بہر حال اس کی مشکل کو سمجھتے ہیں اور اس کے لیے کام چلانے بھر روپے کا بندوبست کر دیتے ہیں۔ اگر ان وحشیوں کو گوشت نہ ملے تو نہ جانے وہ کیا سوچیں۔ یوں بھی جبکہ ان کو روزانہ گوشت مل رہا ہے معلوم نہیں وہ کیا سوچتے ہوں۔

ابھی کچھ دن ہوئے قصاب کو خیال آیا کہ اور کچھ نہیں تو جانور کاٹنے ہی کے جھنجھٹ سے چھٹکارا پا لیا جائے، چنانچہ ایک صبح وہ ایک زندہ بیل لے آیا۔ لیکن ایسا کرنے کی جرأت وہ پھر کبھی نہ

Scanned with CamScanner

کرے گا۔ میں اپنے سارے کپڑوں، کمبلوں، گدّوں میں سر دیے دکان کے اندر فرش پر پورے ایک گھنٹے تک پڑا رہا تھا، محض اس لیے کہ مجھے مرتے ہوئے بیل کا ڈکرانا نہ سنائی دے جس پر وحشی ہر طرف سے ٹوٹ پڑ رہے تھے اور اس کا جیتا گوشت دانتوں سے نوچ نوچ کر کھا رہے تھے۔ خاموشی ہو جانے کے بہت دیر بعد میں باہر آنے کی ہمت کر سکا۔ وہ سب کے سب چھک کر بیل کے ڈھانچے کے اردگرد پڑے ہوئے تھے جیسے شراب کے پیپے کے گرد شرابی۔

یہی وہ موقع تھا جب مجھے خیال سا ہوا کہ میں نے حقیقتاً بادشاہ سلامت کو محل کے ایک دریچے میں کھڑے دیکھا ہے۔ عام طور پر وہ محل کے اندر والے باغ میں گذارتے ہیں لیکن اس موقعے پر وہ ایک دریچے میں کھڑے ہوئے تھے، یا کم از کم مجھ کو ایسا ہی لگا، اور سر جھکائے دیکھ رہے تھے کہ ان کے محل کے سامنے کیا ہو رہا ہے۔

''آخر ہونا کیا ہے؟'' ہم سب خود سے پوچھتے ہیں۔ ''ہم کب تک یہ بوجھ اور اذیت اٹھا سکتے ہیں؟ شہنشاہ کے محل نے ان وحشیوں کو یہاں کھینچ بلایا ہے لیکن اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ ان کو واپس کیونکر بھگایا جائے۔ پھاٹک بند پڑا ہے۔ فوجی محافظ، جو ہمیشہ اونچی بن کر باہر نکلا کرتے تھے، اب سلاخوں دار کھڑکیوں کے پیچھے رہتے ہیں۔ ملک کی حفاظت ہم کاریگروں اور بیوپاریوں پر چھوڑ دی گئی ہے۔ لیکن یہ کام ہمارے بس کا نہیں ہے، نہ کبھی ہم نے اس کی اہلیت کا دعویٰ کیا۔ یہ کوئی نہ کوئی غلط فہمی ہے اور یہی ہم کو تباہ کر کے رہے گی۔''

پاس سے گذرنے والے

جب آپ رات کو کسی سڑک پر ٹہلنے کے لیے نکلتے ہیں اور خاصے فاصلے پر سے دکھائی دیتا ہوا — اس لیے کہ سڑک پہاڑی کو جاری ہے اور پورا چاند نکلا ہوا ہے — ایک آدمی دوڑتا ہوا آپ کی سمت آتا ہے تو آپ اسے پکڑ نہیں لیتے۔ اگر وہ کوئی ناتواں شکستہ حال انسان ہے تب بھی نہیں، اگر کوئی اس کے پیچھے شور مچاتا ہوا دوڑ رہا ہے تب بھی نہیں۔ آپ اس کو نکل جانے دیتے ہیں۔

اس لیے کہ رات کا وقت ہے، اور اگر آپ کے سامنے سڑک چاندنی میں پہاڑی کو جاتی ہے تو اس میں آپ کیا کریں۔ اور، علاوہ بریں، ہو سکتا ہے کہ ان دونوں نے یہ بھاگ دوڑ محض تفریحاً شروع کی ہو، یا شاید وہ دونوں مل کر کسی تیسرے کا پیچھا کر رہے ہوں، شاید پہلا والا آدمی بے قصور ہو اور دوسرا والا اس کو قتل کرنا چاہتا ہو اور آپ اس کی اعانت کر بیٹھیں، شاید اُن دونوں کو ایک دوسرے کی خبر بھی نہ ہو اور وہ سونے کے لیے اپنے اپنے گھروں کو لپکتے جا رہے ہوں، شاید وہ دونوں آوارہ گرد ہوں، شاید پہلا والا آدمی مسلح ہو۔

اور، بہرصورت، کیا آپ کو تھک جانے کا حق نہیں ہے؟ کیا آپ بے تحاشا شراب نہیں پیتے رہے ہیں؟ آپ شکر کرتے ہیں کہ دوسرا والا آدمی آپ کی نظروں سے کب کا اوجھل ہو چکا ہے۔

Scanned with CamScanner

خانہ دار کی پریشانیاں

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ "اودرادک" اصلاً سلافی زبان کا لفظ ہے اور اسی بنیاد پر وہ اس کی تاویل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسری طرف بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اس کی اصل جرمن ہے اور سلافی زبان کا اس پر صرف اثر پڑا ہے۔ ان دونوں تاویلوں کے تذبذب کی وجہ سے یہ نظریہ قائم کر لینا بے جا نہ ہوگا کہ ان میں سے کوئی بھی تاویل درست نہیں ہے، علی الخصوص جب کہ کوئی بھی تاویل اس لفظ کے قابل قبول معنی نہیں بتاتی۔

بے شک اگر اودرادک نام کی ایک مخلوق کا وجود نہ ہوتا تو کسی کو ان بحثوں میں پڑنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ یہ مخلوق پہلی نظر میں ستارے کی شکل کی دھاگا لپیٹنے والی چپٹی پھرکی سی لگتی ہے، اور واقعی اس پر کچھ دھاگا لپٹا ہوا معلوم بھی ہوتا ہے۔ اصل میں یہ مختلف میل کے رنگ برنگے دھاگے کے الگ الگ ٹکڑے سے ہیں جن میں فقط گانٹھیں ہی نہیں ہیں بلکہ یہ ایک دوسرے میں اُلجھے ہوئے بھی ہیں۔ لیکن یہ محض پھرکی نہیں ہے، اس لیے کہ اس ستارے کے وسط میں ایک تیلی گھسی ہوئی ہے اور اس تیلی میں ایک اور ڈنڈی کھڑی جڑی ہوئی ہے۔ ایک طرف اس دوسری ڈنڈی اور ایک طرف ستارے کے کسی ایک کونے کی مدد سے یہ پوری چیز اس طرح سیدھی ٹکی رہتی ہے جیسے دونوں ٹانگوں پر کھڑی ہو۔

یہ مان لینے کو جی چاہتا ہے کہ کبھی اس مخلوق کی کوئی معقول شکل رہی ہوگی اور اب یہ اسی کا ٹوٹا پھوٹا بقایا ہے۔ تاہم یہ حقیقت نہیں معلوم ہوتی، کم سے کم اس میں اس طرح کی کوئی علامت نہیں ہے۔ اس کی سطح پر کہیں کوئی ٹوٹ پھوٹ یا کھردرا پن نہیں جس سے اس بات کا اشارہ مل سکے۔ یہ

Scanned with CamScanner

پوری چیز واہیات سی تو ضرور معلوم ہوتی ہے لیکن اپنی جگہ پر یہ بالکل صحیح و سالم ہے۔ بہرحال قریب سے اس کا معائنہ کرنا ممکن نہیں، اس لیے کہ اودرادک بے حد پھرتیلا ہے اور اس کو پکڑا نہیں جا سکتا۔

وہ کبھی کوٹھے کے سب سے اوپر والے کمرے سے جھانکتا ہے، کبھی زینے سے، کبھی دالان سے، کبھی ڈیوڑھی سے۔ اکثر وہ مہینوں تک نظر نہیں آتا، قیاس کہتا ہے کہ اُن دنوں وہ دوسرے مکانوں میں رہنے لگتا ہوگا، لیکن وہ پابندی کے ساتھ پلٹ کر ہمارے ہی گھر آ جاتا ہے۔ بسا اوقات جب آپ دروازے سے نکل رہے ہوتے ہیں اور وہ آپ سے کچھ نیچے پر جنگلے سے ٹیک لگائے کھڑا ہوا ملتا ہے تو آپ کا جی اس سے باتیں کرنے کو چاہنے لگتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ اس سے مشکل سوال نہیں پوچھتے۔ وہ اتنا ننھا منا سا ہے کہ آپ اس کو بچہ سمجھنے پر مجبور ہیں۔

''کہو بھئی تمھارا نام کیا ہے؟'' آپ اس سے پوچھتے ہیں۔

''اودرادک،'' وہ کہتا ہے۔

''اور تم رہتے کہاں ہو؟''

''کوئی ایک ٹھکانا نہیں،'' وہ کہتا ہے اور ہنسنے لگتا ہے، لیکن یہ ہنسی ایسی ہوتی ہے جس کا پھیپھڑوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس میں سوکھے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ کی سی آواز ہوتی ہے۔ اور عموماً اسی کے ساتھ یہ گفتگو ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن اِن جوابوں کا بھی ہمیشہ ملنا ضروری نہیں۔ اکثر وہ عرصے تک چپ سادھے رہتا ہے اور بالکل اپنے جسم کی طرح لکڑی ہو جاتا ہے۔

میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں، یوں ہی بے مقصد، کہ اس کا ہونا کیا ہے؟ کیا اس کے مرنے کا امکان ہے؟ ہر مرنے والی چیز کا زندگی میں کوئی مقصد ہوتا ہے، کوئی نہ کوئی کام ہوتا ہے جو بالآخر ختم ہو جاتا ہے، لیکن اودرادک پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔ تو کیا میں یہ سمجھ لوں کہ ایک نہ ایک وقت آئے گا جب وہ میرے بچوں اور میرے بچوں کے بچوں کی ٹانگوں تلے زینوں پر لڑھکتا پھرے گا اور دھاگوں کے سرے اُس کے پیچھے پیچھے گھسٹ رہے ہوں گے؟ وہ کسی کو نقصان پہنچاتا نظر تو نہیں آتا لیکن یہ خیال کہ اغلباً وہ میرے بعد تک زندہ رہے گا، مجھے اذیت ناک سا معلوم ہوتا ہے۔

Scanned with CamScanner

بے خیالی میں کھڑکی سے دیکھنا

آخر یہ بہار کے دن جو سر پر چلے آ رہے ہیں، ہم ان کا کیا کریں؟ آج سویرے سویرے آسمان کا رنگ نیلا تھا لیکن اب اگر آپ کھڑکی پر جاتے ہیں تو آپ کو تعجب ہوتا ہے اور آپ دریچے کے کھٹکے پر اپنا رخسار رکھ دیتے ہیں۔

سورج ڈوب چلا ہے، لیکن نیچے وہ آپ کو ایک ننھی بچی کا چہرہ دمکتا نظر آتا ہے جو اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی گھوم رہی ہے اور ٹھیک اُسی وقت آپ پیچھے سے اُس کی طرف بڑھتے ہوئے ایک آدمی کی پرچھائیں سے اُس کو گہناتے دیکھتے ہیں۔

اور پھر آدمی آگے نکل جاتا ہے اور ننھی بچی کا چہرہ دمک اُٹھتا ہے۔

Scanned with CamScanner

حویلی کے پھاٹک پر دستک

گرمی کا موسم تھا، تپتا ہوا دن۔ اپنی بہن کے ساتھ گھر لوٹتے ہوئے میں ایک بہت بڑے مکان کے پھاٹک کے سامنے سے گذر رہا تھا۔ اب میں یہ نہیں بتا سکتا کہ میری بہن نے پھاٹک پر شرارتاً دستک دے دی تھی یا بے خیالی میں اس کی طرف اپنا ہاتھ صرف بڑھایا تھا اور دستک سرے سے دی ہی نہیں تھی۔

سڑک یہاں سے بائیں کو مڑ گئی تھی اور اس سڑک پر کوئی سو قدم آگے بڑھ کر گاؤں شروع ہوتا تھا۔ ہم اس سے اچھی طرح واقف نہیں تھے۔ لیکن ابھی ہم گاؤں کے پہلے مکان سے آگے نکلے ہی تھے کہ لوگ سامنے آ آ کر دوستانہ یا خبردار کرنے کے انداز میں ہمیں اشارے کرنے لگے۔ وہ خود بھی سہمے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ وہ اس کی طرف اشارہ کرتے اور یہ جتاتے تھے کہ ہم نے اس کے پھاٹک پر دستک دے دی ہے۔ حویلی کا مالک ہم پر یہی جرم عائد کرے گا جس کی تفتیش فوراً شروع ہو جائے گی۔

میں نے اپنے اوسان بحال رکھے اور اپنی بہن کو بھی دلاسا دینے کی کوشش کرنے لگا۔ اول تو اُس نے پھاٹک پر ہاتھ مارا ہی نہیں تھا، اور اگر مارا بھی تو اسے کبھی ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات میں نے اپنے چاروں طرف کھڑے ہوئے لوگوں کو بھی سمجھانا چاہی۔ انھوں نے میری بات سن تو لی مگر اس پر کوئی رائے ظاہر کرنے سے احتراز کیا۔ پھر انھوں نے مجھے بتایا کہ صرف میری بہن ہی پر نہیں بلکہ اس کے بھائی کی حیثیت سے مجھ پر بھی جرم عائد کیا جائے گا۔ میں سر جھٹک کر مسکرا دیا۔ ہم سب مڑ کر حویلی کی طرف یوں دیکھنے لگے جیسے کوئی دور پر دھوئیں کا بادل دیکھے اور اس میں سے شعلے بھڑک اُٹھنے کا انتظار کرے۔

اور واقعی ذرا ہی دیر بعد ہم نے دیکھا کہ پاٹوں پاٹ کھلے ہوئے پھاٹک میں گھوڑوں پر سوار داخل ہو رہے ہیں۔ گرد اڑنے لگی اور سب کچھ اس کے پیچھے چھپ گیا، صرف اونچے اونچے نیزوں کے پھل چمکتے رہے۔ اور ابھی یہ سوار حویلی کے صحن میں غائب ہوئے ہی تھے کہ شاید انھوں نے اپنے گھوڑے پھیر لیے کیونکہ اب وہ سیدھے ہماری طرف آ رہے تھے۔ میں نے اپنی بہن سے کہا کہ یہاں سے چلی جاؤ۔ وہ مجھے چھوڑ کر جانے پر راضی نہ ہوئی۔ میں نے اس سے کہا کہ کم از کم اپنے کپڑے ہی بدل ڈالو تاکہ بہتر لباس میں ان سواروں کا سامنا کر سکو۔ آخر وہ مان گئی اور ہمارے گھر کو جانے والی سڑک پر چل کھڑی ہوئی۔ اتنی دیر میں سوار ہمارے برابر پہنچ گئے، اور اترنے سے پہلے ہی پہلے انھوں نے میری بہن کو پوچھا۔ اس سوال کا سوچا سمجھا ہوا جواب یہ تھا کہ اس وقت تو وہ موجود نہیں ہے لیکن تھوڑی دیر میں آ جائے گی۔ سواروں نے اس جواب کو بے اعتنائی سے سنا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مجھ کو پالینا ان کے نزدیک زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ ایک چاق و چوبند نوجوان، جو منصف تھا، اور اس کا خاموش طبع نائب، جس کا نام عسمان تھا، یہ دونوں بظاہر اس دستے کے سربراہ تھے۔

مجھ کو گاؤں کی سرائے میں چلنے کا حکم دیا گیا۔ سر جھٹک جھٹک کر اور زیرِ جامہ سنبھال کر میں دھیرے دھیرے اپنا بیان دینے لگا جس کے دوران میں دستے کی تیز نظریں مجھے ٹٹولتی رہیں۔ مجھ کو ابھی تک یقین سا تھا کہ شہر کا باشندہ اور عزت دار ہونے کی بنا پر مجھے دیہاتیوں کی اس جماعت سے چھٹکارا دلانے کے لیے چند الفاظ کافی ہوں گے۔ لیکن جب میں نے سرائے کی دہلیز پر پاؤں رکھا تو منصف، جو پہلے ہی سے وہاں پہنچ کر میرا انتظام کر رہا تھا، بولا:

''واقعی مجھے اس شخص کی حالت پر افسوس ہے۔'' اور اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں کہ اس سے اس کی مراد میری موجودہ حالت نہیں بلکہ کوئی ایسی بات تھی جو مجھے پیش آنے والی تھی۔

وہ جگہ سرائے کے کمرے سے زیادہ کسی قید خانے کی کوٹھری معلوم ہوتی تھی۔ پتھر کی بڑی بڑی سلوں کا فرش، سیاہ اور بالکل ننگی دیواریں جن میں سے ایک میں لوہے کا حلقہ جڑا ہوا۔ بیچ میں بچھی ہوئی ایک چیز، کچھ بستر کی سی، کچھ جراحی کی میز کی سی۔

کیا اب میں زنداں کی فضا کے سوا کسی اور فضا کی تاب لا سکتا ہوں؟ اصل سوال یہی ہے، یا شاید ہوتا، بشرطیکہ مجھے اب بھی امید ہوتی کہ میں یہاں سے نکل سکوں گا۔

Scanned with CamScanner

پُل

میں سردی سے اکڑ گیا تھا۔ میں ایک پل تھا۔ میں ایک درّے پر پڑا ہوا تھا۔ میرے پیر درے کے ایک طرف تھے، ہاتھوں کی انگلیاں دوسری طرف جمی ہوئی تھیں۔ میں نے اپنے آپ کو بھربھری مٹی میں مضبوطی کے ساتھ بھینچ رکھا تھا۔ میرے دونوں پہلوؤں پر میرے کوٹ کے دامن پھڑ پھڑا رہے تھے۔ نیچے بہت دور پر مچھلیوں سے بھرا ہوا برفیلا چشمہ غرا رہا تھا۔

اس ناقابلِ گذر بلندی تک کوئی مسافر بھٹک کر نہیں آتا تھا۔ ابھی پل کسی نقشے میں پایا بھی نہیں جاتا تھا۔ اس لیے میں پڑا تھا اور انتظار کر رہا تھا۔ میں انتظار ہی کر سکتا تھا۔ ایک بار بن جانے کے بعد کسی بھی پل کو بنے رہنے کے سوا چارہ نہیں تاوقتیکہ وہ گر نہ جائے۔

یہ ایک دن قریب شام کا ذکر ہے۔ وہ پہلی شام تھی — یا وہ ہزارویں شام تھی — میں کہہ نہیں سکتا۔ میرے خیالات ہمیشہ پراگندہ اور ایک دائرے میں گھومتے رہتے تھے۔ یہ گرمیوں کے موسم میں قریب شام کا ذکر ہے۔ چشمے کی غراہٹ بڑھ گئی تھی۔ اس وقت میں نے انسانی قدموں کی آہٹ سنی۔ میری طرف آتی ہوئی، میری طرف آتی ہوئی۔ پل! یہ مسافر جو تمھارے حوالے کیا جا رہا ہے اس کو سنبھالنے کے لیے اُستوار ہو جاؤ۔ بے جنگلے کی منڈیرو! تیار رہو۔ اگر اس کے قدم بہکیں تو خاموشی سے انھیں ہموار کر دو، اگر وہ گرنے لگے تو دکھا دو کہ تم کیا ہو اور کسی کوہستانی دیوتا کی طرح اُسے زمین کی طرف اچھال دو۔

وہ آ گیا۔ اُس نے اپنے عصا کی فولادی نوک سے مجھے کھٹ کھٹایا۔ اس نے اپنے عصا کی نوک سے میرے کوٹ کے دامنوں کو اٹھایا اور درست کر دیا۔ اس نے اپنے عصا کی نوک میرے

Scanned with CamScanner

گھنیرے بالوں میں ڈال اور دیر تک وہیں رہنے دی۔ وحشت زدہ ہوکر چاروں طرف دیکھتے وقت وہ یقیناً مجھ کو فراموش کر چکا تھا۔ لیکن جب میں پہاڑ اور وادی میں اس کے بھٹکتے ہوئے خیالات کا پیچھا کر رہا تھا تو اچانک وہ دونوں پیروں سے اچھلا اور میرے بدن کے بیچوں بیچ میں کود پڑا۔ میں درد کی ٹیس سے تھرا کر رہ گیا۔ وہ کیا تھا؟ کوئی بچہ؟ کوئی خواب؟ کوئی راہ گیر؟ کوئی خودکشی کرنے والا؟ کوئی فریبی؟ کوئی تخریب کار؟ اور اُسے دیکھنے کے لیے میں گھوم پڑا۔ پل کا گھوم پڑنا! ابھی میں پوری طرح گھومنے بھی نہ پایا تھا کہ گرنے لگا۔

میں گر گیا۔ اور دم بھر میں اُن نکیلی چٹانوں نے چھید چھید کر میرے چیتھڑے اُڑا دیے جو بہتے پانی سے منہ نکالے ہر وقت چپ چاپ مجھے تکتی رہتی تھیں۔

بالٹی سوار

سارا کوئلہ ختم، بالٹی خالی، بیلچہ بے مصرف، آتش دان ٹھنڈی سانسیں بھرتا ہوا، کمرہ منجمد ہوتا ہوا، کھڑکی کے باہر پتیاں ٹھٹھری ہوئی، پالے میں لپٹی ہوئی، آسمان ہر اُس شخص کے مقابلے پر روپہلی سپر بنا ہوا جو اس سے مدد کا طلبگار ہو۔

مجھے کوئلہ مہیا کرنا ہوگا۔ میں اکڑ کر نہیں مر سکتا۔ میرے پیچھے بے رحم آتش دان ہے۔ میرے آگے بے رحم آسمان ہے۔ تو مجھے ان دونوں کے درمیان سے گذرنا چاہیے اور اس سفر میں کوئلے والے سے کمک لینا چاہیے، مگر اس نے تو اب معمولی درخواستوں پر کان دھرنا چھوڑ دیا ہے۔ مجھے اس کے سامنے ناقابل تردید طور پر ثابت کر دینا چاہیے کہ میرے پاس کوئلے کا ایک ریزہ بھی نہیں رہ گیا ہے، کہ میرے لیے اُس کی ہستی ایسی ہی ہے جیسے آسمان پر سورج۔ مجھے ایسا بھکاری بن کے پہنچنا چاہیے جو کسی دروازے کے سامنے ہی جان دے دینے پر تلا ہوتا ہے، اور اس کے گلے میں موت کی خرخراہٹ شروع ہو جاتی ہے، اور اسی لیے شرفا کا باورچی اُسے کافی کی کیتلی میں سے تلچھٹ دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح یہ بھی ہونا چاہیے کہ کوئلے والا غصے میں بھر جانے کے باوجود "تو کسی کی جان نہیں لے گا" کے مقدس حکم کا پاس کرتے ہوئے ایک بیلچہ بھر کوئلہ میری بالٹی میں پھینک دے۔

وہاں میرے پہنچنے کا ڈھنگ ایسا معلوم ہونا چاہیے جو معاملہ طے ہی کر دے۔ اس لیے میں بالٹی پر سوار ہو کر نکلتا ہوں۔ بالٹی پر بیٹھا ہوا، ہاتھ بالٹی کے کنڈے پر جو لگام کی سادہ ترین قسم ہے، میں بمشکل خود کو ٹھیلتا ہوا سیڑھیوں سے اترتا ہوں۔ لیکن ایک بار نیچے پہنچ کر میری بالٹی بڑے ٹھاٹھ سے اوپر اٹھنے لگتی ہے، بڑے ٹھاٹھ سے۔ زمین پر بیٹھے ہوئے اونٹ بھی ساربان کی چھڑیاں کھا کر جھرجھری

Scanned with CamScanner

لیتے ہوئے اس سے زیادہ پروقار انداز میں نہیں اٹھتے ۔ سخت یخ بستہ سڑکوں پر سے ہم سبک رفتاری کے ساتھ گذرتے ہیں ۔ اکثر تو میں مکانوں کی پہلی منزل کی بلندی تک اٹھتا چلا جاتا ہوں ۔ میں دروازوں کی پستی تک کبھی نہیں اترتا ۔ اور آخر کار میں کوئلے والے کے محرابی چھت سے ڈھکے ہوئے تہہ خانے کی غیر معمولی بلندی تک تیر آتا ہوں ۔ دکاندار کو میں دیکھتا ہوں کہ میز کے سامنے سکڑا ہوا بیٹھا کچھ لکھ رہا ہے ۔ اس نے فاضل گرمی کو نکالنے کے لیے دروازہ کھول رکھا ہے ۔

''کوئلے والے!'' میں پکارتا ہوں ۔ کہر نے میری آواز کھوکھلی کر دی ہے اور میری سانس کے بنائے ہوئے بادل نے اسے ڈھانپ رکھا ہے ۔ ''کوئلے والے! مہربانی کر کے مجھے تھوڑا سا کوئلہ دے دو ۔ میری بالٹی اتنی ہلکی ہو چکی ہے کہ میں اس پر سواری کر سکتا ہوں ۔ مہربانی کرو ۔ جب بھی مجھ سے ہو سکا میں تمھیں قیمت ادا کر دوں گا ۔''

دکاندار اپنے ایک کان پر ہاتھ رکھتا ہے:

''کیا مجھے ٹھیک سنائی دے رہا ہے؟'' وہ پیچھے بیٹھی ہوئی اپنی بیوی سے پوچھتا ہے ۔ ''کیا مجھے ٹھیک سنائی دے رہا ہے؟ کوئی گاہک؟''

''مجھے تو کچھ بھی سنائی نہیں دیتا،'' اس کی بیوی کہتی ہے ۔ بُنائی کرتے ہوئے وہ سکون کے ساتھ سانسیں بھر رہی ہے ۔ آگ اس کی پیٹھ کو بڑے مزے میں سینک رہی ہے ۔

''ہاں، ہاں، سنو تو سہی!'' میں چلاتا ہوں ۔ ''یہ میں ہی ہوں، پرانا گاہک، سچا اور کھرا گاہک، البتہ اس وقت محتاج ہوں ۔''

''بیوی،'' کوئلے والا کہتا ہے، ''کوئی ہے ۔ بالکل ہے ۔ میرے کان اتنا دھوکا تھوڑی دے سکتے ہیں ۔ ضرور کوئی پرانا گاہک ہے، کوئی بہت پرانا گاہک جو مجھ سے اس طرح منت کر رہا ہے ۔''

''کیوں پریشان ہو رہے ہو، بھلے آدمی؟'' اُس کی بیوی ذرا دیر کے لیے کام چھوڑ کر کہتی ہے، اور بنائی کا سامان اپنے سینے سے بھینچ لیتی ہے ۔ ''کوئی بھی نہیں ہے، سڑک سونی پڑی ہے ۔ ہمارے سب گاہکوں کو مال پہنچ چکا ہے ۔ اب تو ہم کئی دن تک دکان بند کر کے آرام کر سکتے ہیں ۔''

''لیکن میں یہاں اوپر بیٹھا ہوں، بالٹی پر!'' میں چیخ کر کہتا ہوں اور بے حس جمے ہوئے آنسو میری نظروں کو دھندلا دیتے ہیں ۔ ''خدا کے لیے اِدھر اوپر دیکھو ۔ صرف ایک بار ۔ میں تمھیں فوراً

Scanned with CamScanner

دکھائی دے جاؤں گا۔ میں منت کرتا ہوں۔صرف ایک بیلچہ بھر۔اور اگر کچھ زیادہ دے دو تو خوشی سے پاگل ہو جاؤں۔تمام دوسرے گاہکوں کو مال پہنچ چکا ہے۔ مجھے بالٹی میں کوئلے کی کھڑکھڑاہٹ سننے ہی بھر کو مل جاتی۔"

"میں آرہا ہوں،" کوئلے والا کہتا ہے اور اپنی چھوٹی چھوٹی ٹانگوں سے تہ خانے کی سیڑھیاں چڑھنے لگتا ہے۔لیکن اتنے میں اس کی بیوی اس کے برابر پہنچ جاتی ہے،اس کا شانہ پکڑ کر کھینچتی ہے اور کہتی ہے:

"یہیں ٹھہرو تم! تمھارا وہم نہیں جاتا تو میں خود جا کر دیکھے لیتی ہوں۔رات کس بُری طرح کھانس رہے تھے،اس کا تو خیال کرو۔گاہک کا وہم بھی ہو جائے تو بیوی بچوں کو بھول بھال کر اپنے پھیپھڑے بھینٹ چڑھانے پر تل جاتے ہو۔میں جا کر دیکھتی ہوں۔"

"تو اُسے بتا ضرور دینا کہ ہمارے پاس کون کون سا کوئلہ موجود ہے۔ میں یہیں سے پکار پکار کر دام بولتا جاؤں گا۔"

"اچھا اچھا،" اس کی بیوی سیڑھیاں چڑھ کر سڑک پر آتے ہوئے کہتی ہے۔ظاہر ہے وہ مجھے فوراً دیکھ لیتی ہے۔

"کوئلے والی"! میں چلاتا ہوں۔"میرا اسلام قبول ہو۔بس ایک بیلچہ بھر کوئلہ۔اسی بالٹی میں، میں خود اسے گھر لے جاؤں گا۔سب سے گھٹیا میں کا بس ایک بیلچہ بھر۔ میں پورے دام دوں گا،ظاہر ہے،مگر ابھی نہیں،ابھی نہیں۔"

یہ "ابھی نہیں" کے الفاظ کیسے گھنٹی کی طرح بجتے ہیں! کیسے چکرا دینے والے انداز میں یہ الفاظ قریبی گرجا گھر کے مینار سے آتی ہوئی شام کے گجر کی جھنکار میں مل جاتے ہیں۔

"ارے بھئی،اسے کیا چاہیے؟" دکاندار پکار کے پوچھتا ہے۔

"کچھ بھی نہیں!" اس کی بیوی پکار کے جواب دیتی ہے۔"یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ مجھے تو نہ کچھ دکھائی دے رہا ہے نہ سنائی دے رہا ہے۔چھ کا گھنٹہ بج رہا ہے،بس اب دکان بند کرنا چاہیے۔ بلا کی سردی ہے۔کل بھی کاروبار سے فرصت ملنا مشکل ہی ہے۔"

اُسے کچھ دکھائی نہیں دیتا،کچھ سنائی نہیں دیتا۔لیکن پھر بھی وہ اپنے سینہ بند کی ڈوریاں کھولتی

Scanned with CamScanner

ہے اور مجھے ہنکا دینے کے لیے سینہ بند کو ہوا میں گھماتی ہے۔ بدقسمتی سے وہ کامیاب ہو جاتی ہے۔ میری بالٹی میں عمدہ گھوڑے کی ساری خوبیاں موجود ہیں، سوا مزاحمت کی قوت کے؛ وہ اس میں نہیں ہے۔ میری بالٹی بہت ہلکی ہے، اتنی کہ ایک عورت کا سینہ بند اسے ہوا میں اُڑا سکتا ہے۔

''خبیث عورت!'' میں جاتے جاتے چلاّتا ہوں اور وہ مڑ کر دکان میں داخل ہوتے ہوتے تحقیر اور اطمینان کے ملے جلے انداز میں مٹھی بھینچ کر ہوا میں لہراتی ہے۔

''خبیث عورت! میں نے تجھ سے فقط ایک بیلچہ بھر سب سے بدتر کوئلہ مانگا، اور تو نے وہ بھی نہ دیا۔''

اور یہ کہہ کر میں برف پوش پہاڑوں کے علاقے کی سمت پرواز کرتا ہوں اور ہمیشہ کے لیے کھو جاتا ہوں۔

Scanned with CamScanner

ایک عام خلفشار

ایک عام تجربہ، اس کے نتیجے میں ایک عام خلفشار۔

الف کو ب کے ساتھ مقام ج پر کچھ اہم تجارتی معاملت کرنا ہے۔ ابتدائی بات چیت کے لیے وہ مقام ج جاتا ہے۔ وہ دس منٹ میں راستہ طے کر لیتا ہے اور واپسی میں بھی اُسے اتنا ہی وقت لگتا ہے۔ واپس آ کر گھر والوں کو وہ اپنی اس مہم کا حال فخریہ انداز میں بتاتا ہے۔

دوسرے دن وہ پھر مقام ج جاتا ہے — اس مرتبہ سودا پکا کرنے کے لیے۔ سفر کا انداز بالکل وہی ہے، کم از کم الف کے خیال میں وہی ہے، جو ایک دن پہلے اختیار کیا گیا تھا، لیکن اس بار اس کو ج تک پہنچنے میں دس گھنٹے لگتے ہیں۔ جب وہ شام کے وقت تھکا ہارا وہاں پہنچتا ہے تو اس کو بتایا جاتا ہے کہ ب اس کے نہ آنے سے آدھے گھنٹے پہلے خود اس کے قصبے کی طرف روانہ ہو چکا ہے اور یہ کہ سڑک پر وہ دونوں ایک دوسرے کے پاس سے ہو کر گذرے ضرور ہوں گے۔ الف کو انتظار کرنے کا مشورہ دیا جاتا ہے لیکن کاروبار کی دُھن میں وہ فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اپنے گھر کی طرف لپکتا ہے۔

اِس بار اس کا سفر ایک سیکنڈ میں طے ہو جاتا ہے لیکن وہ خود اس بات کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کرتا۔ گھر پہنچ کر اسے پتا چلتا ہے کہ ب تو بہت سویرے، اس کے روانہ ہوتے ہی، آ گیا تھا۔ گھر کے دروازے پر الف سے اُس کی ملاقات بھی ہوئی تھی اور اُس نے معاملت کی یاددہانی بھی کی تھی، لیکن الف نے جواب میں عدیم الفرصتی اور جانے کی جلدی کا عذر کر دیا تھا۔

بہرحال الف کے اس ناقابلِ فہم رویے کے باوجود ب اُس کی واپسی کے انتظار میں رکا رہا تھا۔ اس نے کئی بار دریافت تو ضرور کیا کہ الف واپس لوٹا یا نہیں، تاہم وہ اب بھی اوپر الف کے

کمرے میں بیٹھا ہوا ہے۔ ب سے فوری ملاقات اور ہر بات کی صفائی پیش کر دینے کا موقع مل جانے پر خوشی سے نہال ہو کر الف تیزی سے زینے چڑھنے لگتا ہے۔ وہ اوپر تک آ پہنچا ہے کہ ٹھوکر کھا کر گر پڑتا ہے۔ اُس کی ایک نس چڑھ جاتی ہے۔ اور اس وقت جبکہ تکلیف کی شدت سے اُس پر غشی طاری ہو رہی ہے، وہ چیخ بھی نہیں سکتا، وہ اندھیرے میں صرف دھیرے دھیرے کراہ سکتا ہے۔ اس کو۔ معلوم نہیں بہت دور پر یا بالکل نزدیک سے۔ ب کی آواز سنائی دیتی ہے جو بڑے طیش کے عالم میں پیر پٹختا ہوا زینوں سے اترتا ہے اور ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتا ہے۔

ایک چھوٹی سی کہانی

''افسوس!'' چوہے نے کہا۔ ''دنیا روز بروز چھوٹی ہوتی جا رہی ہے۔ شروع شروع میں تو یہ اتنی بڑی تھی کہ مجھے خوف آتا تھا۔ میں بھاگتا رہا، بھاگتا رہا، اور جب آخرکار مجھ کو دور پر داہنے بائیں دیواریں دکھائی دینے لگیں تو میں بہت خوش ہوا تھا۔ لیکن یہ لمبی دیواریں اس قدر تیزی سے تنگ ہوئی ہیں کہ سرکتے سرکتے اب میں آخری کوٹھری میں آ پہنچا ہوں، اور اِس کوٹھری کے اُس سرے پر چوہے دان لگا ہوا ہے جس میں مجھ کو داخل ہونا ہی پڑے گا۔''

''تم کو صرف اپنا رُخ بدل دینا ہے،'' بلی نے کہا اور اُسے کھا گئی۔

Scanned with CamScanner

دوغلا

میرے پاس ایک عجیب الخلقت جانور ہے، آدھا بلی، آدھا بھیڑ کا بچہ۔ یہ میرے باپ کا ترکہ ہے لیکن یہ بڑھا میرے ہی زمانے میں ہے۔ پہلے یہ بلی کم اور بھیڑ بہت زیادہ تھا۔ اب یہ دونوں میں برابر برابر بٹا ہوا ہے۔ اس کا سر اور پنجے بلی کے سے ہیں، جسامت اور بناوٹ بھیڑ کی سی۔ آنکھیں اس نے دونوں سے لی ہیں جو وحشت زدہ اور رنگ بدلتی رہتی ہیں، اور بال بھی جو نرم اور بہت گھنے ہیں، اور چال ڈھال بھی جس میں قلانچیں بھرنا اور دبک کر چلنا دونوں شامل ہیں۔ دھوپ میں یہ کھڑکی کی چوکھٹ پر گٹھری بنا پڑا خرخر کیا کرتا ہے۔ باہر میدان میں یہ باؤلا سا بھاگتا پھرتا ہے اور بڑی مشکل سے پکڑ میں آتا ہے۔ یہ بلیوں سے بھڑکتا ہے اور بھیڑ کے بچوں پر حملہ کرنے چلتا ہے۔ چاندنی راتوں میں اسے کھپریلوں پر گھومنا بہت پسند ہے۔ یہ بلی کی بولی نہیں بول پاتا اور چوہوں سے گھن کھاتا ہے۔ مرغیوں کے ڈربے کے پاس یہ گھنٹوں گھات لگائے بیٹھا رہتا ہے لیکن ابھی تک اس نے دوسرے کی جان لینے کے موقعوں کو ہاتھ سے نکل جانے دیا ہے۔

میں اس کو دودھ دیتا ہوں۔ یہ غذا اسے سب سے زیادہ راس معلوم ہوتی ہے۔ اپنے درندوں کے سے دانتوں کے درمیان سے دودھ کے لمبے لمبے گھونٹ بھرتا ہے۔ قدرتی بات ہے کہ یہ بچوں کے لیے بڑے تماشے کی چیز ہے۔ اتوار کی صبح کا وقت اِن ملاقاتیوں کے لیے مخصوص ہے۔ میں اس ننھے جانور کو اپنے گھٹنوں پر لے کر بیٹھ جاتا ہوں اور پڑوس کے سارے بچے مجھے گھیر لیتے ہیں۔

پھر عجیب ترین سوال پوچھے جاتے ہیں جن کا کوئی بھی انسان جواب نہیں دے سکتا۔ ایسا جانور صرف ایک ہی کیوں ہے، یہ جانور دنیا بھر میں میرے ہی پاس کیوں ہے، کسی اور کے پاس کیوں نہیں

Scanned with CamScanner

ہے، کیا ایسا کوئی جانور اس سے پہلے بھی کبھی ہوا ہے، اور اگر یہ مرگیا تو کیا ہوگا، اکیلے اس کا دل تو نہیں گھبراتا، اس کے بچے کیوں نہیں ہیں، یہ کیا کہلاتا ہے، وغیرہ۔

میں کبھی جواب دینے کی تکلیف نہیں کرتا، بلکہ کوئی مزید وضاحت کیے بغیر اپنے مال کی نمائش پر اکتفا کرتا ہوں۔ کبھی کبھی بچے اپنے ساتھ بلیاں لے آتے ہیں۔ ایک بار تو وہ دو بھیڑ کے بچے اٹھا لائے۔ لیکن، اُن کی امید کے برخلاف، جانوروں میں باہمی شناسائی کے کوئی آثار نہیں پائے گئے۔ وہ چپ چاپ ایک دوسرے کو حیوانی آنکھوں سے دیکھتے رہے۔ اور ظاہراً انھوں نے ایک دوسرے کے وجود کو ایک خداساز حقیقت کی طرح تسلیم کر لیا۔

میرے گھٹنوں پر بیٹھ کر اس جانور کو نہ ڈر لگتا ہے اور نہ کسی کے پیچھے دوڑنے کی ہوس ہوتی ہے۔ سب سے زیادہ مزہ اس کو مجھ سے چمٹنے ہی میں آتا ہے۔ یہ ہمارے گھرانے کا، جس نے اس کی پرورش کی ہے، وفادار ہے، لیکن یہ کسی خاص وابستگی کی علامت نہیں بلکہ یہ ایک ایسے جانور کی سچی جبلت ہے جس کے سوتیلے رشتہ دار تو دنیا میں بہت ہیں لیکن سگا شاید کوئی نہیں۔ لہٰذا جو تحفظ اس کو ہمارے یہاں نصیب ہے اسے یہ اپنے حق میں برکت سمجھتا ہے۔

کبھی کبھی تو مجھے بڑی ہنسی آتی ہے جب یہ مجھے چاروں طرف سے سونگھتا پھرتا ہے اور میری ٹانگوں میں گول مول ہو کر پڑتا ہے اور پھر کسی طرح مجھے چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتا۔ بھیڑ اور بلی ہونے پر قناعت کرنے کے بجائے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتا بننے پر تلا ہوا ہے۔ ایک بار، جیسا کہ اکثر لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے، میں کچھ کاروباری دشواریوں اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل میں بُری طرح اُلجھ گیا اور میں نے ہر چیز کو تج دینے کا فیصلہ کر لیا۔ میں اسی کیفیت میں اپنے کمرے کے اندر جھولا کرسی میں پڑا ہوا تھا۔ جانور میرے گھٹنوں پر تھا۔ میری نظر نیچے پڑی تو دیکھا کہ اس کی مونچھ کے لمبے لمبے بالوں سے آنسو ٹپک رہے ہیں۔ یہ میرے آنسو تھے یا جانور کے آنسو تھے؟ کیا بھیڑ کی روح والی اس بلی کے دل میں انسانی جذبات بھی تھے؟ مجھے اپنے باپ سے زیادہ میراث نہیں ملی لیکن یہ ترکہ دیکھنے کے قابل ہے۔

اس میں دونوں جانوروں کا اضطراب ہے — بلی کا بھی اور بھیڑ کا بھی — گو خود یہ جانور ایک دوسرے سے متغائر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی کھال اس کے جسم پر تنگی کرتی معلوم ہوتی ہے۔ کبھی کبھی

Scanned with CamScanner

یہ آرام کرسی پر چھلانگ مار کر میرے پاس آ جاتا ہے۔ اپنی اگلی ٹانگیں میرے کندھے پر ٹیک دیتا ہے اور اپنی تھوتھنی میرے کان سے لگا دیتا ہے۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مجھ سے کچھ کہہ رہا ہے۔ اور سچ مچ یہ اس کے بعد اپنا سر گھماتا ہے اور، یہ دیکھنے کے لیے کہ اس کی بات نے کیا اثر کیا، مجھ پر نظریں جما دیتا ہے۔ اور اس کی خاطر سے میں ایسا ظاہر کرتا ہوں کہ میں اس کی بات سمجھ گیا اور سر ہلا دیتا ہوں۔ تب یہ فرش پر کود پڑتا ہے اور خوشی سے ناچنے لگتا ہے۔

قصائی کا چھرا شاید اس جانور کو چھٹکارا دلا دے، لیکن میں اس کو اس سے محروم رکھوں گا، اس لیے کہ یہ میرا ورثہ ہے۔ اس کو انتظار کرنا ہوگا حتیٰ کہ اس کی جان خود ہی اس کے جسم سے نکل جائے، حالانکہ یہ کبھی کبھی مجھ کو انسان کی سی ہوشیار آنکھ سے گھورنے لگتا ہے جو مجھے وہ کام کر ڈالنے کے لیے للکارتی ہے جس کے بارے میں ہم دونوں سوچ رہے ہیں۔

لباس

اکثر جب میں ایسے لباس دیکھتا ہوں جن میں طرح طرح کی چنٹیں دی ہوئی، گوٹیں ٹکی ہوئی اور جھالریں لگی ہوئی ہوتی ہیں، جو حسین جسموں پر نہایت چست بیٹھتے ہیں، تو میں سوچتا ہوں کہ وہ اپنی ہمواری زیادہ عرصے تک برقرار نہ رکھ پائیں گے، ان میں ایسی شکنیں پڑ جائیں گی جن کو استری کر کے ہٹایا نہ جاسکے گا، ان کی زردوزی پر گرد کی اتنی موٹی تہہ جم جائے گی کہ اسے برش سے جھاڑا نہ جاسکے گا، اور یہ کہ کوئی بھی اس حماقت اور اس بے لطفی پر راضی نہ ہوگا کہ وہی ایک بیش قیمت جامہ سویرے تڑکے سے لے کر رات تک پہنے رہے۔

اور اس کے باوجود میں ایسی لڑکیوں کو دیکھتا ہوں جو خاصی خوبصورت ہوتی ہیں اور اپنے دلکش اعضا اور نازک جسموں اور گھنے ملائم بالوں کی نمائش کرتی پھرتی ہیں، اور پھر بھی روز بروز اسی قدرتی بہروپ میں نظر آتی ہیں، ہمیشہ وہی چہرہ انھیں ہتھیلیوں پر ٹکائے، اسی لباس کا عکس آئینے میں ڈالا کرتی ہیں۔

البتہ کبھی کبھی رات کو کسی دعوت سے گھر واپس آنے پر آئینہ دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ یہ لباس گھسا پٹا، ڈھیلا ڈھالا، میلا کچیلا ہو چکا ہے۔ اس پر اب تک معلوم نہیں کتنوں کی نظر پڑ چکی ہے اور اب شاید یہ مزید پہننے کے قابل نہیں رہا ہے۔

Scanned with CamScanner

قصبے کا ڈاکٹر

میں بڑی الجھن میں تھا۔ دس میل دور کے ایک گاؤں میں ایک بہت بیمار مریض میری راہ دیکھ رہا تھا۔ میرے اور اُس کے درمیان کے تمام وسیع خلاؤں کو تیز برفانی طوفان نے پُر کر رکھا تھا۔ میرے پاس ایک گھوڑا گاڑی تھی۔ یہ بڑے پہیوں والی ہلکی گاڑی تھی جو ہماری دیہاتی سڑکوں کے لیے بالکل مناسب تھی۔ میں پوستین میں لپٹا ہوا، آلات کا بیگ سنبھالے، چلنے کے لیے بالکل تیار، صحن میں کھڑا ہوا تھا۔ مگر کوئی گھوڑا نہیں مل رہا تھا۔ کوئی گھوڑا نہیں۔ میرا اپنا گھوڑا ان برفیلے جاڑوں کی تکان سے نڈھال ہو کر گذشتہ رات کو مر گیا تھا۔ میری خادمہ لڑکی اب گاؤں بھر میں بھاگتی پھر رہی تھی کہ کہیں سے کوئی گھوڑا مانگے مل جائے، لیکن محض بے کار۔ یہ میں جانتا تھا اور بے بسی کے عالم میں کھڑا ہوا تھا۔ میرے اوپر برف کی تہوں پر تہیں جمتی چلی جا رہی تھیں اور میرا جنبش کرنا مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا تھا۔ لڑکی پھاٹک میں داخل ہوتی دکھائی دی، اکیلی، اور اس نے لالٹین لہرا دی۔ ظاہر ہے، ایسے وقت میں ایسے سفر کے لیے کون اپنا گھوڑا دیتا؟ میں ایک بار پھر لپکتا ہوا صحن سے نکلا۔ مجھے کوئی چارۂ کار نظر نہ آتا تھا۔ میں نے بوکھلاہٹ میں سؤروں کا باڑا جو ایک سال سے خالی پڑا تھا، اس کے ٹوٹے پھوٹے دروازے پر ایک ٹھوکر ماری۔ دروازہ دھڑ سے کھل گیا اور اپنے قلابوں پر اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ اس میں سے گھوڑے کی بدن کی سی بو کا بھپکا باہر نکلا۔ اندر اصطبل کی ٹمٹماتی ہوئی لالٹین ایک رسی میں جھول رہی تھی۔ اس تنگ نیچی جگہ میں گھٹنوں کے بل دبکے ہوئے ایک آدمی کا نیلی آنکھوں والا کشادہ چہرہ نظر آیا۔

''گھوڑے جوت دوں؟'' اس نے رینگ کر باہر آتے ہوئے پوچھا۔

Scanned with CamScanner

’’میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں۔ میں محض یہ دیکھنے کے لیے جھک گیا کہ باڑے کے اندر اور کیا کیا ہے۔ خادمہ لڑکی میرے برابر ہی کھڑی ہوئی تھی۔

’’آپ کو تو کبھی پتا نہیں ہوتا کہ آپ کو خود اپنے گھر میں کیا ملنے جا رہا ہے،‘‘ وہ بولی اور ہم دونوں ہنس پڑے۔

’’او بھائی صاحب! او بہن جی!‘‘ سائیس نے ہانک لگائی اور دو گھوڑے، مضبوط پٹھے والے زبردست جانور، ٹانگیں جسموں میں بالکل کمٹی ہوئی، دونوں کے خوبصورت سر اونٹ کے سر کی طرح نیچے کو لٹکے ہوئے، فقط اپنی پچھاڑیوں کے بل پر کھسکتے ہوئے، دروازے کی تنگ جگہ میں بھنچ کر آگے پیچھے باہر نکلے۔ لیکن باہر آتے ہی وہ اٹھ کھڑے ہوئے، ان کی ٹانگیں بڑھ کر سیدھی ہو گئیں اور بدن پھڑکنے لگے۔

’’اس کا ہاتھ بٹاؤ،‘‘ میں نے کہا اور لڑکی مستعدی کے ساتھ گھوڑوں پر ساز چڑھانے میں سائیس کی مدد کرنے کو لپکی۔ لیکن وہ اس کے پاس پہنچی ہی تھی کہ سائیس نے اسے دبوچ لیا اور اپنا چہرہ اس کے چہرے سے بھڑا دیا۔ وہ چیخ پڑی اور میرے پاس بھاگ آئی۔ اس کے رخسار پر دانتوں کی دو قطاروں کے سرخ نشان اُبھر آئے تھے۔

’’جنگلی کہیں کا!‘‘ میں غضبناک ہو کر دہاڑا۔ ’’کیا چابکیں کھانے کو جی چاہ رہا ہے؟‘‘ لیکن اسی لمحے مجھے خیال آ گیا کہ یہ آدمی اجنبی ہے۔ میں جانتا بھی نہیں کہ یہ کہاں سے آ گیا ہے اور یہ کہ ایسے وقت میں جب اور سب لوگ جواب دے چکے ہیں، اپنی خوشی سے میری مدد کر رہا ہے۔ اس کو جیسے میرے خیالات کی خبر ہو گئی، اس لیے کہ اس نے میری تہدید کا ذرا بھی بُرا نہ مانا بلکہ اسی طرح گھوڑے کسنے میں لگا رہا اور بس ایک بار وہ میری طرف مڑا۔

’’بیٹھیے،‘‘ تب اس نے کہا، اور واقعی سب تیار تھا۔ میں نے دیکھا، گھوڑوں کی ایسی شاندار جوڑی کبھی میری سواری میں نہیں آئی تھی، اور میں خوشی خوشی گاڑی میں بیٹھا۔

’’لیکن میں چلاؤں گا، تمھیں راستہ نہیں معلوم،‘‘ میں نے کہا۔

’’بالکل،‘‘ وہ بولا۔ ’’میں آپ کے ساتھ چل ہی نہیں رہا ہوں۔ میں روز کے پاس رہوں گا۔‘‘

’’نہیں!‘‘ روز اس دھڑکے کے ساتھ کہ اس کی شامت آ کر رہے گی، چیختی ہوئی گھر کے اندر

بھاگ گئی۔ میں نے اس کے دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھانے کی کھڑ کھڑاہٹ سنی، میں نے قفل میں کنجی گھومنے کی آواز سنی۔ مزید برآں، میں دیکھ رہا تھا کہ کس طرح وہ بھاگتے میں ڈیوڑھی اور دوسرے کمروں کی روشنیاں بجھاتی جا رہی تھی تا کہ پکڑے جانے سے بچ سکے۔

''تم میرے ساتھ چل رہے ہو،'' میں نے سائیس سے کہا۔ ''ورنہ میں نہیں جاتا۔ میرا جانا ضروری ہی سہی، لیکن میں اس کی یہ قیمت تو دینے سے رہا کہ لڑکی کو تمھارے حوالے کر دوں۔''

''ہرڑر...'' اُس نے کہا، تالی بجائی، اور گاڑی ہوا ہو گئی، جیسے باڑھ پر آئے ہوئے دریا میں لکڑی کا لٹھا۔ میں بس سائیس کے دھاوے سے اپنے گھر کا دروازہ چرچرا کے ٹوٹنے کی آواز ہی سن پایا اور پھر طوفان نے میرے حواس پر گھونسے مار مار کر مجھے بہرا اور اندھا کر دیا۔ لیکن یہ صرف ایک لمحے کے لیے، کیونکہ، یوں جیسے میرے مریض کا باڑا میرے احاطے کے دروازے سے ملحق ہو گیا ہو، میں وہاں پہنچا ہوا تھا۔ گھوڑے چپ چاپ کھڑے تھے، طوفان تھم چکا تھا۔ چاندنی سارے میں پھیلی ہوئی تھی۔ میرے مریض کے ماں باپ لپکتے ہوئے گھر سے باہر نکلے، اُس کی بہن ان کے پیچھے پیچھے۔ مجھ کو گاڑی میں سے قریب قریب اٹھا لیا گیا، ان کی بہکی بہکی باتوں کا ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہ آیا۔ بیمار کے کمرے کی ہوا میں سانس لینا مشکل تھا، آتش دان پڑا دھواں دے رہا تھا۔ میں نے چاہا کہ کوئی کھڑکی کھول دوں، لیکن پہلے مجھے اپنے مریض کو دیکھنا پڑا۔ سوکھا، سہما، بخار بالکل نہیں، بدن نہ ٹھنڈا نہ گرم، آنکھیں خالی خالی، جسم قمیص سے محروم۔ اس نوجوان نے پروں کی رضائی کے نیچے سے خود کو اُبھارا، اپنے بازو میری گردن میں حمائل کر دیے اور چپکے سے میرے کان میں کہا:

''ڈاکٹر! مجھے مر جانے دو۔''

میں نے کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔ کسی نے یہ بات سنی نہیں تھی۔ ماں باپ خاموشی سے آگے جھکے ہوئے انتظار کر رہے تھے کہ میں کیا بتاتا ہوں۔ بہن نے میرے ہینڈ بیگ کے لیے ایک کرسی لگا دی تھی۔ میں بیگ کھول کر اپنے آلات کو ٹٹولنے لگا۔ نوجوان اپنی درخواست کی یاددہانی کے لیے اپنے پلنگ پر سے مجھے جکڑے ہوئے تھا۔ میں نے ایک موچنا اٹھایا۔ شمع کی روشنی میں اس کا جائزہ لیا اور پھر واپس رکھ دیا۔

''ہاں،'' میں نے کافرانہ انداز میں سوچا۔ ''ایسی حالت میں دیوتا کام آتے ہیں، کھویا ہوا

گھوڑا بھیج دیتے ہیں، عجلت کی وجہ سے اس کے ساتھ ایک کا اضافہ کر دیتے ہیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک عدد سائیس بھی عطا کرتے ہیں۔'' اور اب جا کر مجھے روز کا پھر خیال آیا۔ میں کیا کروں، میں اسے کیونکر بچاؤں، ایسے گھوڑے لے کر جو میرے قابو میں نہیں ہیں، میں دس میل کے فاصلے پر اُسے اس سائیس کے نیچے سے کس طرح گھسیٹ لوں۔ یہ گھوڑے، کسی طرح اب انھوں نے اپنی باگیں ڈھیلی کر لی تھیں، باہر سے ڈھکیل کر کھڑکیاں کھول دی تھیں، نہیں معلوم کس طرح، دونوں اپنا اپنا سر ایک کھڑکی میں ٹھونسے ہوئے تھے، اور گھر والوں کی تحیر زدہ چیخوں سے بے نیاز کھڑے مریض کو تک رہے تھے۔

''بہتر ہے کہ فوراً واپس چلا جائے،'' میں نے سوچا، جیسے گھوڑے مجھے واپسی کے سفر کے لیے بلا رہے ہوں۔ تاہم میں نے مریض کی بہن کو، جو سمجھ رہی تھی کہ مجھے گرمی سے چکر آ گیا ہے، اپنا سموری کوٹ اتار لینے دیا۔ رَم کا ایک گلاس میرے لیے بھرا گیا۔ مریض کے باپ نے میرا کندھا تھپتھپایا، مجھے اپنا خزانہ بخش کر وہ اس بے تکلفی کا مجاز ہو گیا تھا۔ میں نے سر ہلا کر انکار کر دیا۔ اس بڈھے کے ذہن کی تنگنائے میں یہ خیال سما گیا تھا کہ میری طبیعت خراب ہے۔ چنانچہ شراب پینے سے میرے انکار کا یہی ایک سبب تھا۔ ماں بستر کے پاس کھڑی تھی اور مجھے وہاں آنے کے لیے پکار رہی تھی۔ مجھے جھکنا پڑا۔ ایک گھوڑا گھر کی طرف منھ کر کے زور سے ہنہنایا اور میں نے نوجوان کے سینے پر اپنا سر رکھ دیا۔ اس کا سینہ میری گیلی داڑھی کے نیچے زور زور سے ہلنے لگا۔ جو بات مجھے پہلے ہی معلوم تھی اس کی میں نے تصدیق بھی کر لی۔ نوجوان بالکل ٹھیک تھا۔ اُس کے دورانِ خون میں ایک ذرا سی گڑبڑ تھی۔ فکر کی ماری ماں نے اسے کافی سے بھر رکھا تھا، لیکن وہ بالکل ٹھیک تھا اور سب سے بہتر یہ ہوتا کہ اُسے دھکا دے کر بستر کے باہر کر دیا جاتا۔ میں مصلحِ عام نہیں ہوں اس لیے میں نے اسے پڑا رہنے دیا۔ میں ضلع کا ڈاکٹر تھا اور امکانی حد تک اپنا فرض بجا لاتا تھا، اس حد تک کہ یہ فرض قریب ناقابلِ برداشت ہو جاتا تھا۔ مجھے بہت کم معاوضہ ملتا تھا، پھر بھی میں مریضوں پر شفقت کرتا اور ان کے کام آتا تھا۔ ابھی تو مجھے روز کی سلامتی کی تدبیر کرنا تھی۔ پھر نوجوان جس طرح چاہتا رہ سکتا تھا اور میں بھی مر سکتا تھا۔ میں وہاں اس لامتناہی جاڑے میں کیا کر رہا تھا؟ میرا گھوڑا مر گیا تھا اور گاؤں کا کوئی متنفس مجھے دوسرا گھوڑا مستعار دینے پر تیار نہ تھا۔ مجھے اپنی جوڑی سؤر باڑے میں سے نکالنا

Scanned with CamScanner

پڑی۔ اگر کہیں یہ جوڑی گھوڑوں کی نہ نکلی ہوتی تو مجھے خنزیروں کی سواری کرنا پڑتی۔ یہ حالت تھی، اور میں نے اس کنبے سے ہاں کر دی۔ ان لوگوں کو اس بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا، اور اگر معلوم ہو بھی جاتا تو انھیں اعتبار نہ آتا۔ نسخے لکھنا آسان ہے لیکن لوگوں سے مفاہمت دشوار ہے۔ خیر، اب مجھے چل دینا چاہیے تھا۔ ایک بار پھر مجھے بلاضرورت بلوالیا گیا تھا۔ میں اس کا عادی تھا، ضلعے بھر نے میرے دروازے کی گھنٹی بجا بجا کر میرا جینا عذاب کر دیا تھا، لیکن یہ کہ اس بار مجھے ساتھ میں روز کو بھی بھینٹ چڑھانا ہوگا؛ وہ حسین لڑکی جو برسوں سے میرے گھر میں رہتی آئی تھی اور میں اس سے قریب قریب بے خبر تھا۔ یہ قربانی بہت زیادہ تھی، اور مجھے کسی بھی طرح اپنے ذہن میں اس کی کوئی نہ کوئی تاویل کرنا تھی تا کہ اچانک میرا غصہ اس خاندان پر نہ اُترے جو اپنی بہترین خواہشوں کے باوجود میرے لیے روز کو نہیں لا سکتا تھا۔ لیکن جب میں نے اپنا بیگ بند کیا اور اپنا سموری کوٹ پہننے کے لیے ہاتھ بڑھایا، اس دوران میں خاندان کے سب لوگ ساتھ مل کر کھڑے رہے تھے۔ باپ اپنے ہاتھ والے رم کے گلاس کو سونگھ رہا تھا، ماں بظاہر مجھ سے مایوس ہو کر — لوگ نہ جانے کیا کیا اُمیدیں باندھ لیتے ہیں — آنکھوں میں آنسو بھرے اپنے ہونٹ چبا رہی تھی، ،بہن ایک خون میں تر بتر رومال کو جھٹک رہی تھی، تب کسی طرح میں مشروط طور پر یہ ماننے کو تیار ہو گیا کہ با ایں ہمہ ہوسکتا ہے کہ نوجوان بیمار ہو۔ میں اس کی طرف بڑھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے میرا خیر مقدم کیا گویا میں اس کے لیے نہایت قوت بخش پرہیزی یخنی لا رہا ہوں۔ اُف، اب دونوں گھوڑے ایک ساتھ ہنہنا رہے تھے۔ یہ آواز میں سمجھتا ہوں کہ مریض کے معائنے میں مدد دینے کے لیے آسمان سے مقدر ہوئی تھی اور اس بار مجھے پتا چلا کہ نوجوان واقعی بیمار تھا: اس کے داہنے پہلو میں کولھے کے قریب میری ہتھیلی کے برابر کھلا ہوا زخم تھا، مختلف طرح کے ہلکے اور گہرے سرخ رنگ کا، گہرائی میں گہرا سرخ، کناروں پر ہلکا سرخ، کچھ کچھ کھرنڈ آیا ہوا، خون کے بے ترتیب لختے جمے ہوئے، یوں کھلا ہوا جیسے دن کی روشنی میں مسطح کان۔ ایسا تو وہ کچھ فاصلے سے دکھائی دے رہا تھا، لیکن قریب سے جائزہ لینے پر ایک اور پیچیدگی نظر آئی۔ میں حیرت کے مارے آہستہ سے سیٹی بجائے بغیر نہ رہ سکا۔ کیڑے، میری چھنگلیا کے اتنے موٹے اور لمبے، خود گہرے سرخ رنگ کے اور اُن پر خون کی چتیاں بھی پڑی ہوئی، چھوٹے چھوٹے سفید سر اور بہت سی ننھی منی ٹانگیں، زخم کی گہرائی میں بنائے ہوئے اپنے گھر سے نکل نکل کر، کلبلاتے ہوئے، روشنی کی

Scanned with CamScanner

طرف چلے آ رہے تھے۔ بے چارہ نوجوان، اس کا علاج ممکن نہ تھا، اس کے پہلو کا یہ شگوفہ اسے ختم کیے دے رہا تھا۔ گھر والے خوش تھے، انھوں نے مجھے اپنے کام میں لگتے دیکھا، بہن نے ماں کو بتایا، ماں نے باپ کو بتایا، باپ نے اُن ڈھیر بھر مہمانوں کو بتایا جو کھلے ہوے دروازے پر پڑتی ہوئی چاندنی میں سے ہو ہو کر پنجوں کے بل چلتے ہوے، اور توازن قائم رکھنے کے لیے دونوں ہاتھ پھیلائے ہوے اندر آ رہے تھے۔

''تم مجھے بچا لوگے؟'' نوجوان نے سسکی بھر کر سرگوشی کی۔ میرے ضلعے کے لوگ اسی طرح کے ہیں، ڈاکٹر سے ہمیشہ ناممکنات کی توقع کرنے والے۔ وہ اپنے قدیم معتقدات کو ہاتھ سے کھو چکے ہیں، پادری گھر میں بیٹھا رہتا ہے اور ایک ایک کر کے اپنی عبا قبا وغیرہ اُتارا کرتا ہے، لیکن ڈاکٹر اور اس کے دستِ شفا کو قادرِ مطلق ٹھہرایا جاتا ہے۔ خیر، جو اِن کی مرضی، میں نے اِن پر کوئی اپنی خدمات مسلط تو کی نہیں ہیں، اگر وہ کسی کارِ خیر کے لیے نیک نیتی کے ساتھ مجھ پر زیادتی کرتے ہیں تو میں بھی اپنے ساتھ یہ سلوک ہونے دیتا ہوں۔ مجھ بوڑھے قصباتی ڈاکٹر کو، جس سے اس کی ملازمہ چھین لی گئی ہو، اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیے۔ اور اس لیے وہ لوگ آئے، گھر والے اور گاؤں کے بڑے بوڑھے، اور میرے کپڑے اُتارنے لگے۔ مکان کے سامنے ایک اسکول کی کورس پارٹی ٹیچر کی سربراہی میں یہ بول نہایت ہی سادہ دُھن میں گانے لگی:

اس کے کپڑے اُتارلو، تب ہی یہ ہمارا علاج کرے گا
اور اگر نہ کرے، اسے مار کے ڈال دو!
جراح ہی تو ہے، جراح ہی تو ہے۔

تب میرے کپڑے اُتر گئے اور میں ان لوگوں کی طرف خاموشی سے دیکھنے لگا۔ میری انگلیاں میری داڑھی میں تھیں اور میرا سر ایک طرف کو ڈھلکا ہوا تھا۔ میرے اوسان بالکل بجا تھے اور میں اس صورت حال کا سامنا کر سکتا تھا اور کرتا رہا۔ بہر حال، میرے لیے اور کوئی چارہ بھی نہ تھا، اس لیے کہ اب ان سب نے مجھے سر اور پیروں سے پکڑ لیا تھا اور مجھے بستر کی طرف لیے جا رہے تھے۔ انھوں نے مجھ کو بستر پر دیوار سے ملا کر لٹا دیا، زخم کی جانب۔ پھر وہ سب کمرے سے نکل گئے، دروازہ بند کر دیا گیا۔ گانا رُک گیا۔ بادلوں نے چاند کو ڈھک لیا۔ بستر میرے گرد گرم تھا، کھلی ہوئی کھڑکیوں میں

Scanned with CamScanner

گھوڑوں کے سر پر چھائیوں کی طرح ہل رہے تھے۔

''تمھیں پتا ہے،'' ایک آواز نے میرے کان میں کہا۔ ''مجھے تمھارے اوپر بہت کم بھروسا ہے۔ تمھیں یہاں لاکر پھینک دیا گیا ہے، تم اپنے پیروں سے تھوڑی آئے ہو۔ میرے کام آنے کے بجائے تم مجھے میرے بسترِ مرگ پر پسیے ڈال رہے ہو۔ میرا جی تو چاہ رہا ہے کہ تمھاری آنکھیں کھرچ کر نکال لوں۔''

''درست!'' میں نے کہا۔ ''بات تو بڑے شرم کی ہے۔ اور میں پھر بھی ڈاکٹر ہوں۔ میں کیا کروں؟ یقین کرو، مجھے خود بھی کوئی بہت اچھا نہیں لگ رہا ہے۔''

''کیا مجھے بس اِس معذرت پر صبر کرلینا ہے؟ اف، مجھے یہی کرنا ہوگا، اس کے سوا میں کچھ نہیں کرسکتا۔ مجھے ہمیشہ سب کچھ جھیلنا پڑتا ہے۔ لے دے کر ایک عمدہ سا زخم ہے جو میں دُنیا میں لایا ہوں۔ میرے لیے بس اسی کو مقدر کیا گیا ہے۔''

''میرے دوست!'' میں نے کہا۔ ''تمھاری غلطی یہ ہے، تمھاری نگاہ میں وسعت نہیں۔ میں دور و نزدیک کے تمام مریضوں کے یہاں جاچکا ہوں، اور میں تم کو بتاتا ہوں، تمھارا زخم کوئی ایسا بہت خراب نہیں ہے۔ کسی تنگ گوشے میں تیشے کی دو ضربتوں سے آیا ہے۔ بہت سے لوگ اپنا پہلو پیش کر دیتے ہیں اور جنگل میں تیشے کی آواز انھیں بمشکل سنائی پڑتی ہے، اور اس کا تو انھیں اور بھی کم احساس ہوتا ہے کہ آواز اُن کے قریب تر آتی جارہی ہے۔''

''واقعی ایسا ہی ہے یا تم مجھے بخار میں آکر بہکار ہے ہو؟''

''واقعی ایسا ہی ہے، ایک سرکاری ڈاکٹر کی پوری ذمہ داری سے کہی ہوئی بات مانو۔''

اور اس نے بات مان لی اور چُپکا لیٹ رہا۔ لیکن اب میرے لیے فرار کی سوچنے کا موقع تھا۔ گھوڑے ابھی تک اپنی جگہ پر جمے ہوئے کھڑے تھے۔ میں نے جلدی جلدی اپنے کپڑے، اپنا سموری کوٹ، اپنا بیگ اٹھایا۔ میں کپڑے پہننے میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ گھوڑے جس رفتار سے آئے تھے اگر اسی رفتار سے گھر کو واپس جاتے تو مجھ کو فقط اس بستر سے اپنے بستر پر چھلانگ لگادینا تھی۔ ایک گھوڑا بڑی فرماں برداری کے ساتھ کھڑکی سے پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے اپنا بنڈل گاڑی میں پھینک دیا۔ سموری کوٹ کا نشانہ چوک گیا اور وہ ایک آنکڑے میں محض آستین سے اٹک کر رہ گیا۔ یہی

Scanned with CamScanner

بہت تھا۔ میں نے خود ایک گھوڑے پر جست لگا دی۔ برف میں باگیں گھسٹتی ہوئی، ایک گھوڑا دوسرے کے ساتھ یوں ہی سا بندھا ہوا، پیچھے پیچھے گاڑی ڈگمگاتی ہوئی، میرا اسموری کوٹ سب سے پیچھے۔

"ہرُرر . . ." میں نے کہا، لیکن گھوڑوں نے رفتار نہیں پکڑی۔ دھیرے دھیرے فرتوت بوڑھوں کی طرح ہم برفیلے بنجر میں رینگنے لگے۔ ہمارے پیچھے بچوں کا نیا مگر بے محل ترانہ دیر تک گونجتا رہا:

خوش ہو جاؤ، سب مریضو!

ڈاکٹر کو تمھارے ساتھ بستر میں لٹا دیا گیا ہے!

اس رفتار سے میں کبھی گھر نہیں پہنچ سکتا۔ میرا چلتا ہوا مطب چوپٹ ہو گیا ہے۔ میرا جانشین میرے ساتھ خیانت کر رہا ہے، لیکن بے سود، کیونکہ وہ میری جگہ نہیں لے سکتا۔ میرے گھر میں گرمایا ہوا سائیس بپھر رہا ہے، روزا اس کا شکار ہے، میں اب اس بارے میں اور کچھ سوچنا نہیں چاہتا۔ ننگا، اس بدترین دور کے پالے میں کھلا ہوا، ارضی گاڑی، غیر ارضی گھوڑوں کی سواری پر، میں اتنا بوڑھا آدمی، بھٹکتا پھر رہا ہوں۔ میرا اسموری کوٹ گاڑی کی پشت پر لٹک رہا ہے مگر میں اس تک پہنچ نہیں سکتا۔ اور میرے گنے چنے مریضوں میں سے کوئی انگلی تک نہیں ہلاتا۔ دغا! دغا! رات کو گھنٹی کی جھوٹی آواز کا ایک بار جواب دے دیا گیا۔ اب اس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ کبھی نہیں۔

Scanned with CamScanner

درخت

ایسا ہے کہ ہم برف میں درختوں کے تنوں کی طرح ہیں۔ دیکھنے میں وہ ڈھیلے ڈھالے پڑے ہوتے ہیں اور ایک ہلکا سا دھکا انھیں لڑھکانے کے لیے کافی ہونا چاہیے۔ نہیں، ایسا نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ وہ زمین میں پیٹھے ہوئے ہیں۔ مگر دیکھیے نا، خود یہ بھی دکھاوا ہی تو ہے۔

Scanned with CamScanner

نیا وکیل

ہمارے یہاں ایک نیا وکیل آیا ہے، ڈاکٹر بُسفیلس۔ اس کے حلیے میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جس سے آپ کو یہ خیال آسکے کہ وہ کسی زمانے میں سکندر مقدونی کا گھوڑا تھا۔ ہاں، اگر آپ اس کی کہانی سے واقف ہوں تو البتہ آپ کو کچھ کچھ ایسا محسوس ہو سکتا ہے۔ لیکن ابھی ایک دن جب وہ کچہری کے اگلے سنگی زینوں پر اتنے زور زور سے چڑھ رہا تھا کہ زینے اس کے پیروں تلے گونج رہے تھے تو میں نے دیکھا کہ ایک معمولی سا اردلی، جو ریس میں پابندی کے ساتھ چھوٹی موٹی بازیاں لگا لگا کر گھوڑوں کو آنکنے میں خوب مشاق ہو گیا ہے، وہ بھی اُس کا تعریفی نگاہوں سے جائزہ لے رہا تھا۔

مجموعی حیثیت سے وکیلوں کو اپنی جماعت میں بسفیلس کا داخل ہونا اچھا لگا ہے۔ لوگ حیرت خیز بصیرت سے کام لے کر خود سے کہتے ہیں کہ موجودہ معاشرے کا جو حال ہے اس کو دیکھتے ہوئے بسفیلس خاصی مشکل میں پڑا ہوا ہے۔ اس لیے، اور تاریخ عالم میں اس کی اہمیت کے لحاظ سے بھی، بسفیلس کم از کم اس کا حق ضرور رکھتا ہے کہ اس کا دوستانہ خیر مقدم کیا جائے۔ کون انکار کر سکتا ہے کہ اس زمانے میں کوئی سکندر اعظم نہیں ہے۔ ایسے لوگ تو بہتیرے ہیں جو جانتے ہیں کہ لوگوں کو کس طرح ہلاک کیا جائے، دعوت کی میز پر جا کر کسی دوست کو نیزے سے چھید دینے میں جو مہارت درکار ہوتی ہے اس کی کمی نہیں ہے، اور بہتوں کے نزدیک مقدونیہ بہت تنگ جگہ ہے، چنانچہ وہ فیلقوس کو، جو باپ تھا، کوستے ہیں۔ لیکن ہندوستان تک کا راستہ کوئی نہیں بتا سکتا، کوئی بھی نہیں۔ خود شہنشاہ کے زمانے میں بھی ہندوستان کے دروازے دسترس سے باہر تھے، پھر بھی اس کی تلوار نے اُن تک پہنچنے کا راستہ دکھا ہی دیا۔ آج اس سے زیادہ دور دست اور بلند مقامات کے دروازے اتر چکے ہیں لیکن کوئی راستہ نہیں

Scanned with CamScanner

دکھاتا۔ تلواریں لے کر چلتے تو بہتیرے ہیں لیکن ان کو صرف ہوا میں چلانے کے لیے، اور جو آنکھ ان کے ساتھ چلنے کی کوشش کرتی ہے وہ چندھیا کر رہ جاتی ہے۔

اس لیے شاید واقعی سب سے بہتر یہ ہے کہ وہی کیا جائے جو بسفیلس نے کیا ہے اور خود کو قانون کی کتابوں میں غرق کر دیا جائے۔ اب، کہ اُس کی کمر پر کسی سوار کی رانوں کا دباؤ نہیں ہے، جنگ کے شور و غوغا سے دور، لیمپ کی پرسکون روشنی میں، وہ ہمارے قدیم مجلدات کے اوراق دیکھتا اور پلٹتا رہتا ہے۔

Scanned with CamScanner

اگلا گاؤں

میرے دادا کہا کرتے تھے:

''زندگی حیرت خیز حد تک مختصر ہے۔ میں تو جب اپنی زندگی پر نظر کرتا ہوں تو یہ اتنی قلیل معلوم ہوتی ہے کہ مثال کے طور پر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی نوجوان اس اندیشے کے بغیر اگلے گاؤں کو روانہ ہونے کا ارادہ کس طرح کر سکتا ہے کہ ایسے سفر میں جتنا وقت درکار ہوگا اس کے لیے — حادثوں سے قطع نظر — ایک پوری خوش و خرم طبعی زندگی کی مدت بھی کم پڑ سکتی ہے۔''

Scanned with CamScanner

گیدڑ اور عرب

ہم نخلستان میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ میرے ساتھی سو رہے تھے۔ ایک عرب کا لمبا سفید ہیولا پاس سے گذرا۔ وہ اونٹوں کی دیکھ بھال کرتا رہا تھا اور اپنے سونے کے ٹھکانے پر جا رہا تھا۔

میں گھاس پر پیٹھ کے بل دراز ہو گیا۔ میں نے سونے کی کوشش کی، نہیں سو سکا۔ دور پر ایک گیدڑ نے ہانک لگائی۔ میں پھر اٹھ کر بیٹھ گیا اور جو کچھ اتنی دور تھا یک بہ یک بالکل پاس آ گیا۔ گیدڑ میرے چاروں طرف پلے پڑ رہے تھے، آنکھوں کی مدھم سنہری چمک ظاہر اور پھر غائب ہوتی ہوئی، لچک دار جسم بڑی چستی اور ہم آہنگی کے ساتھ جیسے کوڑے کی پھٹکار پر جنبش کرتے ہوئے۔

میری پشت کی طرف سے ایک گیدڑ، میری بغل کے نیچے ٹہوکا دیتا ہوا، مجھ سے بالکل بھڑ کر نکلا جیسے مجھ سے گرمی حاصل کرنا چاہتا ہو۔ پھر وہ میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا:

"میں دور و نزدیک کا سب سے معمر گیدڑ ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ آخر کار یہاں آپ سے ملاقات ہو ہی گئی۔ میں تو قریب قریب مایوس ہو گیا تھا، اس لیے کہ ہم لوگ قرنوں سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں، میری ماں کو آپ کا انتظار رہا، اور اس کی ماں کو، اور سارے گیدڑوں کی مادرِ اول تک تمام ماؤں کو۔ یہ حقیقت ہے، آپ یقین کریں۔"

"تعجب ہے،" میں نے کہا، مجھے اُس الاؤ کو جلانے کا بھی خیال نہیں رہا جو گیدڑوں کو بھگانے کے لیے بالکل تیار تھا۔ "مجھے یہ سن کر بڑا تعجب ہوا۔ یہ محض اتفاق ہے کہ میں شمال سے ادھر آ نکلا ہوں، اور میں تمھارے ملک کا مختصر سا دورہ کر رہا ہوں۔ اچھا تو تم گیدڑ لوگ کیا چاہتے ہو؟"

Scanned with CamScanner

اس نہایت دوستانہ پرسش سے جیسے گیدڑوں کی ہمت بڑھ گئی، میرے گرد ان کا حلقہ تنگ ہو گیا۔ سب کے سب منھ کھولے ہانپ رہے تھے۔

''ہمیں معلوم ہے،'' سب سے زیادہ عمر والا بولا، ''کہ آپ شمال سے آئے ہیں، اسی بات پر ہم نے اپنی امیدیں منحصر کی ہیں۔ آپ اہلِ شمال میں وہ فراست ہے جو عربوں میں نہیں پائی جاتی۔ مجھے کہنے دیجیے کہ ان کی ٹھس اور گستاخ فطرت میں سے فراست کی ایک چنگاری بھی نہیں نکل سکتی۔ وہ غذا کی خاطر جانوروں کو ذبح کر ڈالتے ہیں اور ان کی آلائش کو پھینک دیتے ہیں۔''

''اتنا چلّا کر نہیں!'' میں نے کہا۔ ''پاس ہی عرب سو رہے ہیں۔''

''آپ واقعی یہاں اجنبی ہیں،'' گیدڑ بولا، ''ورنہ آپ کو معلوم ہوتا کہ دنیا کی تاریخ میں کبھی کوئی گیدڑ کسی عرب سے خوفزدہ نہیں ہوا ہے۔ ہم ان سے کیوں ڈریں؟ کیا یہی بدنصیبی ہمارے لیے کم نہیں ہے کہ ہم کو ایسی مخلوق کے درمیان بن باس ملا ہے؟''

''ہو سکتا ہے، ہو سکتا ہے۔ جو معاملات میرے اپنے حلقۂ اثر سے اتنے باہر ہوں، میں ان پر فیصلہ دینے کا مجاز نہیں ہوں۔ مجھے تو یہ بڑا پرانا قضیہ معلوم ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ خون میں شامل ہو چکا ہے اور شاید خون ہی کے ساتھ ختم ہو سکے۔''

''آپ نہایت سمجھدار ہیں،'' بوڑھے گیدڑ نے کہا، اور وہ سب اور زور زور سے ہانپنے لگے۔ ان کے پھیپھڑوں سے ہوا باہر آنے لگی حالانکہ وہ ساکت کھڑے تھے۔ اُن کے کھلے ہوئے جبڑوں سے ایک طرح کی بو آ رہی تھی جسے برداشت کرنے کے لیے مجھے بار بار دانت بھینچنا پڑتے تھے۔ ''آپ نہایت سمجھدار ہیں۔ ابھی آپ نے جو کہا وہ ہماری قدیم روایات سے مطابقت رکھتا ہے۔ لہٰذا ہم اُن کا خون کھینچ لیں گے اور قضیہ ختم ہو جائے گا۔''

''اوہو!'' میں نے اپنے ارادے سے زیادہ جوش کے ساتھ کہا۔ ''وہ اپنا بچاؤ کریں گے۔ وہ اپنی تفنگوں سے تمھیں درجنوں کے حساب میں مار گرائیں گے۔''

''آپ کو ہمارے بارے میں غلط فہمی ہے،'' اس نے کہا۔ ''یہ ایک انسانی کمزوری ہے جو ظاہراً شمالِ بعید میں بھی جڑ پکڑے ہوئے ہے۔ ہم انھیں قتل کرنے کی تھوڑی سوچ رہے ہیں۔ نیل کا سارا پانی بھی ہم کو ان سے پاک نہیں کر سکتا۔ ان کے تو زندہ گوشت کی جھلک ہی سے ہم

کہ دُم دبائیں اور کھلی ہوا میں بھاگ جائیں، صحرا کی طرف، جو محض اسی سبب سے ہمارا مسکن بن گیا ہے۔''

اور آس پاس کے تمام گیدڑوں نے، جن میں دور دور سے آئے ہوئے بہت سے نو وارد بھی شامل ہو گئے تھے، اپنی تھوتھنیاں اپنی اگلی ٹانگوں پر رکھ دیں اور انھیں پنجوں سے پونچھنے لگے۔ کچھ ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنے غصے کو چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں جو اتنا شدید تھا کہ میرا جی چاہنے لگا اُن کے سروں پر سے پھاند پھاند کر نکل جاؤں۔

''تو پھر تمھارا کیا کرنے کا ارادہ ہے؟'' میں نے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا، لیکن میں کھڑا نہیں ہو سکا، دو کم سن گیدڑوں نے میرے کوٹ اور قمیص میں اپنے دانت گاڑ رکھے تھے، میں بیٹھے رہنے پر مجبور تھا۔

''یہ آپ کے خدام ہیں،'' بوڑھے گیدڑ نے وضاحت کی۔ ''اعزاز کی علامت۔''

''نہیں، انھیں چھوڑنا پڑے گا!'' میں کبھی بوڑھے گیدڑ اور کبھی کم سن گیدڑوں کی طرف مڑتا ہوا چیخا۔

''بالکل چھوڑ دیں گے،'' بوڑھا والا کہنے لگا، ''کیونکہ آپ کی یہی مرضی ہے۔ مگر اس میں زرا وقت لگے گا، اس لیے کہ انھوں نے بہت اندر تک دانت اتار دیے ہیں جیسا کہ ہمارا طریقہ ہے۔ جب تک آپ ہماری عرضداشت کی سماعت فرمائیں۔''

''تمھارے طرزِ عمل نے مجھے اس کو منظور کرنے کے حق میں نہیں رکھا ہے،'' میں نے کہا۔

''اس کی وجہ سے آپ ہم کو بدتمیز نہ سمجھ لیجیے گا،'' وہ بولا اور اب جا کر پہلی بار اس نے اپنی آواز کے قدرتی رونے پن سے کام لیا۔ ''ہم ادنیٰ جانور ہیں، ہمارے پاس دانتوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے، اچھا یا بُرا جو کام بھی کرنا ہوتا ہے ہم اپنے دانتوں ہی سے انجام دے پاتے ہیں۔''

''خیر، تو تم چاہتے کیا ہو؟'' میں نے زیادہ دھیمے پڑے بغیر پوچھا۔

''حضور!'' وہ چلایا اور سارے گیدڑ مل کر چیخنے لگے۔ اس میں کسی نغمے کی برائے نام سی کیفیت تھی۔ ''حضور، ہم آپ سے گذارش کرتے ہیں کہ اس قضیے کو ختم کرائیے جو دنیا کو تقسیم کیے ہوئے ہے۔ آپ عین وہی ہستی ہیں جس کے لیے ہمارے اجداد نے پیشین گوئی کی تھی کہ یہ کام انجام دینے کے

Scanned with CamScanner

لیے پیدا ہوگی۔ اب ہم عربوں کے ہاتھوں پریشان نہیں ہونا چاہتے، ہم سانس لینے بھر کی گنجائش چاہتے ہیں، ایسا مطلع چاہتے ہیں جو ان سے صاف ہو، ان کے ہاتھوں ذبح ہوتی ہوئی بھیڑوں کا میانا نہیں سننا چاہتے۔ ہر حیوان قدرتی موت مرے۔ جب تک ہم مرے ہوئے ڈنگروں کو چھوڑ کر ان کی ہڈیاں نہ صاف کر دیں اس وقت تک کوئی مداخلت نہ ہو۔ صاف ستھری زندگی، صفائی ستھرائی کے سوا ہم کچھ نہیں چاہتے......'' اور اب وہ سب کے سب رو رہے تھے اور سسکیاں بھر رہے تھے۔ '' ایسی دنیا میں جینا کیونکر گوارا کر سکتا ہے، اے رحم دل، اے پاک باطن! نجاست ان کا سفید ہے، نجاست ان کا سیاہ ہے، ان کی داڑھیاں الحذر! اُن کے حلقۂ چشم پر نگاہ پڑتے ہی تھوک دینے کو جی چاہتا ہے، اور جب وہ ہاتھ اوپر کرتے ہیں تو جہنم کی تیرگی ان کی بغلوں میں منہ پھاڑے نظر آتی ہے۔ لہٰذا حضور، لہٰذا حضور والا، اپنے قوی ہاتھوں سے کام لے کر ان کے حلقوم اس قینچی سے چیر دیجیے۔''

اور اس کے سر کی جنبش کے جواب میں ایک گیدڑ لپک کر ایک چھوٹی سلائی والی پرانی زنگ خوردہ قینچی لیے ہوئے آیا جو اس کی ایک کچلی میں جھول رہی تھی۔

'' اخاہ، تو آخر قینچی آ ہی گئی، اور یہی روک دینے کا وقت ہے!'' ہمارے عرب قافلہ سالار نے، جو ہماری طرف بڑھ آیا تھا اور اب اپنا کوڑا پھٹکار رہا تھا، چیخ کر کہا۔

گیدڑ ہڑبڑا کر بھاگ کھڑے ہوئے لیکن کچھ دور جا کر پلٹے اور جمگھٹا لگا کر کھڑے ہو گئے۔ سارے جانور اس طرح آپس میں گھتے ہوئے تھے جیسے بیابان کی آسیبی روشنی کے ہالے نے انھیں چھوٹے سے گھیرے میں کیل کر رکھ دیا ہو۔

'' تو صاحب، آپ کو بھی یہ تماشا دکھایا گیا؛'' عرب نے، جس حد تک اس کی قومی کم آمیزی اجازت دے سکتی تھی، شوخی سے ہنستے ہوئے کہا۔

'' یعنی تم کو معلوم ہے کہ یہ جانور کیا کرنا چاہتے ہیں؟''

'' بالکل،'' اس نے کہا۔ '' یہ تو مشہور بات ہے۔ جب تک عرب ہیں یہ قینچی صحرا میں گھوم رہی ہے اور جب تک ہمارے دن پورے نہیں ہو جاتے اسی طرح ہمارے ساتھ ساتھ گھومتی رہے گی۔ ہر یورپ والے کے آگے یہ قینچی اس امرِ عظیم کی انجام دہی کے واسطے لائی جاتی ہے۔ ہر یورپ والا عین وہی شخص ہوا کرتا ہے جسے مشیت نے ان کے لیے منتخب کیا ہوتا ہے۔ یہ جانور! ان کی امیدیں احمقانہ

ترین ہوتی ہیں۔ یہ محض بے وقوف ہیں، ایک دم بے وقوف۔ اسی لیے تو یہ ہم کو اچھے لگتے ہیں۔ یہ ہمارے کتے ہیں، آپ لوگوں کے کسی بھی کتے سے بہتر۔ اچھا اب زرا دیکھیے گا۔ کل رات ایک اونٹ مرا ہے اور میں اسے یہاں اٹھوالایا ہوں۔''

چار آدمی اونٹ کا بھاری مردہ اٹھا کر لائے اور انھوں نے اسے ہمارے سامنے ڈال دیا۔ اس کا زمین کو چھونا تھا کہ گیدڑ زور زور سے بولنے لگے۔ ان میں سے ہر ایک نے پیٹ کے بل رینگتے ہوئے آگے کھسکنا شروع کر دیا جیسے وہ کسی ڈور میں باندھ کر زبردستی گھسیٹے جا رہے ہوں۔ انھوں نے عربوں کو فراموش کر دیا تھا، اپنی نفرت کو فراموش کر دیا تھا۔ متعفن لاشے کے سب کچھ محو کر دینے والے پیش دست وجود نے ان کو مسحور کر لیا تھا۔ ایک گیدڑ تو اونٹ کے گلے تک پہنچ کر ایک شریان میں دانت اتار بھی چکا تھا۔ کسی تیز پچکاری کی طرح جیسے کوئی بھڑکتی ہوئی آگ کو بجھانے کے عزم اور امید کے ساتھ اس کی بوٹی بوٹی پھڑک رہی تھی اور کام میں لگی ہوئی تھی۔ پلک جھپکتے میں لاشے کے اوپر انبار ہو کر وہ سب ایک ساتھ جتے ہوئے تھے۔

اور اب قافلہ سالار نے اپنا کاٹ دار کوڑا گھما گھما کر داہنے بائیں سے ان کی پیٹھوں پر برسانا شروع کیا۔ انھوں نے سر اٹھائے، وہ مزے میں آ کر متوالے ہو رہے تھے، انھوں نے عربوں کو اپنے سامنے کھڑے دیکھا، اپنی تھوتھنیوں پر کوڑے کی مار محسوس کی، وہ اچھل اچھل کر کچھ پیچھے ہو گئے۔ لیکن اتنی دیر میں اونٹ کا خون جگہ جگہ اکٹھا ہو گیا تھا اور اس کے ابخرات اٹھ اٹھ کر آسمان کی طرف جا رہے تھے۔ لاشہ جا بجا سے پھٹ کر کھل گیا تھا۔ ان سے رہا نہیں گیا۔ وہ پھر پلٹ پڑے۔ عرب سالار نے ایک بار پھر کوڑا اٹھایا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''آپ کا خیال ٹھیک ہے صاحب،'' اس نے کہا۔ ''ہم انھیں ان کے حال پر چھوڑے دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ اب پڑاؤ اٹھانے کا بھی وقت ہو رہا ہے۔ غرض یہ کہ آپ نے ان کو دیکھ لیا۔ خوب ہی جانور ہیں، ہیں نا؟ اور یہ ہم سے کیسی نفرت کرتے ہیں!''

Scanned with CamScanner

ریڈ انڈین ہونے کی خواہش

کاش کوئی ریڈ انڈین ہی ہوتا، ہر دم چوکنا اور ایک دوڑتے ہوئے گھوڑے پر سوار، ہوا کے سامنے جھکا ہوا۔ مرتعش زمین کے اوپر جھٹکے کھاتا، تھرتھراتا ہوا، یہاں تک کہ وہ اپنے مہمیز پھینک دیتا اس لیے کہ مہمیزوں کی حاجت ہی نہ ہوتی، لگامیں گرا دیتا اس لیے کہ لگاموں کی حاجت ہی نہ ہوتی، اور ابھی اس نے سامنے برابر سے کٹی ہوئی جھاڑیوں والی زمین کو دیکھا ہی ہوتا کہ گھوڑے کی گردن اور سر اڑ بھی گئے ہوتے۔

فیصلہ

(ف کے لیے ایک کہانی)

بھری بہار میں اتوار کی ایک صبح تھی۔ دریا کے کنارے ایک قطار میں بنے ہوئے چھوٹے بودے مکان جن میں رنگ اور بلندی کے سوا کوئی اور فرق مشکل ہی سے نظر آتا تھا، ان میں سے ایک کی پہلی منزل پر اپنے نجی کمرے میں ایک نوجوان تاجر جارج بنڈمان بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ابھی ابھی اپنے ایک پرانے دوست کے نام، جو اب پردیس میں رہنے لگا تھا، خط لکھ کر ختم کیا تھا اور کھوئے ہوئے انداز میں آہستہ آہستہ لفافے کے اندر رکھ کر میز پر کہنیاں ٹیکے کھڑکی سے باہر دریا، پل اور اُس پار کی سرسبز پہاڑیوں پر ٹکٹکی لگائے تھا۔

وہ اپنے دوست کے متعلق سوچ رہا تھا جو وطن میں اپنے مستقبل سے مطمئن نہ ہونے کی بنا پر چند سال پہلے روس بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ اب وہ سینٹ پیٹرسبرگ میں کاروبار کر رہا تھا جو شروع شروع میں تو چمکا تھا لیکن اب عرصے سے بگڑتا جا رہا تھا۔ اسے جب بھی وطن آنے کا اتفاق ہوتا — اور یہ اتفاق کم سے کم تر ہوتا جا رہا تھا — وہ اس کی شکایت ضرور کرتا۔ غرض اس طرح وہ ایک غیر ملک میں اپنی عمر گنوا رہا تھا۔ اس کی بڑی سی نامانوس داڑھی اس کے چہرے کو، جسے جارج بچپن ہی سے پہچانتا تھا، پوری طرح چھپا نہیں پائی تھی، اور اس کی رنگت ایسی پیلی ہوتی جا رہی تھی کہ خیال ہوتا تھا اسے اندر اندر کوئی روگ لگ گیا ہے۔ اس کے اپنے بیان کے مطابق وہاں بسے ہوئے اپنے ہم وطنوں کی جماعت سے اس کا کوئی مستقل رابطہ قائم نہیں تھا اور روسی کنبوں سے بھی اس کی رسم و راہ نہیں کے برابر تھی۔ چنانچہ وہ مستقل تجرد کی زندگی پر راضی ہوتا جا رہا تھا۔

Scanned with CamScanner

ایسے آشفتہ روزگار آدمی کو، جس کے حال پر افسوس تو کیا جا سکتا ہو لیکن اس کی مدد نہ کی جا سکتی ہو، کوئی لکھتا تو کیا لکھتا۔ کیا اسے یہ مشورہ دیا جاتا کہ وطن واپس آ جائے، پھر سے اپنے پاؤں جمائے اور پرانی دوستیوں کی تجدید کرے؟ اس میں کوئی رکاوٹ ہی نہ تھی۔ مجموعی حیثیت سے اپنے دوستوں کی امداد پر تکیہ کرے؟ لیکن یہ تو گویا اس کو جتانا ہوتا اور جتنی نرمی سے یہ بات کہی جاتی اتنی ہی دل کو ٹھیس لگاتی کہ اس کی اب تک کی تمام جدوکوشش رائیگاں گئی ہے، کہ بس اب اسے باز آ جانا چاہیے، کہ وہ وطن لوٹ آئے اور اُن نظروں کا نشانہ بنے جو اسے انجیل کے پشیمان بیٹے کی طرح دیکھ رہی ہوں، کہ اس کے دوست ہی معاملہ شناس ہیں اور یہ کہ وہ خود محض ایک بڑا سا بچہ ہے جسے وہی کرنا چاہیے جو اس کے کامیاب اور گھر گرہست دوست تجویز کریں۔ اور با ایں ہمہ کیا یہ ضروری تھا کہ جس مقصد سے اس کو یہ تمام اذیت پہنچائی گئی ہوتی وہ مقصد حاصل بھی ہو جاتا؟ شاید اس کو وطن واپس آنے پر تیار کر لینا سرے سے ممکن ہی نہ ہو۔ وہ خود کہتا تھا کہ اب وہ وطن کے تجارتی معاملات سے بیگانہ ہو چکا ہے۔ تو پھر وہ اس سب کے بعد بھی، دوستوں کی نصیحت سے مکدّر اور پہلے سے بھی زیادہ ان سے کھنچا کھنچا، ایک اجنبی کی طرح پردیس میں پڑا رہے گا۔ لیکن اگر اس نے دوستوں کا مشورہ قبول ہی کر لیا اور اس کے بعد وطن میں کھپ نہ سکا— ظاہر ہے کسی کی عداوت کی وجہ سے نہیں بلکہ حالات کے دباؤ سے— اپنے دوستوں کے ساتھ، یا اُن کے بغیر بھی، بسر نہ کر سکا، ہتکی محسوس کرتا رہا، یہ بھی کہنے سے گیا کہ اس کے کچھ اپنے دوست یا کوئی اپنا وطن بھی ہے، تو پھر کیا اس کے لیے بہتر نہ رہا ہوتا کہ وہ جس طرح پردیس میں پڑا تھا اسی طرح پڑا رہتا؟ ان سب باتوں کے پیش نظر کیونکر یقین کیا جا سکتا تھا کہ وطن میں اس کی زندگی کامیاب رہے گی؟

اس لیے بالفرض کوئی اس کے ساتھ خط و کتابت رکھنا بھی چاہتا تو اس کو اس طرح کی صحیح صحیح خبریں نہیں بھیج سکتا تھا جیسی بعید ترین آشناؤں کو بے دھڑک بھیجی جا سکتی ہیں۔ اس کو آخری بار وطن آئے ہوئے تین برس سے زیادہ ہو رہے تھے اور اس کے لیے وہ روس کی سیاسی صورتِ حال کے بہت غیر یقینی ہونے کا عذرِ لنگ پیش کرتا تھا جو گویا ایک معمولی سے تاجر کو مختصر ترین مدت کے لیے بھی باہر جانے کی اجازت نہیں دیتی تھی، درحالے کہ یہی صورتِ حال ہزاروں لاکھوں روسیوں کو اطمینان کے ساتھ بیرون ملک جانے دیتی تھی۔ لیکن انھیں تین برسوں میں خود جارج کی زندگی کا نقشہ بہت کچھ

Scanned with CamScanner

بدل گیا تھا۔ دو سال ہوئے اس کی ماں مرگئی تھی، جس کے بعد سے وہ اور اس کا باپ مل کر گھر داری چلا رہے تھے، اور ظاہر ہے کہ اس کے دوست کو اس کی اطلاع کر دی گئی تھی اور اس نے خط کے ذریعے ایسے روکھے الفاظ میں اظہارِ ہمدردی کیا تھا جس سے یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہونا پڑتا تھا کہ اس طرح کے واقعے کی الم آفرینی کا اندازہ کسی دور دراز کے ملک میں بیٹھ کر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بہرحال، اس کے بعد سے جارج کاروبار اور دیگر تمام امور میں اور زیادہ منہمک ہو گیا۔

ماں کی زندگی کے دوران وہ تجارت میں زیادہ کارگزاری شاید اس لیے نہیں دکھا سکا تھا کہ اس کا باپ ہر معاملے میں اپنی مرضی چلانے پر تلا رہتا تھا۔ شاید ماں کی موت کے بعد سے اس کے باپ کی جارحیت میں کچھ کمی آ گئی تھی، ہر چند کہ اب بھی تجارت میں اس کی سرگرمی برقرار تھی۔ شاید یہ بہت کچھ قسمت کی اتفاقی یاوری کے سبب سے ہوا ہو — یقیناً یہ بات بہت قرینِ قیاس تھی — لیکن بہرکیف ان دو برسوں کے اندر کاروبار نہایت ہی غیر متوقع طور پر چمک اٹھا تھا۔ عملہ دگنا کرنا پڑا تھا، آمدنی پانچ گنا ہو گئی تھی۔ بلاشک وشبہ ابھی مزید ترقی کی راہ کھلی ہوئی تھی۔

لیکن جارج کے دوست کو اس پیش رفت کی کوئی خبر نہ تھی۔ شروع کے چند برسوں میں، شاید آخری بار اُس تعزیتی خط میں، اس نے جارج کو روس چلے آنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی تھی اور خصوصی طور پر جارج کے شعبۂ تجارت میں ترقی کے امکانات خوب بڑھا چڑھا کر دکھائے تھے۔ اس نے جو اعداد و شمار پیش کیے تھے وہ جارج کے موجودہ لین دین کے آگے کچھ بھی نہیں تھے۔ تاہم وہ اپنے دوست کو اپنی کاروباری کامیابیوں سے آگاہ کرتے ہچکچاتا تھا، اور اب اگر وہ شروع سے اس پرانے قصے کو چھیڑتا تو یقیناً یہ کچھ عجیب سا لگتا۔

اس لیے جارج اپنے دوست کو محض اِدھر اُدھر کی غیر اہم باتیں لکھنے پر اکتفا کیا کرتا تھا جو کسی بھی پُرسکون اتوار کو سستی کے ساتھ سوچتے ہوئے آدمی کے ذہن میں آ جایا کرتی ہیں۔ وہ فقط یہ چاہتا تھا کہ اس کے دوست نے اس طویل مدت میں وطن کا جو تصور اپنی تسلیٔ خاطر کے لیے قائم کر رکھا ہو گا، اس کو جوں کا توں قائم رہنے دے، اور اس لیے ایسا ہوا کہ جارج نے تین مرتبہ خاصے خاصے وقفے سے لکھے ہوئے تین خطوں میں ایک غیر اہم شخص کی منگنی ایک اتنی ہی غیر اہم لڑکی کے ساتھ ہو جانے کا ذکر کیا، یہاں تک کہ اس کے مدعا کے برخلاف اس کا دوست اس قابلِ ذکر واقعے میں کچھ کچھ دلچسپی ظاہر

Scanned with CamScanner

کرنے لگا۔

تاہم جارج اس قسم کی باتیں لکھنے کو اس امر کے اعتراف پر ترجیح دیتا تھا کہ خود اس کی منگنی ایک مہینہ ہوا ایک کھاتے پیتے گھر کی لڑکی فرالین فریڈا بریند نفلڈ کے ساتھ ہو گئی تھی۔ وہ اکثر اپنی منگیتر سے اپنے اس دوست اور اس انوکھے رابطے کے بارے میں تبادلۂ خیال کرتا تھا جو خط و کتابت کے ذریعے دونوں میں پیدا ہو گیا تھا۔

''تو وہ ہماری شادی میں نہیں آ رہا ہے،'' اس نے کہا تھا۔ ''پھر بھی مجھے تمھارے سارے دوستوں سے واقف ہو جانے کا حق تو ہے ہی۔''

''میں اسے تکلیف دینا نہیں چاہتا،'' جارج نے جواب دیا تھا۔ ''... میرا مطلب غلط نہ سمجھو۔ شاید وہ آ ہی جائے، کم سے کم میرا تو یہی خیال ہے، لیکن وہ محسوس کرے گا کہ اس کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے، اور اسے اذیت ہو گی، شاید اسے مجھ پر رشک آنے لگے، اور بے اطمینانی کا شکار تو وہ یقیناً ہو جائے گا، اور اس بے اطمینانی کا کوئی چارہ کیے بغیر ہی اس کو پھر تنہا واپس جانا ہو گا۔ تنہا... تم اس کا مطلب سمجھتی ہو نا؟''

''ہاں۔ لیکن کیا اسے کسی اور طریقے سے ہماری شادی کا علم نہیں ہو سکتا؟''

''ظاہر ہے کہ میں اس کو روک نہیں سکتا، لیکن اس کی زندگی کی جو روش ہے اس کو دیکھتے ہوئے اس کا امکان کم ہی ہے۔''

''جارج، اگر تمھارے دوست اسی قسم کے ہیں تو تمھیں منگنی کرنا ہی نہیں چاہیے تھی۔''

''خیر، اس میں ہم دونوں قصوروار ہیں۔ لیکن اب تو جو کچھ ہو گیا میں اس سے پھرنے کا نہیں۔'' اور جب اس کے بوسوں تلے آہستہ آہستہ ہانپتے ہوئے بھی وہ یہ کہہ گئی:

''پھر بھی مجھے گھبراہٹ سی ہو رہی ہے۔''

تو اس نے سوچا کہ اگر وہ اپنے دوست کو یہ اطلاع دے بھی دے تو حقیقتاً اُسے کسی پریشانی میں مبتلا نہیں ہونا پڑے گا۔

''میں اسی قسم کا آدمی ہوں اور اسے مجھ کو اِسی صورت میں قبول کرنا ہو گا،'' اس نے خود سے کہا۔ ''اس کے ساتھ مزید موافقت کی خاطر میں خود کو کسی دوسرے سانچے میں نہیں ڈھال سکتا۔''

Scanned with CamScanner

اور واقعی اس نے اتوار کی صبح کو لکھے جانے والے اس طویل خط میں اپنے دوست کو محبت میں اپنی کامیابی سے ان الفاظ میں مطلع کر ہی دیا:

''میں نے بہترین خبر آخر کے لیے بچا رکھی ہے۔ میری منگنی ایک متمول خاندان کی لڑکی فرالین فریڈا برینڈ نفلڈ سے ہوگئی ہے۔ اس نے تمھارے جانے کے عرصے بعد یہاں کی سکونت اختیار کی ہے، اس لیے تم اسے شاید ہی جانتے ہو۔ اس کے متعلق مزید تفصیلات پھر کبھی لکھوں گا۔ آج تو میں تم کو بس اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ میں بہت خوش ہوں۔ اور میرے تمھارے تعلقات میں صرف اتنا فرق ہے کہ اب تم مجھ کو ایک بالکل معمولی قسم کے دوست کے بجائے ایک خوش وخرم دوست پاؤ گے۔ اس کے علاوہ میری منگیتر کی صورت میں، جو تم کو بہت سلام لکھوا رہی ہے اور جلد ہی خود بھی تمھیں خط لکھے گی، تم صنفِ مخالف کا ایک کھرا دوست پاؤ گے، جو ایک مجرد آدمی کے لیے کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ بہت سے اسباب ہیں جن کی بنا پر تم ہم سے ملنے نہیں آ سکتے۔ لیکن کیا میری شادی عین وہ موقع نہیں ہے جس کی خاطر ساری رکاوٹوں کو دور کر دیا جائے؟ بہر حال، جو بھی ہو، تم وہی کرو جو تمھیں مناسب معلوم ہو اور اس میں اپنی مصلحت کے سوا کسی اور بات کا لحاظ نہ کرنا۔''

یہ خط ہاتھ میں لیے ہوئے جارج دیر سے مطالعے کی میز پر کھڑکی کی طرف منھ کیے بیٹھا تھا۔ اس نے ابھی ابھی سڑک پر سے گذرتے ہوئے ایک شناسا کے سلام کا جواب کھوئی کھوئی مسکراہٹ کے ساتھ دیا تھا۔

آخر کار اس نے خط جیب میں رکھا اور اپنے کمرے سے نکل کر چھوٹی سی غلام گردش میں ہوتا ہوا اپنے باپ کے کمرے میں داخل ہوا جہاں وہ مہینوں سے نہیں گیا تھا۔ دراصل اسے وہاں جانے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی تھی، اس لیے کہ کاروبار کے سلسلے میں اس کی ملاقات روز ہی اپنے باپ سے ہوتی تھی اور دن کا کھانا وہ دونوں ایک ہوٹل میں ساتھ ہی کھاتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ شام کو دونوں اپنے اپنے کام سے کام رکھتے تھے لیکن پھر بھی اگر جارج اپنے دوستوں کے ساتھ نہ نکل جاتا — جیسا کہ اکثر ہوتا تھا — یا، اب ادھر کچھ دن سے، اپنی منگیتر کے پاس نہ چلا جاتا تو وہ دونوں مشترکہ دیوان خانے میں بیٹھ کر اپنا اپنا اخبار پڑھا کرتے۔

جارج کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اس کے باپ کا کمرہ اس چمکیلی صبح کو بھی کیسا تاریک ہے۔ تنگ

Scanned with CamScanner

صحن کے اس سرے والی دیوار نے اس کمرے پر کچھ ایسا ہی سایہ کر رکھا تھا۔ اس کا باپ ایک گوشے میں، جہاں جارج کی مرحومہ ماں کی مختلف نشانیاں آویزاں تھیں، کھڑکی کے پاس بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا جسے وہ نگاہ کی کمزوری کے باعث آنکھوں کی سیدھ سے ذرا ہٹا کر تھامے ہوئے تھا۔ میز پر ناشتے کے جھوٹے برتن پڑے تھے اور بظاہر ان میں سے زیادہ کھایا نہیں گیا تھا۔

''اوہو، جارج،'' اس کے باپ نے یکبارگی اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ آگے بڑھا تو اس کا بھاری بھرکم ڈریسنگ گاؤن کھل گیا اور اس کے دامن اس کے اِدھر اُدھر پھڑ پھڑانے لگے۔

''میرا باپ ابھی تک دیوزاد ہے،'' جارج نے اپنے آپ سے کہا۔ ''یہاں تو ناقابلِ برداشت اندھیرا ہے،'' وہ بلند آواز سے بولا۔

''ہاں، خاصا اندھیرا ہے،'' اس کے باپ نے کہا۔

''اور آپ نے کھڑکی بھی بند کر رکھی ہے۔''

''مجھے اسی طرح رہنا اچھا لگتا ہے۔''

''باہر تو خوب گرمی ہے،'' جارج گویا اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا اور بیٹھ گیا۔

اس کے باپ نے ناشتے کے برتن صاف کیے اور الماری میں رکھ دیے۔ ''میں آپ کو بس یہ بتانا چاہتا تھا،'' جارج جو بوڑھے کے حرکات وسکنات کو بے خیالی میں دیکھ رہا تھا، کہنے لگا، ''کہ اب میں اپنی منگنی کی خبر سینٹ پیٹرسبرگ بھیج رہا ہوں۔'' اس نے خط اپنی جیب سے تھوڑا سا نکالا اور پھر رکھ لیا۔

''سینٹ پیٹرسبرگ؟'' اس کے باپ نے پوچھا۔

''اپنے دوست کو،'' جارج نے اپنے باپ سے نظریں ملانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ کاروبار کے اوقات میں تو وہ کچھ اور ہی ہوتا ہے، وہ سوچ رہا تھا، لیکن یہاں کس طرح بازو باندھے جما ہوا بیٹھا ہے۔

''اچھا، اپنے دوست کو،'' اس کے باپ نے کچھ عجیب طرح سے زور دے کر کہا۔

''آپ کو تو معلوم ہی ہے، ابا، کہ پہلے میں اس کو اپنی منگنی کے بارے میں نہیں بتانا چاہتا تھا۔ اُسی کے خیال سے، بس یہی وجہ تھی۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ وہ عجیب سا آدمی ہے۔ میں نے سوچا کہ

Scanned with CamScanner

ہوسکتا ہے کوئی اَور اسے میری منگنی کے بارے میں بتا دے، حالانکہ وہ اتنا گوشہ نشین آدمی ہے کہ اس کا امکان کم ہی ہے۔ تاہم میں اسے روک نہیں سکتا۔ لیکن میرا خود اسے بتانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔''

''اور اب تم نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے؟'' اس کے باپ نے کھڑکی کی چوکھٹ پر اپنا بڑا سا اخبار ڈال دیا، اس پر اپنی عینک رکھی اور عینک کو ایک ہاتھ سے ڈھانپ لیا۔

''جی ہاں، میں اس پر غور کرتا رہا ہوں۔ میں نے سوچا اگر وہ واقعی میرا دوست ہے تو میری منگنی کی خوش خبری سے اس کو بھی خوش ہونا چاہیے۔ اس لیے اب میں یہ خبر اس سے پوشیدہ نہیں رکھوں گا۔ لیکن خط کو ڈاک میں ڈالنے سے پہلے میں چاہتا تھا آپ کو بتا دوں۔''

''جارج،'' اس کے باپ نے اپنا پوپلا منھ پھاڑ کر کہا۔ ''سنو! تم اس سلسلے میں میرے پاس آئے ہو، اس پر مجھ سے گفتگو کرنے۔ بے شک یہ تمھاری بڑی سعادت مندی ہے۔ لیکن یہ کچھ نہیں ہے۔ اگر تم مجھے پوری بات سچ سچ نہیں بتاتے تو یہ کچھ نہیں سے بھی بدتر ہے۔ میں وہ باتیں نہیں چھیڑنا چاہتا جن کا ذکر یہاں مناسب نہیں ہے۔ تمھاری ماں کے بعد سے بعض باتیں ایسی کی گئی ہیں جو ٹھیک نہیں ہیں۔ ہوسکتا ہے کبھی ان باتوں کے چھیڑنے کا وقت آ جائے، ہوسکتا ہے ہمارے اندازے سے پہلے ہی وہ وقت آ جائے۔ کاروبار میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کی مجھ کو خبر نہیں، ہوسکتا ہے وہ مجھ سے چھپا کر کی گئی ہوں۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ وہ مجھ سے چھپا ہی کر کی گئی ہیں۔ اب میں اتنا کام کرنے کے قابل نہیں رہا، میرا حافظہ جواب دیتا جا رہا ہے، اب میں اتنی ساری باتوں پر نظر نہیں رکھ پاتا۔ ایک تو یہ بڑھاپے کی لعنت ہے، اور دوسرے یہ کہ ماں کی موت نے تمھیں اتنا صدمہ نہیں پہنچایا ہے جتنا مجھے پہنچایا ہے۔ لیکن چونکہ بات اس کی ہو رہی ہے، اس خط کی، اس لیے جارج میں تم سے درخواست کرتا ہوں، مجھے دھوکا مت دو۔ یہ بہت چھوٹا معاملہ ہے، یہ کوئی قابلِ ذکر معاملہ نہیں ہے، اس لیے مجھے دھوکا مت دو۔ کیا واقعی سینٹ پیٹرسبرگ میں تمھارا یہ دوست ہے؟''

جارج سراسیمہ ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''میرے دوستوں کی پروا نہ کیجیے۔ ایک ہزار دوست مل کر بھی میرے باپ کی جگہ نہیں لے سکتے۔ آپ جانتے ہیں میرا کیا خیال ہے؟ آپ اپنا زیادہ خیال نہیں رکھتے لیکن بڑھاپے کا خیال کرنا چاہیے۔ آپ کے بغیر مجھ سے کاروبار نہیں چل سکتا، یہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں، لیکن اگر کاروبار

Scanned with CamScanner

سے آپ کی صحت پر بُرا اثر پڑنے لگے تو میں کل اسے ہمیشہ کے لیے بند کر دینے کو تیار ہوں۔ اور اس سے کام نہیں چلے گا۔ ہمیں آپ کی زندگی کا انداز بدلنا ہوگا۔ آپ یہاں اندھیرے میں بیٹھے رہتے ہیں، لیکن دیوان خانے میں آپ کو کافی روشنی ملے گی۔ آپ اپنی قوت بحال رکھنے کے بجائے ناشتے کو ہاتھ لگا کر چھوڑ دیتے ہیں۔ آپ کھڑکی بند کر کے بیٹھتے ہیں حالانکہ ہوا آپ کے لیے بہت مفید رہے گی۔ نہیں ابا! میں ڈاکٹر کو لاؤں گا اور ہم اس کی ہدایتوں پر عمل کریں گے۔ آپ کا کمرہ بدلا جائے گا۔ آپ سامنے والے کمرے میں رہ سکتے ہیں، یہاں میں آ جاؤں گا۔ آپ کو اس تبدیلی کا پتا بھی نہیں چلے گا۔ آپ کی ساری چیزیں آپ کے ساتھ وہیں پہنچا دی جائیں گی۔ لیکن یہ سب بعد میں ہوتا رہے گا، ابھی تو میں آپ کو تھوڑی دیر کے لیے بستر میں لٹاتا ہوں۔ مجھے یقین ہے آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ آیئے میں آپ کے کپڑے اُتروا دوں۔ آپ دیکھیے گا میں یہ سب کر سکتا ہوں۔ یا اگر آپ اسی وقت آگے والے کمرے میں جانا چاہیں تو فی الحال میرے ہی بستر پر لیٹ رہیے۔ یہ سب سے اچھا رہے گا۔"

جارج کے باپ کا سفید جھبڑے بالوں والا سر اُس کے سینے پر ڈھلک آیا تھا۔ جارج اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

"جارج،" اس کے باپ نے جنبش کیے بغیر دھیمی آواز میں کہا۔

جارج فوراً اپنے باپ کے سامنے دوزانو ہو گیا۔ اسے بوڑھے کے مضمحل چہرے پر بڑی بڑی پھیلی ہوئی پتلیاں دکھائی دیں جو آنکھوں کے کونوں سے اس کو گھور رہی تھیں۔

"سینٹ پیٹرسبرگ میں تمھارا کوئی دوست نہیں ہے۔ تم ہمیشہ کے دغاباز ہو اور تم میرے ساتھ بھی دغا کرنے سے نہیں چوکے۔ وہاں تمھارا کوئی دوست کیونکر ہو سکتا ہے؟ میں اسے مان ہی نہیں سکتا۔"

"ذرا یاد کیجیے، ابا!" جارج اپنے باپ کو کرسی سے اٹھا کر اس کا ڈریسنگ گاؤن اتارنے لگا۔ اس کا باپ بدقت کھڑا ہو پا رہا تھا۔ "آخری بار جب میرا دوست ہم لوگوں سے ملنے آیا تھا اسے تین برس ہونے کو ہیں۔ مجھے یاد ہے آپ اسے زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔ کم سے کم دو مرتبہ میں نے آپ کی نظر اس پر نہیں پڑنے دی تھی حالانکہ درحقیقت وہ میرے کمرے میں میرے ہی پاس بیٹھا ہوا تھا۔

میں بخوبی سمجھ سکتا تھا کہ آپ اسے کیوں پسند نہیں کرتے، میرے دوست کی اپنی کچھ ادائیں ہیں۔ لیکن پھر آپ کی اس سے خوب نبھنے لگی تھی۔ مجھے بڑا فخر محسوس ہوتا تھا، اس لیے کہ آپ اس کی باتیں سنتے، اس سے اتفاق رائے کرتے اور سوالات پوچھتے تھے۔ اگر آپ ذہن پر زور دیں تو آپ کو ضرور یاد آ جائے۔ وہ ہمیں انقلاب روس کے نہایت نا قابل یقین واقعات سنایا کرتا تھا، مثلاً جب وہ خیوا کا تجارتی دورہ کر رہا تھا اور ایک بلوے میں پھنس گیا تھا اور اس نے ایک بالکنی پر ایک پادری کو دیکھا تھا جس نے اپنی ہتھیلی کو کاٹ کر اس پر خون سے صلیب کا نشان بنا دیا تھا اور وہ سا ہاتھ بلند کر کے مجمعے کو سمجھا رہا تھا۔ آپ تو خود اس وقت سے ایک دو بار یہ قصہ سنا چکے ہیں۔''

اس اثنا میں جارج اپنے باپ کو پھر بٹھا دینے اور اس کا اونی پتلون جو وہ لنن کے زیر جامے پر پہنے تھا اور اس کی جرابیں اتارنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ زیر جامہ کچھ صاف نہیں تھا اور اسے دیکھ کر جارج اپنی بے پروائی پر خود کو ملامت کیے بغیر نہیں رہ سکا۔ یقیناً یہ دیکھنا اس کا کام ہونا چاہیے تھا کہ اس کا باپ صاف زیر جامے بدلتا ہے یا نہیں۔ اس نے ابھی تک اپنی ہونے والی دلہن سے اس سلسلے میں کوئی واضح گفتگو نہیں کی تھی کہ مستقبل میں اس کے باپ کے لیے کیا بندوبست کیا جائے گا، اس لیے کہ دونوں نے خاموشی کے ساتھ اپنی اپنی جگہ پر اس بات کو طے شدہ سمجھ لیا تھا کہ بڈھا پرانے مکان میں اسی طرح اکیلا رہا کرے گا۔ لیکن اب اس نے فوری اور حتمی فیصلہ کر لیا کہ باپ کو اپنے مستقبل کے مکان میں رکھے گا، بلکہ قریب سے دیکھنے پر تو ایسا لگنے لگا کہ وہاں اپنے باپ کی جس خیال داری کا اس نے ارادہ کیا تھا اس کا وقت آتے تک بہت دیر ہو چکی ہو گی۔

وہ اپنے باپ کو ہاتھوں پر اٹھا کر بستر تک لے گیا۔ یہ دیکھ کر اس کو دہشت سی محسوس ہوئی کہ جب وہ پلنگ کی طرف بڑھ رہا تھا تو بڈھا اس کے سینے سے لگا ہوا اس کی گھڑی کی زنجیر سے کھیل رہا تھا، بلکہ وہ زنجیر سے اس بُری طرح چپک کے رہ گیا تھا کہ جارج کچھ دیر تک اسے بستر پر لٹا نہیں سکا۔

لیکن جوں ہی اسے بستر پر لٹا دیا گیا سب کچھ ٹھیک ٹھاک معلوم ہونے لگا۔ اس نے خود کو خوب ڈھانک لیا بلکہ کمبل اپنے کندھوں پر معمول سے زیادہ اوپر تک تان لیے۔ اس نے جارج کی طرف نظر اٹھائی جو بہت غیر دوستانہ نہیں تھی۔

''آپ کو میرا دوست یاد آ چلا ہے، ہے نا؟'' جارج نے سر کی جنبش سے اُسے بڑھاوا دیتے

Scanned with CamScanner

ہوئے کہا۔

"میں اچھی طرح ڈھک گیا ہوں؟" اس کے باپ نے یوں پوچھا جیسے وہ دیکھ نہ پا رہا ہو کہ اُس کے پیر کمبلوں میں ٹھیک سے لپٹے ہوئے ہیں یا نہیں۔

"بس ابھی آپ گرم ہوئے جاتے ہیں،" جارج نے کہا اور اس کو کمبل اچھی طرح اُڑھا دیے۔

"میں اچھی طرح ڈھک گیا ہوں؟" اس کے باپ نے ایک بار اور پوچھا۔ اسے اس بات کے جواب کی بڑی پریشانی معلوم ہو رہی تھی۔

"پریشان نہ ہوئیے، آپ اچھی طرح ڈھک گئے ہیں۔"

"نہیں!" اس کا باپ اس کی بات کاٹ کر دہاڑا، اس نے کمبل ایسی قوت سے ہٹائے کہ وہ چشم زدن میں اُڑ کر دور جا گرے، اور وہ اچانک پلنگ پر تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا صرف ایک ہاتھ سہارے کے لیے چھت کو یوں ہی سا چھو رہا تھا۔

"تم مجھ کو ڈھک دینا چاہتے تھے، میں جانتا ہوں میرے ننھے چھوکرے، مگر ابھی میں ڈھانکے جانے کا نہیں۔ اور یہ میرے بدن کا آخری زور سہی لیکن یہ تمھارے لیے بہت ہے، تمھارے لیے بہت زیادہ ہے۔ بے شک میں تمھارے دوست سے واقف ہوں۔ وہ تو میرا دل پسند بیٹا ہوتا، تم اسی لیے تو اس کے ساتھ اتنے دن ڈھونگ رچاتے رہے ہو، اور نہیں تو کس لیے؟ تم سمجھتے ہو میں اس کے لیے کڑھتا نہیں رہا؟ اور اسی لیے تو تم کو اپنے دفتر میں بند ہو کر بیٹھنا پڑتا تھا۔ صاحب کام کر رہے ہیں، ان کا ہرج نہ ہونے پائے۔ اسی لیے نا کہ تم اپنے ننھے منے جھوٹے خط روس بھیج سکو۔ مگر شکر ہے کہ کسی باپ کو کہیں یہ سیکھنے نہیں جانا پڑتا ہے کہ اپنے بیٹے کو کیونکر تاڑا جائے۔ اور اب جب تم کو یقین ہو گیا کہ تم نے اُسے پچھاڑ دیا ہے، کہ تم اس کے اوپر لد کر بیٹھ سکتے ہو اور وہ اُمس بھی نہ سکے گا، تب میرا بھولا بیٹا شادی کرنے کی ٹھانتا ہے۔"

جارج اپنے باپ کے حاضر کیے ہوئے اس عفریت کو مبہوت دیکھتا رہ گیا۔ اس کا دوست، جس سے اس کا باپ اچانک اتنی اچھی طرح واقف نکل آیا تھا، اب اس کے تصور میں اس طرح ابھرا جس طرح پہلے کبھی نہیں ابھرا تھا۔ وہ اس کو روس کی پہنائیوں میں کھویا ہوا دکھائی دیا۔ وہ اس کو ایک تاراج کیے ہوئے خالی گودام کے دروازے پر دکھائی دیا۔ اپنے شوکیسوں کے ملبے، اپنے مال کے پرخچوں،

گرتی ہوئی دیوار گیریوں کے درمیان وہ کھڑا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ آخر اسے اتنی دور کیوں جانا پڑ گیا!

''اِدھر آؤ میرے پاس!'' اس کا باپ چلایا اور جارج ایک دم سے چونک کر بستر کی طرف لپکا۔ وہ ہر بات کے لیے تیار تھا، تاہم وہ بیچ ہی میں رک گیا۔

''چونکہ اُس نے اپنا اسکرٹ اوپر اٹھا دیا،'' اس کے باپ نے گنگناتی ہوئی آواز میں بولنا شروع کیا۔ ''چونکہ اُس نے اپنا اسکرٹ اٹھا دیا، ایسے، اُس فاحشہ نے۔'' اور اس کی نقل اتارتے ہوئے اس نے اپنی قمیص اتنی اوپر اٹھالی کہ اس کی جانگھ کا وہ زخم دکھائی دینے لگا جو اسے جنگ میں آیا تھا۔ ''چونکہ اس نے اپنا اسکرٹ اٹھا دیا، ایسے، اور ایسے، اس لیے تم اس سے عشق بگھارنے لگے، اور اس کے ساتھ بے کھٹکے کھل کھیلنے کے لیے تم نے اپنی ماں کا نام بدنام کیا ہے، اپنے دوست کو دغا دی ہے اور اپنے باپ کو بستر سے لگا دیا ہے تا کہ وہ ہل نہ سکے۔ لیکن وہ ہل سکتا ہے، یا نہیں؟''

اور وہ کسی ٹیک کے بغیر کھڑا ہو گیا اور اپنی ٹانگیں جھٹکنے لگا۔ اپنی ہوش مندی پر اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

جارج جہاں تک ممکن ہو سکا اپنے باپ سے دور ایک گوشے میں سکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ مدتوں پہلے سے وہ تہیہ کیے ہوئے تھا کہ اپنے باپ کی ہر حرکت پر پوری نظر رکھے گا تا کہ کوئی اچانک حملہ، پیچھے یا اوپر سے کوئی جھپٹا اس کو بدحواس نہ کر دے۔ اس وقت اس کو اپنا یہ کب کا بھولا ہوا فیصلہ یاد آیا اور وہ پھر اسے بھول گیا، جیسے کوئی سوئی کے ناکے میں ذرا سا دھاگا ڈال کر کھینچ لے۔

''لیکن بہر حال تمھارے دوست کے ساتھ دغا نہیں ہوئی ہے،'' اس کا باپ انگلی نچا نچا کر اپنی بات پر زور دیتے ہوئے چیخا۔ ''میں یہاں، اِس جگہ اُس کی نمائندگی کرتا رہا ہوں۔''

''ناٹکیے کہیں کے!'' جارج پلٹ کر کہے بغیر نہ رہ سکا۔ پھر فوراً ہی اُسے اپنی بات کی مضرت کا احساس ہوا، اس کی آنکھیں باہر نکل پڑیں، اس نے دانتوں تلے زبان دبالی، مگر بعد از وقت، یہاں تک کہ تکلیف کی شدت سے اس کے گھٹنے جواب دے گئے۔

''ہاں، بالکل بالکل، میں ناٹک تو کرتا ہی رہا ہوں، ناٹک! اچھی بات کہی! اس کے سوا ایک بیچارے بوڑھے رنڈوے کی تسلی کا سامان ہی کیا رہ گیا تھا؟ یہ تو بتاؤ۔ اور جواب دیتے وقت اس کا

Scanned with CamScanner

خیال رکھنا کہ تم بہر حال میرے اکلوتے بیٹے ہو — یہ تو بتاؤ کہ میرا ایسا آدمی جو پچھواڑے کے کمرے میں پڑا رہتا ہو، اپنے بے ایمان نوکروں کے ہاتھوں عاجز ہو اور بڑھاپا اس کی ہڈیوں کے گودے تک اُتر چکا ہو، اس کے لیے اس کے سوا اور رہ کیا گیا تھا؟ اور میرا بیٹا دنیا بھر میں اینڈتا پھر رہا ہے، جو سودے میں نے اس کے لیے کیے تھے ان کو چکاتا پھر رہا ہے، کامیابی کی خوشی سے پھولا نہیں سماتا ہے، اور ایک معزز تاجر کا سا سنجیدہ چہرہ بنائے باپ کے سامنے سے ٹل جاتا ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو میں تم سے محبت کر ہی نہیں سکتا تھا، میں، جس کی طرف سے تم نے پیٹھ پھرا لی؟''

اب وہ آگے کی طرف جھکے گا، جارج نے سوچا۔ اگر وہ گر پڑا اور چوٹ کھا گیا تو؟ یہ الفاظ اس کے دماغ میں پھپھکارتے ہوئے گذرے۔

اس کا باپ آگے کی طرف جھکا، لیکن گرا نہیں۔ چونکہ، جیسا کہ اس کا خیال تھا، جارج اس کے نزدیک نہیں آیا، اس لیے وہ پھر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

''جہاں ہو وہیں رہو۔ مجھے تمھاری ضرورت نہیں! تم سمجھتے ہو کہ تم میں یہاں تک آنے کی طاقت ہے اور تم اپنی خوشی سے مجھ سے الگ کھڑے ہو۔ اس پر نہ بھولنا۔ ہم دونوں میں اب بھی میرا کس بل کہیں زیادہ ہے۔ خود اپنی ذات سے تو شاید میں پست ہو چکا ہوتا لیکن تمھاری ماں نے مجھے اپنی قوت اتنی دے دی ہے کہ میں نے تمھارے دوست سے بخوبی تعلقات بڑھا لیے ہیں، اور تمھارے گاہک یہ میری جیب میں رکھے ہوئے ہیں!''

''اس نے اپنی قمیص میں بھی جیبیں لگوا رکھی ہیں!'' جارج نے اپنے آپ سے کہا اور سمجھ لیا کہ یہ بات کہہ کر وہ اس کو دنیا بھر کی نظروں میں ایک کڈھب آدمی بنا دے گا۔ یہ خیال اسے بس دم بھر کے لیے آیا اس لیے کہ وہ سب کچھ بھولتا جا رہا تھا۔

''ذرا اپنی دلہن کو بانہوں میں لے کر میرے راستے میں آ کے تو دیکھو! میں اس کو تمھاری گود سے گھسیٹ لوں گا، تم سمجھ بھی نہیں سکتے کس طرح!''

جارج نے بے اعتباری سے منھ بنایا۔ اس کا باپ اپنے الفاظ کی صداقت پر زور دینے کے لیے اس کی سمت سر کو جنبش دے کر رہ گیا۔

''کتنا مزہ آیا ہے مجھے جب تم مجھ سے اپنے دوست کی منگنی کی خبر دینے کی اجازت طلب

Scanned with CamScanner

کرنے آئے ہو۔ اسے پہلے ہی سے سب معلوم ہے، احمق لونڈے، اسے سب معلوم ہے! میں اس کو خط لکھتا رہا ہوں، کیونکہ تم لکھنے کا سامان میرے پاس سے ہٹانا بھول گئے تھے۔ اسی لیے تو وہ برسوں سے یہاں آیا نہیں۔ خود تم کو جو کچھ معلوم ہے وہ سب اس کو سو گنا اچھی طرح معلوم ہے۔ بائیں ہاتھ میں وہ تمھارے خط کو کھولے بغیر مسلتا مروڑتا رہتا ہے اور داہنے ہاتھ میں میرا خط لیے اسے غور سے پڑھتا ہے۔''

جوش میں آکر وہ سر کے اوپر اپنے ہاتھ لہرانے لگا۔

''وہ سب کچھ ہزار گنا اچھی طرح جانتا ہے،'' اس نے چلا کر کہا۔

''دس ہزار گنا!'' جارج نے اپنے باپ کا مذاق اڑانے کے لیے کہا۔ لیکن ابھی یہ الفاظ اس کے منھ ہی میں تھے کہ ان کے اندر بلا کی سنجیدگی پیدا ہوگئی۔

''میں تو برسوں سے انتظار کر رہا ہوں کہ تم ایسا کوئی سوال لے کر میرے پاس آؤ، کیا تم سمجھتے ہو کہ مجھے دنیا میں اس کے سوا کوئی اور بھی کام ہے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اخبار پڑھا کرتا ہوں؟ یہ دیکھو!'' اور اس نے جارج کی طرف ایک اخبار پھینک دیا جو معلوم نہیں کس طرح اس کے بستر میں آ گیا تھا۔ یہ ایک پرانا اخبار تھا جس کا آج تک جارج نے نام بھی نہیں سنا تھا۔

''تم نے بڑے ہونے میں کتنا وقت لگا دیا۔ تمھاری ماں اسی حسرت میں مر گئی۔ اس کو یہ خوشی کا دن دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ روس میں تمھارے دوست کی مٹی پلید ہو رہی ہے۔ تین برس پہلے ہی وہ پیلا پڑ کے پھینک دینے کے قابل ہو گیا تھا، اور رہ گیا میں، تو تم دیکھ ہی رہے ہو کہ کس حال میں ہوں۔ آخر تمھارے بھی تو آنکھیں ہیں۔''

''تو آپ میری تاک میں تھے!'' جارج چلایا۔

اس کا باپ افسوس کے لہجے میں بول اٹھا:

''میں سمجھتا ہوں یہ بات تم پہلے ہی کہہ دینا چاہتے تھے۔ لیکن اب اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔'' پھر ذرا بلند آواز سے بولا، ''تو اب تم کو معلوم ہو گیا کہ دنیا میں تمھارے علاوہ اور کیا کیا ہے؟ ابھی تک تم کو صرف اپنی ہی خبر ر[illegible] ہے۔ ایک بھولا بھالا بچہ، ہاں، ایسے ہی تھے تم، سچی بات ہے، لیکن اس سے بھی زیادہ سچی بات یہ ہے کہ تم ایک شیطان صفت انسان بن کر رہ گئے ہو! تو پھر سن لو، اب میں

تم کو موت کی سزا سناتا ہوں، موت بذریعہ غرقابی!''

جارج کو محسوس ہوا جیسے اسے کمرے سے باہر دھکیل دیا گیا ہے۔ دھماکے کی وہ آواز جس کے ساتھ اس کا باپ اس کے پیچھے پلنگ پر گرا تھا، بھاگنے میں بھی اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ زینے پر، جسے وہ کسی سیدھے نشیب کی طرح جھپٹتا ہوا طے کر رہا تھا، اس کی ٹکر اس ملازمہ سے ہو گئی جو اس کا کمرہ صاف کرنے کے لیے اوپر آ رہی تھی۔

''یسوع!'' وہ چلائی اور سینہ بند سے اپنا چہرہ چھپانے لگی، لیکن وہ جا بھی چکا تھا۔

وہ پھاٹک سے نکلا، پانی کی طرف کھنچتا ہوا، سڑک پر آیا۔ اب وہ جنگلے کو یوں جکڑے ہوئے تھا جیسے کوئی فاقوں کا مارا ہوا آدمی غذا کو دبوچ لیتا ہے۔ وہ ایک جھکولا لے کر جنگلہ پار کر گیا۔ نوجوانی کے زمانے میں وہ جمناسٹک کا مانا ہوا ماہر تھا اور اس کے ماں باپ کو اس پر فخر تھا۔ ابھی اس کی کمزور پڑتی ہوئی گرفت برقرار تھی کہ اسے جنگلوں کے درمیان ایک بس آتی دکھائی دی جو اس کے گرنے کے جھماکے کو آسانی سے چھپا سکتی تھی... اس نے دھیمی آواز میں پکارا:

''اچھی اماں، اچھے ابا، اس پر بھی میں آپ سے ہمیشہ محبت کرتا رہا۔'' اور اس نے خود کو گرا دیا۔

اس وقت پل کے اوپر سے سواریوں کا کبھی ختم نہ ہونے والا سیلاب گذرتا چلا جا رہا تھا۔

Scanned with CamScanner

نیر مسعود کی کتابیں

عطر کافور

(کہانیاں)

قیمت: 80 روپے

طاؤس چمن کی مینا

(کہانیاں)

(دوسرا ایڈیشن زیر طبع)

گنجفہ

(کہانیاں)

قیمت: 200 روپے

انیس

(سوانح)

قیمت: 375 روپے

مرثیہ خوانی کا فن

(تنقید و تحقیق)

قیمت: 150 روپے

ایرانی کہانیاں

(ترجمے)

قیمت: 90 روپے

ادبستان

(مضامین)

قیمت: 120 روپے

منتخب مضامین

(تنقید و تحقیق)

(زیر طبع)

معرکۂ انیس و دبیر

(تنقید و تحقیق)

قیمت: 150 روپے

شفاء الدولہ کی سرگزشت

(تنقید و تحقیق)

(زیر طبع)

Scanned with CamScanner

آج کی کتابیں

کہانیاں

آئینۂ حیرت اور دوسری تحریریں	سید رفیق حسین	Rs.375
عطر کافور	نیر مسعود	Rs.80
طاؤس چمن کی مینا	نیر مسعود	(دستیاب نہیں)
سوار اور دوسرے افسانے	شمس الرحمٰن فاروقی	(دستیاب نہیں)
نربدا اور دوسری کہانیاں	اسد محمد خاں	Rs.180
لالٹین اور دوسری کہانیاں	محمد خالد اختر	(دستیاب نہیں)
خط مرموز	فہمیدہ ریاض	Rs.100
سوئی بھوک	حسن منظر	(دستیاب نہیں)
ایک اور آدمی	حسن منظر	Rs.85
عاقبت کا توشہ	نکہت حسن	Rs.85
دور کی آواز	فیروز مکرجی	Rs.150
صحرا کی شہزادی	سکینہ جلوانہ	Rs.120

کہانیوں کے ترجمے

ایرانی کہانیاں	انتخاب اور ترجمہ: نیر مسعود	Rs.90
عربی کہانیاں	ترتیب: اجمل کمال	Rs.180
ہندی کہانیاں (جلد1)	ترتیب: اجمل کمال	Rs.180
ہندی کہانیاں (جلد2)	ترتیب: اجمل کمال	Rs.180
ہندی کہانیاں (جلد3)	ترتیب: اجمل کمال	Rs.180

Scanned with CamScanner

کارل اور اینا	(منتخب ترجمے)	محمد سلیم الرحمٰن	Rs.80
گم شدہ خطوط	(منتخب ترجمے)	محمد عمر میمن	Rs.90
مہرِ سکوت	(منتخب ترجمے)	زینت حسام	Rs.120
کلی منجارو کی برفیں	(منتخب ترجمے)	محمد خالد اختر	Rs.120

انتخاب

منتخب تحریریں	گابرئیل گارسیا مارکیز	ترتیب: اجمل کمال	(زیرِ طبع)
منتخب تحریریں	نرمل ورما	ترتیب: اجمل کمال	Rs.280
منتخب کہانیاں	ویکوم محمد بشیر	ترتیب: مسعود الحق	Rs.180
پریم وانی	میرا بائی	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395
کبیر بانی	کبیر	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395

ناول

بیس سو گیارہ	محمد خالد اختر	Rs.70
گنگا جمنی میدان	اختر حامد خاں	Rs.120
دائرہ	محمد عاصم بٹ	Rs.100
نمبردار کا نیلا	سید محمد اشرف	Rs.60

ناولوں کے ترجمے

تمس	بھیشم ساہنی	ترجمہ: شہلا نقوی	Rs.180
قلبِ ظلمات	جوزف کونریڈ	ترجمہ: محمد سلیم الرحمٰن	Rs.80
بوفِ کور	صادق ہدایت	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.100
خیمہ	میرال طحاوی	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.75

Scanned with CamScanner

نوکر کی قمیض	ونود کمار شکل	ترجمہ: عامر انصاری، اجمل کمال	Rs.100
پہلی بارش	خولیو لیاما زاریس	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.95
سرزمین مصر میں جنگ	یوسف القعید	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.125
درخت نشیں	اتالو کلوینو	ترجمہ: راشد مفتی	Rs.175
شہزادہ احتجاب	ہوشنگ گلشیری	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.70

شاعری

پریم وانی	میرا بائی	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395
کبیر بانی	کبیر	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395
کلیات اختر الایمان	اختر الایمان	ترتیب: سلطانہ ایمان، بیدار بخت	Rs.350
مٹی کی کان	افضال احمد سید	(کلیات)	Rs.500
روکوکو اور دوسری دنیائیں	افضال احمد سید		Rs.50
آدمی کی زندگی	فہمیدہ ریاض		Rs.70
ساری نظمیں	ذی شان ساحل	(کلیات)	زیر طبع
جنگ کے دنوں میں	ذی شان ساحل		Rs.125
ای میل اور دوسری نظمیں	ذی شان ساحل		Rs.150
نیم تاریک محبت	ذی شان ساحل		Rs.100
رات	سعید الدین		Rs.50
سائے چراغ کے	احمد عظیم		Rs.150
مٹی کا مضمون	فرخ یار		Rs.150
سویرے کا سیاہ دودھ	پاؤل سیلان	ترجمہ: آفتاب حسین	Rs.150
بارہ ہندوستانی شاعر	(انتخاب)	ترتیب: اجمل کمال	زیر طبع
خودکشی کے موسم میں	زاہد امروز		Rs.120

Scanned with CamScanner

نیر مسعود اردو کے موجودہ فکشن نگاروں میں تو ایک ممتاز مقام رکھتے ہی ہیں، لیکن ان کی ادبی شخصیت کے دیگر پہلو بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتے۔ ان کی تحریر کردہ میر انیس کی سوانح انیس سوانح نگاری کے میدان میں ایک مسلمہ کارنامے کی حیثیت رکھتی ہے۔ سوانحی ادب کے اس شاہکار سے ضمنی طور پر وجود میں آنے والی دو کتابیں مرثیہ خوانی کا فن اور معرکۂ انیس و دبیر بجائے خود اپنے اپنے موضوع پر اہم اضافے ہیں۔ اس بار آج کے اس گوشے میں نیر مسعود کے مضامین کا ایک انتخاب اس یقین کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے کہ اس سے ان کے ادبی کام کے ایک اور اہم حصے کی جانب توجہ مرکوز کی جا سکے گی۔ یہ مضامین، جن میں اردو کے قابلِ ذکر ادیبوں کی شخصیتوں اور ان کی تخلیقات کے اہم، نمایاں یا نظروں سے اوجھل پہلوؤں پر اظہار خیال کیا گیا ہے، اس اعتبار سے منفرد حیثیت رکھتے ہیں کہ انھیں پڑھ کر مذکورہ ادیبوں اور ان کی تحریروں کو پڑھنے، یا دوبارہ پڑھنے کا شوق بیدار ہو جاتا ہے۔ تنقیدی مضامین کا یہ بنیادی مقصد ہے جسے بدقسمتی سے اردو تنقید عموماً نظرانداز کرتی چلی آئی ہے۔ اردو تنقید کے غالب رجحان کے برعکس نیر مسعود کے مضامین میں متن کو پس پشت ڈال کر اپنے پہلے سے متعین نقطۂ نظر کو نافذ کرنے کا انداز قطعی نہیں پایا جاتا، بلکہ متن کو دلچسپی، غور اور مناسب تحقیقی توجہ سے پڑھ کر اس مطالعے کی روشنی میں اپنا نقطۂ نظر مرتب کرنے کا اسلوب ملتا ہے۔ ان مضامین کو پڑھ کر رفتہ رفتہ اس نقطۂ نظر کی وسعت اور اس میں موجود ادبی، تاریخی اور معاشرتی تناظر کی وقعت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ نیر مسعود کے مضامین کا ایک انتخاب کتاب کی صورت میں بھی جلد شائع کیا جائے گا۔

Scanned with CamScanner

میر کا مسکن اور مدفن

بیسویں صدی کے نصف اول تک لکھنؤ کے سٹی ریلوے اسٹیشن کے قریب بنی ہوئی قبروں میں سے ایک کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ یہ میر کی قبر ہے۔ لیکن کوئی دستاویزی ثبوت یا قبر پر کتبہ موجود نہ ہونے کی وجہ سے اس کو حتمی طور پر میر سے منسوب نہیں کیا جا سکتا تھا۔ قبروں کے اس قطعے میں اس قبر کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ بعض لوگ کسی کسی دن اس پر روشنی کرتے اور مرادیں مانگتے تھے۔

یہ صورت حال دیکھ کر سید مسعود حسن رضوی ادیب کو اندیشہ ہوا کہ کہیں ہوتے ہوتے یہ میر کی تربت کے بجائے کسی پیر کا مزار نہ ہو جائے۔ اس لیے انھوں نے اس قبر پر جشنِ میر تقی میر قسم کی ایک تقریب کرنے کا منصوبہ بنایا۔ ادیب نے اس سلسلے میں قبر پر میر کے نام کا کتبہ لگانے اور چھوٹی سی یادگاری عمارت بنانے کی بھی تحریک کی تھی تاکہ یہ قبر بلا شرکتِ غیرے میر کی قرار پا جائے۔ ادیب نے تقریب کی تفصیلات بھی طے کر لی تھیں جن کے مطابق میر پر مقالہ خوانیوں کے علاوہ ایک بزمِ سخن کا انعقاد بھی ہونا تھا۔ ادیب اس حسنِ اتفاق پر بھی بہت خوش تھے کہ تقریب کے دعوت نامے اور اخباری اشتہاروں کے سرنامے پر دینے اور کپڑے پر لکھ کر تقریب گاہ میں لگانے کے لیے ان کو میر کے یہ برمحل شعر مل گئے تھے:

تربتِ میر پر ہیں اہلِ سخن　　ہر طرف حرف ہے، حکایت ہے
تو بھی تقریبِ فاتحہ سے چل　　بہ خدا واجب الزیارت ہے

لیکن یہ منصوبہ بننے اور اس پر عمل درآمد کی نوبت آنے کے درمیان خاصا وقفہ پڑ گیا اور اس عرصے میں ادیب کا اس قبر پر جانا بھی نہیں ہوا۔ آخر ایک دن جب وہ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ قبر اور اس کے اس پاس کی زمین خوب صاف کر دی گئی ہے، قبر پر چادر چڑھی ہوئی ہے، چراغ جل رہا ہے، اگر بتیاں سلگ رہی ہیں

اور ایک سبز پوش مجاور بھی موجود ہیں۔ مجاور نے بتایا کہ یہ شاہ جشن کا مزار ہے، اور یہ کہ شاہ جشن نے خود ان کے خواب میں تشریف لا کر اپنے مزار کا یہ پتا بتایا اور ان کو اس کی مجاوری کی ہدایت کی ہے۔

اس طرح ادیب کا اندیشہ صحیح ثابت ہوا۔ کچھ عرصے بعد ان مجاور کی وفات ہو گئی اور مزار کی دیکھ بھال ان کی سن رسیدہ اہلیہ کرنے لگیں۔ اسی زمانے میں ادیب ڈاکٹر عبادت بریلوی کو یہ مزار دکھانے لے گئے تھے۔ ڈاکٹر عبادت بتاتے ہیں کہ انھیں سٹی اسٹیشن کے قریب

> ریل کے پاس۔۔۔ بائیں جانب اوپر کی طرف کچھ قبریں نظر آئیں۔ ایک قبر زیادہ نمایاں تھی اور اس پر چادر چڑھی ہوئی تھی۔ وہاں ایک بوڑھی عورت ملی۔ مسعود صاحب نے اس عورت سے پوچھا، بڑی بی، یہ کس کا مزار ہے؟ اس نے کہا، یہ شاہ جشن کا مزار ہے۔ میرے میاں کو فیض آباد میں یہ بشارت ہوئی تھی کہ اس جگہ جاؤ اور شاہ جشن کے مزار پر حاضری دو۔ کئی سال ہوئے ہم یہاں آ گئے۔ میرے شوہر کا تو انتقال ہو چکا ہے۔ اب میں اس مزار کی دیکھ بھال کرتی ہوں۔ اسی سے گذر بسر ہو جاتی ہے۔ یہ سن کر مسعود صاحب میری طرف مخاطب ہوئے اور کہا، یہ میر تقی میر کا مزار ہے۔ بچپن میں آج سے تقریباً چالیس سال قبل مجھے اس کا علم ہوا تھا اور بزرگوں نے باوثوق ذرائع سے مجھے بتایا تھا کہ یہی میر صاحب کا مزار ہے۔ (مضمون ''پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب'')

❁

1927 کے قریب میر انیس کے پوتے دولھا صاحب عروج نے اپنی کتاب عروج اردو میں میر کی قبر کے متعلق لکھا تھا:

> بیان کیا جاتا ہے کہ ان مرحوم کی قبر آغا میر کی ڈیوڑھی والے [لکھنؤ سٹی] اسٹیشن کے پہلو میں رفاہِ عام [کلب] کی عمارت کے سامنے قبرستان میں ہنوز موجود ہے۔

اس بیان پر دولھا صاحب نے یہ حاشیہ دیا ہے:

> میں نے میر مرحوم کی قبر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، بلکہ جو اُن کی قبر بتائی جاتی ہے اس پر پنج شنبے کو چراغ روشن ہوتا ہے اور پھول چڑھائے جاتے ہیں، اور یہ واقعہ بھی میرا دیکھا ہوا ہے۔ اکثر پنج شنبے کو میرا اس راہ سے گذرنے کا اتفاق ہوا ہے اور میں نے ان کی قبر پر

Scanned with CamScanner

روشنی دیکھی۔ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ اس قبر پر جاروب کشی کرنے سے ہماری مراد بر آتی ہے۔ حقیقت میں یہ میر کی قبر ہے یا نہیں، اس کے متلق سوائے شنیدہ ہونے کے کوئی ثبوت نہیں [پیش] کر سکتا، نہ یہ بتا سکتا ہوں کہ روشنی کرنے والے کون ہیں۔'' (عروج اردو، مخطوطہ ذخیرہ ادیب)

عروج اردو سے بیس بائیس سال پہلے سید مہدی حسن احسن لکھنوی نے اپنی کتاب واقعاتِ انیس (تصنیف 1905 تا 1908) میں لکھا:

ایک مرتبہ دل میں خیال آیا کہ میر تقی میر مرحوم کی قبر دریافت کرنا چاہیے۔ پرانے بزرگوں سے معلوم ہوا کہ میر صاحب کی قبر بھیم کے اکھاڑے میں ہے۔ ۔ ۔ وہاں تک پہنچا، مگر مجبور تھا کہ [میر کی قبر کو] کس سے دریافت کروں۔ اول تو شہر کا غیر آباد حصہ جہاں انسان کا گذر بھی اتفاق سے ہو جاتا تھا، اور اگر کوئی شخص ملا بھی تو میرے سوال کا جواب نہ دے سکا۔ بے نیلِ مقصود واپس ہوا۔ کئی سال بعد اتفاقیہ اس طرف گذر ہوا۔ شام کا جھٹ پٹا وقت تھا، تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ میں گاڑی پر سوار تھا۔ داہنے بائیں دونوں جانب بیہڑ میدان اور چند کھیتوں کے سوا کچھ نہ معلوم ہوتا تھا۔ داہنی جانب کی بلندی پر جہاں اس قبرستان کا ایک حصہ باقی ہے، کسی انسان کی پرچھائیں سی معلوم ہوئی۔ مجھ شوریدہ مزاج کو ایسے مقاموں سے دلچسپی ہے۔ گاڑی روک لی۔ اتر پڑا اور ایک ناہموار بلندی کا راستہ طے کر کے ایک قبر کے سرہانے پہنچا تو ایک نیک بخت ضعیفہ کو اس قبر پر جھکے ہوے اور حصولِ مدعا کے لیے دعاؤں میں مصروف پایا۔ سناٹے کے عالم میں ایک پیر زال کا قبرستان میں گذر حیرتناک واقعہ خیال کر کے بدن کے روئیں کھڑے ہو گئے مگر ساتھ ہی یہ بھی یقین ہو گیا کہ آج وہ رازِ سربستہ کھلا جاتا ہے۔ دل کڑا کر کے اس ضعیفہ سے سوال کیا کہ اس سناٹے کے وقت تم اس قبرستان میں کیا کر رہی ہو اور یہ قبر کس کی ہے جس پر تم جھکی ہوئی ہو۔ وہ بے چاری سہم گئی اور کچھ جواب نہ دیا، مگر خدا میرے اس گناہ کو بخشے کہ میں نے بے ضابطہ دھمکیاں دے کر حال دریافت کیا۔ اس بے چاری غریب عورت نے جواب دیا کہ یہ قبر میرے ایک مورثِ اعلیٰ کی ہے اور وہ ایک درویش صفت سید تھے۔ میرا

Scanned with CamScanner

باپ جب کسی مصیبت میں گرفتار ہوتا تھا تو اس صاحب قبر سے استدعا کرتا تھا۔ اسی طریق کے موافق میں بھی اپنی مشکلوں میں اکثر اس صاحب قبر سے امداد طلب کرتی ہوں۔ میں نے پوچھا ان کا نام کیا ہے۔ اس نے کہا نام میں نہیں جانتی مگر اتنا جانتی ہوں کہ اگلے زمانے میں ایک مشہور شاعر تھے ... کیا خوشی کی بات تھی۔ مجھ پر ایک عالم وجد طاری تھا اور اس بے خودی میں بہ کمال عقیدت سر قبر پر فاتحہ کو جھکا۔ عورت نے اپنا راستہ پکڑا۔ گاڑی والا چلا چلا کر پکار رہا تھا۔ اس کریہہ آواز سے ہشیار ہوا تو موقع نکل گیا تھا۔ میں نے تو اپنے دل سے اس مزار کو میر مرحوم کا مزارِ مقدس طے کر لیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (ص 6 ببعد، حاشیہ)

ان بیانوں سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ لکھنؤ کے پرانے لوگ جانتے تھے کہ میر کی قبر بھیم کے اکھاڑے میں ہے، اور دوسری یہ کہ اس علاقے کی ایک قبر کے متعلق کہا جاتا تھا کہ یہ میر کی قبر ہے۔

لکھنؤ میں میر کی وفات کے ایک ہفتے بعد 27 شعبان 1225ھ (28 ستمبر 1810ء) کو میر محمد محسن المخاطب بہ زین الدین احمد نے دیوانِ میر کے ایک مخطوطے پر میر کے آخری مسکن، وفات، تدفین اور مدفن کے متعلق یہ یادداشت تحریر کی تھی:

> بہ روز جمعہ بیستم ماہ شعبان المکرّم وقت شام سنہ 1225 یک ہزار دو صد و بیست و پنج ہجری بود، میر محمد تقی صاحب میر تخلص، صاحبِ ایں دیوان چہارم، در شہر لکھنؤ در محلّہ سٹہٹی بعدِ طیِ نُہ عشرۂ عمر بہ جوارِ رحمت ایزدی پیوستند و بہ روز شنبہ بیست و یکم ماہِ مذکور سنہ الیہ وقتِ دو پہر در اکھاڑہ بھیم کہ قبرستان مشہور است، نزدیک قبور اقربائے خویش مدفون شدند۔ (عکس تحریر مشمولۂ دیوان میر مرتبۂ ڈاکٹر اکبر حیدری)

(ترجمہ: بہ روز جمعہ بیسویں شعبان المکرّم سنہ 1225 بارہ سو پچیس ہجری (21 ستمبر 1810ء) تھی، اس دیوان چہارم کے مصنف میر محمد تقی صاحب میر تخلص عمر کی نو دہائیاں طے کرنے کے بعد شہر لکھنؤ محلّہ سٹہٹی میں رحمت ایزدی سے جا ملے۔ اور بہ روز شنبہ اکیسویں ماہِ مذکورہ سنہ الیہ کو، دو پہر کے وقت بھیم کے اکھاڑے میں، جو مشہور قبرستان ہے، اپنے عزیزوں کی قبروں کے نزدیک

Scanned with CamScanner

مدفون ہوے۔)

گذشتہ بیانوں اور میر محمد محسن کی اس یادداشت کی روشنی میں یہ تین جگہیں ہماری توجہ کی مستحق ٹھہرتی ہیں:

1۔ محلہ سٹھٹی

2۔ بھیم کا اکھاڑا

3۔ قبرستان اکھاڑا بھیم

ان جگہوں کے متعلق مختلف ماخذوں سے حاصل ہونے والی معلومات حسبِ ذیل ہے:

سٹھٹی:

یہ نام غالباً ''سوت ہٹی'' (بہ معنی سوت کا بازار یا منڈی) کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اس کا تلفظ ''سوٹٹی''، ''سٹّی'' بھی تھا۔ یہ لکھنؤ کے شمال مشرقی علاقے کا بہت پرانا اور بڑے رقبے کا محلّہ تھا۔ اس کا پرانا نام ''سیدواڑہ'' بھی ملتا ہے۔ کتاب ثمرات الانظار فی مامضیٰ من الآثار میں ایک بزرگ سید محی الدین کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ ''سیدواڑہ لکھنؤ میں، کہ جس کو اب سٹھٹی کہتے ہیں، اقامت گزیں ہوے''، اور یہ کہ سید محی الدین عہدِ شاہی کے ایک بزرگ (مولانا تراب علی) کے استاد (سید محمد مخدوم) کے پردادا تھے۔ (ص 4) اتنے پرانے وقت کے بزرگ کے زمانے میں یہ محلّہ پہلے سے موجود تھا۔ اس سے اس کی قدامت ظاہر ہے۔

میر انیس بھی فیض آباد سے لکھنؤ آ کر سٹھٹی میں مقیم ہوے تھے۔ ان کے نواسے میر سید علی مانوس کا بیان ہے کہ یہ محلّہ دریاے گومتی کے کنارے تھا۔ (مضمون ''میر انیس، کچھ چشم دید حالات'')

زبدۃ العلما سید آغا مہدی لکھنوی کا بیان ہے کہ ''سوٹٹی'' پکّے پل اور لوہے والے پل کے درمیانی علاقے میں واقع تھا۔ وہ سید ظفر حسن عرف بابو صاحب فائق لکھنوی (فرزندِ میر علی محمد عارف) کے حوالے سے یہ بھی بتاتے ہیں کہ یہ محلّہ گومتی کے جنوبی کنارے کی جانب تھا اور ''بیلی گارد [رزیڈنسی] سے نزدیک جو پرانا تکیہ مسلمانوں کی قبروں کا تھا اس سے محلے کے حدودِ اربعہ میں ایک حد ملحق ہوتی تھی۔'' (تاریخ لکھنؤ، ص 47-346)

اودھ کی شاہی کے آخر زمانے تک سٹھٹی کی رونق اور آبادی بہت تھی۔ اس سرسبز علاقے میں مکانوں کی کثرت تھی جن میں رئیسوں اور شاہی خاندان والوں کی عالی شان کوٹھیاں اور حویلیاں بھی تھیں۔ (تاریخ لکھنو، ص 47-346)

1857 کی جنگ میں فتح کے بعد انگریزوں نے دہلی کی طرح لکھنؤ میں بھی بڑے پیمانے پر انہدامی کارروائیاں کیں۔ بے شمار مکان اور پورے پورے محلے کھود دیے گئے۔ سٹھٹی بھی ان کارروائیوں کی زد میں آ گیا، بلکہ ان کارروائیوں کے باقاعدہ منصوبہ بند آغاز سے پہلے جنگ کے اوائل ہی میں یہ علاقہ اُجڑنا شروع ہو گیا تھا جس کا سبب انگریزوں کے مرکز رزیڈنسی سے اس کا قرب تھا۔ سید کمال الدین حیدر بتاتے ہیں کہ میرٹھ اور دہلی سے جنگ کی تشویشناک خبریں پانے اور لکھنؤ میں بھی لڑائی کے آثار دیکھنے پر انگریزوں نے اپنے فوجی دستوں اور گاڑیوں وغیرہ کی آزادانہ نقل و حرکت کے لیے رزیڈنسی کے آس پاس جتنی کوٹھیاں تھیں سب کے گرد دھس باندھ کر مثل قلعہ مستحکم کیا اور ہر طرف توپیں نصب کیں اور دور تک جتنے مکانات سامنے کے تھے سب [کو] مسمار کر دیا اور درخت سامنے کے سب کٹوا دیے۔'' (قیصر التواریخ، ص 194)۔ یہ حالت دیکھ کر اس علاقے کے زیادہ تر رہنے والے شہر کے نسبتاً محفوظ علاقوں کی طرف کوچ کر گئے۔ اس کے بعد سٹھٹی کو پنپنا نصیب نہ ہوا۔ باقاعدہ جنگ شروع ہوئی تو انگریزوں نے یہاں کی اور بہت سی عمارتیں گرا کر سٹھٹی کو مزید اُجاڑ دیا۔ جنگ میں یہاں انگریزوں اور ہندوستانیوں میں سخت تصادم ہوئے۔ جنگ کے خاتمے اور لکھنؤ پر اپنا تسلط قائم کر لینے کے بعد فتح یاب انگریز حاکموں نے عمارتیں گرانے کے ماہروں کی فوج بلائی اور شہر کا بڑا حصہ کھود ڈالا۔ اس ابتلا کا حال لکھنؤ اور اطراف کے بہت سے شاعروں، مورخوں اور دوسرے مصنفوں نے لکھا ہے۔ عظمت علی کاکوروی بتاتے ہیں:

> پھر شہر کھدنے میں لگا تو زائد آدھے سے کھد گیا۔ امین آباد کے قریب سے نجف تک اور بیلی گارد سے لے کر رومی دروازے تک ایک کف دست میدان ہو گیا۔ (مرقع خسروی، ص 53 بعد)

سٹھٹی بیلی گارد اور رومی دروازے کے درمیان ہی آباد تھا۔ اسی بیان میں عظمت علی بتاتے ہیں:

Scanned with CamScanner

سارے کے سارے مکانات نشیب والے مسلّم توپ دیے گئے۔ ذی الحجہ 1274ھ (اگست 1858ء) تک اس طرف کا نصف شہر کھد کر خاک برابر ہو گیا۔

حکیم محمد کاظم لکھتے ہیں:

(ترجمہ:) شہر کے مشرق اور شمال کی جانب کم کوئی مکان ہوگا کہ باقی بچا ہو... [کئی محلوں کے نام] سٹھٹی... وغیرہ منہدم کر کے مٹی میں ملا دیے گئے۔ (سوانح عمری، ص 50-51)

اس طرح سٹھٹی اور اس کے گرد و نواح کا علاقہ بہ قولِ عظمت علی "ایک کف دست میدان ہو گیا" اور بہ قولِ احسن "ایک بیہڑ میدان کی حیثیت سے مدت تک پڑا رہا۔" (واقعاتِ انیس، ص 26)

اسی میدان میں کہیں پر کبھی وہ مکان بھی تھا جس میں ان واقعات سے کوئی نصف صدی پیشتر میر نے دم توڑا تھا۔ اگر یہ مکان نشیب میں تھا اور اس کو مسلّم توپ دیا گیا تھا تو یہ اب بھی زمین کے نیچے موجود ہو سکتا ہے۔

بھیم کا اکھاڑا اور قبرستان:

یہ علاقہ بھی سٹھٹی سے متصل تھا اور اس کا انجام بھی وہی ہوا جو سٹھٹی کا ہوا تھا۔ بھیم کے اکھاڑے سے دراصل دو مقام مراد ہوتے تھے۔ بھیم کا اکھاڑا بہت بڑا محلّہ تھا اور میر کے مدفن والا قبرستان، جیسا کہ محمد محسن کے بیان سے ظاہر ہے، اسی محلے میں پڑتا تھا۔ اسی محلے کے اندر وہ اصل بھیم کا اکھاڑا تھا جس کے نام سے پورا محلّہ موسوم ہوا (جس طرح شیش محل، لکھنؤ کی عمارت کے نام سے پورا محلّہ شیش محل موسوم ہوا)۔ قبرستان اسی محلے بھیم کے اکھاڑے میں اصل بھیم کے اکھاڑے سے متصل تھا، اسی لیے اس قبرستان کو بھیم کے اکھاڑے اور بھیم کے تکیے سے بھی موسوم کیا جاتا تھا۔ عظمت علی کاکوروی کا بیان ہے کہ 1857 کی جنگ میں ہندوستانیوں نے "بھیم کے اکھاڑے کے ٹیلے پر" توپیں لگائی تھیں۔ (مرقع خسروی، ص 503) اور کمال الدین حیدر بتاتے ہیں کہ اس جنگ میں ہندوستانیوں نے رزیڈنسی پر حملے کے لیے جو مورچے لگائے تھے، ان میں ایک مورچہ "بھیم کے تکیے" پر بھی لگایا تھا۔ (قیصر التواریخ، ص 218)

مہدی حسن احسن میر کی قبر کی تلاش کے سلسلے میں بھیم کے اکھاڑے اور قبرستان کے محل وقوع کا پتا اس طرح دیتے ہیں:

یہ محلہ عہد شاہی میں بہت مشہور تھا اور اب وہاں سوائے کھنڈروں کے اور کچھ نہیں ہے۔ آغا میر کی ڈیوڑھی سے بیلی گارد کے نیچے نیچے تک اسی محلے کا سلسلہ گیا ہے۔ راستے میں ایک بہت پرانا تکیہ ہے۔ جس کو سیتاپور کی جدید ریلوے لائن نے کاٹ کر قبروں کو متفرق و پاشاں کر دیا ہے۔ بیچ میں ایک سڑک گھوڑے گاڑی کے لیے ہے۔ اس کے اوپر پھٹتا ہے۔ جس پر سے ریل گذرتی ہے۔ تکیے کے کئی حصے ہو گئے ہیں۔ ایک ریلوے لائن کے بغل میں ہے، اور دوسرا اس کے مقابل، اور تیسرا مشرق کی جانب کسی قدر فاصلے پر واقع ہے۔ مگر قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقت میں یہ ایک ہی تکیہ ہوگا جس کو نئے جغرافیہ نے متفرق کر دیا۔ (واقعات انیس، ص 7)

عبدالحلیم شرر کے ناول طاہرہ میں بھی جو بہ قولِ شرر سچے واقعات پر مبنی ہے، اس قبرستان کا حوالہ ملتا ہے۔ طاہرہ اپنے چچا مولوی عزیز اللہ کے بارے میں بتاتی ہے کہ وہ

لوہے کے پل کو جاتے ہوئے تالاب کے قریب جو تکیہ ہے، اس کے پاس رہتے تھے۔ (ص 17)

اور آگے بڑھ کر بتاتی ہے کہ مولوی عزیز اللہ کی بیوی کو

رزیڈنسی کے احاطے اور تالاب کے درمیان جو تکیہ ہے اس میں دفن کیا گیا۔ (ص 60)

بابو صاحب فائق کے بیان (بہ سلسلۂ سبطی) میں رزیڈنسی کے قریب والے اس پرانے تکیے کا حوالہ آ چکا ہے۔ یہیں میر مستحسن خلیق کی بھی قبر ہے۔ اپنے ایک اور بیان میں فائق ان کے مدفن کا پتا اس طرح دیتے ہیں:

لکھنؤ میں لوہے کے پل اور ریل کے درمیان میں ایک قدیم قبرستان ہے، [خلیق] وہاں دفن ہوئے۔ (احوالِ مرثیہ گویاں، قلمی)

مولوی آغا مہدی کا بیان ہے:

لوہے کے پل کی واپسی میں جو ریل کا پہلا پل پڑتا ہے، پتلا، اس پل کے جانے میں کم و

بیش پچاس قدم جب رہ جائیں تو بائیں جانب وہ قبرستان ہے جس میں لکھنؤ کے چنیدہ لوگ، شرفا، ادبا دفن ہیں۔ میر خلیق اور ... میر تقی میر یہاں دفن ہیں ... اس جگہ بھیم کا اکھاڑا کبھی تھا، اور میر خلیق کی قبر کا پتا دینے میں بعض علمی بیاضوں میں اس کا ذکر ہے۔

(تاریخ لکھنؤ، ص 351)

قبرستان کے مزید ذکر میں مولوی آغا مہدی بتاتے ہیں:

1225ھ میں یہ قبرستان محدود اور پھاٹک سے گذر کر داخلہ ہوتا تھا ... اس علاقے میں ایک اوسط درجے کی مسجد بھی تھی جس کا اب نام ونشان نہیں ہے۔ (ص 52-351)

1225ھ میر کی وفات کا سال ہے۔ اس وجہ سے اس سنہ میں قبرستان کی کیفیت کا یہ بیان زیادہ اہم ہو جاتا ہے۔

❊

اوپر جو بیانات دیے گئے ہیں وہ اُس زمانے کے ہیں جب انگریزی راج میں انہدامی کارروائیوں، پھر نئی تعمیروں نے سٹیٹی، بھیم کے اکھاڑے اور اس قبرستان کے نقشے بدل دیے تھے اور ان کی بیشتر تعمیروں کو فنا کر دیا تھا، البتہ میر محمد محسن کا بیان (1810) انگریزی دور کا نہیں بلکہ عہدِ شاہی سے بھی پہلے اودھ کے نوابی دور کا ہے۔ ہمیں ایک اور بیان ملتا ہے جو میر کی وفات اور محمد محسن کی تحریر سے بھی بیس برس پہلے کا ہے۔ اس بیان سے قبرستان کا نہ صرف محل وقوع بلکہ نام بھی ہمارے علم میں آ جاتا ہے۔ اس کی تفصیل یوں ہے:

سید حسین شاہ حقیقت کے بڑے بھائی (اور میر محسن علی محسن مصنف تذکرہ سراپا سخن کے چچا) سید حسن شاہ نے کہانی کے روپ میں اپنی خودنوشت فسانۂ رنگیں 1205ھ (91-1790ء عہد آصف الدولہ) میں لکھی۔ وہ بتاتے ہیں کہ ان کی محبوبہ خانم جان کی موت لکھنؤ میں ہوئی اور ایک عورت مرزائی نے انھیں بتایا:

بعد نماز جمعہ عبد النبی شاہ کے تکیے میں نماز جنازہ پڑھی گئی اور وہیں تکیے میں، جو بھیم کے اکھاڑے کے پاس ہے، اس گوہرِ گراں مایہ، آفتابِ شرم و حیا کو قبر میں چھپا دیا۔

(نشتر، ص 210)

Scanned with CamScanner

❁

ان ساری معلومات کا خلاصہ یہ ہے کہ وفات کے وقت میر کا مسکن لکھنؤ کے محلے سٹھی میں تھا۔ سٹھی سے متصل محلہ بھیم کا اکھاڑا تھا۔ اسی محلے کے اندر وہ اصل بھیم کا اکھاڑا تھا جس کے پاس عبدالنبی شاہ کا تکیہ تھا۔ یہ تکیہ محلہ بھیم کا اکھاڑا میں پڑتا تھا اور تکیہ اکھاڑا بھیم، بھیم کا تکیہ، قبرستان اکھاڑا بھیم کہلانے لگا اور بھیم کے اکھاڑے کی نسبت سے مشہور ہو گیا تھا۔ اسی قبرستان میں میر اور ان کے اہل خاندان کی قبریں تھیں۔

اسی محلہ سٹھی میں 1857 کے آشوب سے پہلے تک میر انیس کا بھی مکان تھا جہاں ان کے والد میر حسن خلیق کی وفات ہوئی (8 جمادی الاول 1260ھ، 26 مئی 1844ء) اور اسی اکھاڑا بھیم کے قبرستان میں خلیق کی بھی تدفین ہوئی۔ سعادت خان ناصر کی روایت کے مطابق خلیق کے لڑکپن میں ان کے والد میر حسن اصلاحِ کلام کے لیے ''اول ان کو میر تقی میر کی خدمت میں لے گئے تھے۔ میر نے کہا، اپنی ہی اولاد کی تربیت نہیں ہوتی، غیر کی اصلاح کا کسے دماغ ہے۔'' (خوش معرکۂ زیبا، ص 302) اس طرح خلیق شاعری کے میدان میں ریختے کے اس استاد کا قرب حاصل کرنے سے محروم رہ گئے تھے، جس کی تلافی شاید اسی طرح ہونا تھی کہ زیرِ زمین ان کو میر کی ہم جواری نصیب ہو اور بالائے زمین اُن کی آنکھ بھی اسی محلے میں بند ہو جس میں میر کی آنکھ بند ہوئی تھی۔ اور یہ دونوں استاد اس لحاظ سے ہم قسمت بھی تھے کہ ان کے مسکن بھی اور مدفن بھی بے نشان ہو گئے۔

مآخذ

1۔ احوالِ مرثیہ گویاں، نوشتہ سید ظفر حسن عرف بابو صاحب فائق لکھنوی، مخطوطہ ذخیرۂ ادیب، لکھنؤ۔

2۔ انیسیات: سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ 1976ء (مضمون ''میر انیس: کچھ چشم دید حالات'')

3۔ تاریخ لکھنؤ: زبدۃ العلما مولوی سید آغا مہدی لکھنوی۔ ناشر جمعیتِ خدام عزا، کراچی 1976ء۔

4۔ ثمرات الانظار فی ما مضیٰ من الآثار: چودھری محمد شوکت علی سندیلوی، مطبع علوی، لکھنؤ 1892ء، 1309ھ۔

Scanned with CamScanner

5۔ خوش معرکۂ زیبا: سعادت خان ناصر، مرتبہ سید محمد شمیم انہونوی، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ 1981۔
6۔ دیوان میر (نسخہ محمود آباد، مکتوبہ 1203ھ): ترتیب و تدوین ڈاکٹر اکبر حیدری، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، سری نگر 1973۔
7۔ سوانح عمری: محمد کاظم، مطبع گنگا پرشاد ورما، لکھنؤ 1308۔
8۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب: حیات اور کارنامے: مرتبہ پروفیسر نذیر احمد، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی 1993ء (مضمون ''پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب'' از ڈاکٹر عبادت بریلوی)
9۔ طاہرہ: محمد عبدالحلیم شرر، طبع سوم، دل گداز پریس، لکھنؤ 1934۔
10۔ عروج اردو: سید خورشید حسن عرف دولھا صاحب عروج، مخطوطہ ذخیرۂ ادیب، لکھنؤ۔
11۔ قیصر التواریخ (جلدِ دوم تواریخ اودھ): سید کمال الدین حیدر، طبع سوم، مطبع نول کشور، لکھنؤ 1907۔
12۔ مرقع خسروی: شیخ محمد عظمت علی کاکوروی، مرتبہ ڈاکٹر ذکی کاکوروی، مرکز ادب اردو، لکھنؤ 1986۔
13۔ نشتر (ترجمۂ فسانۂ رنگیں، تصنیف سید حسن شاہ): مترجم سجاد حسین کسمنڈوی، کتابی دنیا، لکھنؤ۔
14۔ واقعات انیس: سید مہدی حسن احسن لکھنوی، اصح المطابع، لکھنؤ 1908۔

❊❊

ذکرِ میر کا بین السطور

[ذکرِ میر کتابی صورت میں 1928 میں شائع ہوئی اور اس کی مدد سے میر پر تحقیق کو بہت آگے بڑھا دیا گیا، لیکن نامانوس فارسی محاوروں اور دہلی کی الجھی ہوئی سیاسی تاریخ کے بیانوں نے اس کتاب کو عام ادب دوستوں کی فہم سے کچھ دور دور رکھا۔ مطبوعہ متن کی سرسری تدوین اور طباعتی غلطیوں کی وجہ سے یہ محققوں کے بھی بہت کام کی نہیں تھی۔ 1957 میں ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے اس کا بہت سلیس اردو ترجمہ شائع کیا۔ یہ اردو کی ایک بڑی خدمت تھی، لیکن اصل فارسی متن کا مسئلہ اب بھی باقی رہا۔ 1996 میں ڈاکٹر نثار فاروقی نے اپنا ترجمہ مع فارسی متن کے شائع کیا۔ اس ترجمے کی زبان کو انھوں نے میر کی فارسی سے قریب تر کر دینے کے باوجود پہلے کی طرح سلیس اور رواں رکھا۔ مقدمۂ کتاب اور ترجمے کے حواشی میں ضروری معلومات بہم پہنچائی۔ اصل فارسی متن کو اختلافاتِ نسخ کی نشان دہی کے ساتھ شامل کیا اور اس کی فرہنگ بھی تیار کر دی۔ اس طرح 1957 کی ادبی خدمت اب احسان بن گئی ہے جس کی وجہ سے ذکرِ میر کے متن کو سمجھنا اور اس کے مضمرات پر غور کرنا آسان ہو گیا ہے۔

شکاگو یونیورسٹی کے پروفیسر چودھری محمد نعیم نے ذکرِ میر کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے اور اس کے مقدمے اور دیگر متعلقات کی تیاری میں غیر معمولی محنت کی ہے۔ یہ انگریزی ایڈیشن (جو زیرِ طبع ہے) پروفیسر نعیم کی عنایت سے مجھے دیکھنے کو ملا۔

یہ دونوں مترجم ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔ (نیر مسعود)]

❀

Scanned with CamScanner

ذکرِ میر کی دستیابی کے بعد امید تھی کہ میر کی اس خودنوشت سے ان کی زندگی کے بہت سے حالات روشن ہو جائیں گے اور ان کے بارے میں بہت سی ایسی باتیں صحیح صحیح معلوم ہو جائیں گی جو کسی دوسری جگہ مذکور نہیں ہیں۔ یہ امید ایک حد تک پوری بھی ہوئی لیکن اس کتاب کے کئی بیان ایسے بھی ہیں جو واضح نہیں ہیں اور ذہن میں کچھ سوالات پیدا کرتے ہیں جن کے جواب کتاب کے بین السطور میں تلاش کرنا پڑتے ہیں۔ یہ بین السطور کبھی کبھی وہ نہیں کہتا جو میر کہتے ہیں، اور کبھی وہ کہتا ہے جو میر نہیں کہتے۔ ذکرِ میر کے متن کی بنیاد پر میر کے حالات کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کرنے سے پہلے ہمیں اس متن کے بین السطور پر بھی غور کر لینا چاہیے۔ یہ تحریر ایسی ہی ایک کوشش ہے۔

1 محمد علی اور حافظ محمد حسن کا رشتہ

میر بتاتے ہیں کہ حافظ محمد حسن جو ان سے بڑے تھے، ان کے سوتیلے بھائی (''برادر اندر'') تھے جن کی والدہ سراج الدین علی خان آرزو کی بہن تھیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ میر کے والد محمد علی نے دو شادیاں کی تھیں۔ حافظ محمد حسن پہلی بیوی سے، میر دوسری بیوی سے تھے اور محمد حسن کی والدہ کی وفات کے بعد محمد علی نے میر کی والدہ سے شادی کی تھی۔ لیکن ذکرِ میر سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ محمد علی نے صرف دو شادیاں کی تھیں، دو سے زیادہ نہیں۔ یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ محمد علی نے پہلے محمد حسن کی والدہ سے اور ان کی وفات کے بعد میر کی والدہ سے شادی کی تھی۔ ایسی مثالیں بہت ملتی ہیں کہ کسی شخص کی بعد والی بیوی کے یہاں پہلے اور پہلے والی بیوی کے یہاں بعد میں اولاد ہوئی۔ یہاں بھی اس امکان کو مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ ذکرِ میر میں اس امکان کے تائیدی یا تردیدی اشارے موجود نہیں ہیں۔

لیکن ذکرِ میر کا بین السطور محمد حسن کے بارے میں یہ بتاتا معلوم ہوتا ہے کہ وہ محمد علی کے صُلبی فرزند نہیں تھے۔ اس امکان کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ وہ اپنی والدہ کے کسی اور شوہر کی اولاد ہوں اور جب محمد علی نے ان کی والدہ سے شادی کی ہو تو ماں کے ساتھ اپنے نئے باپ کی کفالت میں آ گئے ہوں (جس کی مثالیں مسلم گھرانوں میں مل جاتی ہیں)۔ اس صورت میں محمد حسن اور میر کی مائیں ہی نہیں باپ بھی مختلف ہو جاتے ہیں اور دونوں کا سوتیلا رشتہ دُہرا ہو جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ محمد حسن

Scanned with CamScanner

اور محمد علی کا رشتہ سوتیلے باپ بیٹے کا ہو جاتا ہے۔

میر اپنے والد اور چھوٹے بھائی کے اور خود اپنے ناموں کے ساتھ "میر" کا لفظ لگا کر اپنے خاندان کی سیادت ظاہر کرتے ہیں، لیکن حافظ محمد حسن کا نام "میر" کے سابقے کے بغیر لکھتے ہیں۔ کیا اس طرح وہ یہ جتانا چاہتے ہیں کہ محمد حسن غیر سید تھے اور میر کے سید باپ کے سگے بیٹے نہیں تھے؟

محمد حسن کے بیٹے محسن کو بعض محقق سید تسلیم نہیں کرتے۔ اگر محسن، یعنی ان کے باپ محمد حسن، غیر سید اور محمد علی سید تھے تو یہ یقینی ہو جاتا ہے کہ محمد حسن محمد علی کے سگے بیٹے نہیں تھے۔ لیکن محسن اور محمد حسن کے سید ہونے نہ ہونے کا ہنوز فیصلہ نہیں ہوا ہے، اس لیے اس رُخ سے ہماری کوئی رہنمائی نہیں ہوتی، البتہ ذکرِ میر کے کچھ اور بیان غور کا تقاضا کرتے ہیں۔ مثلاً محمد علی آخر وقت میں محمد حسن کو بلا کر کہتے ہیں کہ میں فقیر آدمی ہوں، تین سو کتابوں کے سوا کچھ نہیں رکھتا۔ انھیں میرے سامنے "حصہ برادرانہ" کر کے لے لو۔ محمد حسن "التماس" کرتے ہیں کہ میں طالب علم ہوں، کتابوں کی زیادہ مہارت اور واقفیت رکھتا ہوں۔ یہ چھوٹے بھائی کتابوں سے مربوط نہیں ہیں، انھیں برباد کر دیں گے۔ اگر کتابیں میرے پاس امانت رکھوا دیجیے تو اچھا ہے، ورنہ آپ مختار ہیں۔ محمد علی کو غصہ آ جاتا ہے، حسن کو بُرا بھلا کہنے لگتے ہیں اور شبہ ظاہر کرتے ہیں کہ محمد حسن بھائیوں کا حق مار کر خود ساری کتابیں ہتھیا لینا چاہتے ہیں۔ تاہم وہ محمد حسن کو کتابیں لے جانے اور ان کی نگہداشت کرنے کی اجازت دے دیتے ہیں۔

لیکن اس طرح اپنا اثاث البیت محمد حسن کی تحویل میں دے دینے کے بعد وہ محمد حسن سے نہیں، کم سن میر سے کہتے ہیں کہ میں تین سو روپے کا مقروض ہوں، امید ہے کہ تم جب تک یہ قرض ادا نہ کر دو گے میرا جنازہ نہیں اٹھاؤ گے۔ میر کہتے ہیں کہ گھر میں کتابوں کے سوا کچھ مال نہیں، وہ تو آپ نے بڑے بھائی کو دے دیں، میں قرض کیونکر ادا کروں گا؟ محمد علی آبدیدہ ہو کر کہتے ہیں کہ خدا کریم ہے، روپے کا کاغذ راستے میں ہے، میں چاہتا تھا اس کے پہنچنے تک زندہ رہوں، لیکن اب اتنا وقت نہیں ہے۔ اس کے کچھ دیر بعد وہ ختم ہو جاتے ہیں۔

اب گھر کا اثاثہ کتابوں کی صورت میں حافظ محمد حسن کے پاس ہے اور اس کے سوا محمد علی کا کچھ ترکہ باقی نہیں ہے۔ لیکن میر بتاتے ہیں کہ محمد حسن نے جب دیکھا کہ باپ مفلس مرے ہیں اور قرض خواہ میرے دامن گیر ہوں گے تو یہ کہہ کر الگ ہو گئے کہ جو [چھوٹے بھائی باپ کے] "ہمگیرِ ناز و نعم"

تھے وہ جانیں اور ان کا کام جانے، میں باپ کے زندگی میں کسی کام میں دخیل نہیں رہا، وقفِ اولادی سے بھی درگذرا۔ ان کے سجادہ نشین سلامت رہیں (جو) اپنے بال اور منھ نوچ رہے ہیں۔ وہ جو مصلحت ہوگی کریں گے۔ چنانچہ محمد علی کی وفات کے بعد پانچ سو روپے کی جو رقم پہنچی وہ محمد حسن نے نہیں، میر نے وصول کی اور اس سے قرض اور باپ کی آخری رسوم ادا کیے۔

سوال یہ ہے کہ کیا مرنے والے کا بڑا بیٹا اس کے قرضوں کی ادائی اور تجہیز و تکفین کا مکلف نہیں ہوتا؟ اور کیا محمد حسن کا یہ عذر شرعاً اور قانوناً مسموع ہو سکتا تھا کہ چونکہ وہ باپ کی زندگی میں الگ الگ رہے اور چونکہ میر باپ کے لاڈلے تھے اور ان کے غم میں بے حال ہیں اس لیے یہ ذمہ داریاں اُن کی ہیں، نہ کہ محمد حسن کی؟ محمد حسن کا یہ کہنا بھی بہت معنی خیز ہے کہ وہ باپ کی زندگی میں بھی کسی کام میں دخیل نہیں تھے، باپ کے وقفِ اولادی میں بھی ان کی شراکت نہیں تھی اور یہ کہ محمد علی کے سجادہ نشین وہ نہیں، ان کے سوتیلے بھائی ہیں۔ یہ بھی قابلِ غور بات ہے کہ بسترِ مرگ پر محمد علی خود کہتے ہیں کہ محمد حسن ''ترکِ لباس'' کر چکے ہیں، اور محمد علی کی فضیلت بھی میر یہی ''ترکِ لباس'' بتاتے ہیں۔ یہ ہم سلوکی محمد حسن کو محمد علی کی جاے گیری اور سجادہ نشینی کا زیادہ اہل اور مستحق بناتی ہے۔ محمد حسن بھائیوں میں بڑے ہونے کے باوجود اولادِ اکبر کے فرائض سے بری الذمہ کیوں تھے؟ وہ محمد علی کی زندگی میں بھی ان کے معاملات سے الگ تھلگ کیوں تھے؟ وقفِ اولادی میں ان کا حصہ کیوں نہیں تھا؟ وہ محمد علی کے سجادہ نشین کیوں نہیں ہوے؟ اور محمد علی کی موت کا وہ اتنا غم کیوں نہیں کر رہے تھے؟ یہ سب سوال اس طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ وہ محمد علی کے صُلبی فرزند نہیں تھے بلکہ سوتیلے بیٹے کی حیثیت سے ان کے زیرِ کفالت تھے اور اسی طرف یہ سوال بھی اشارہ کر رہا ہے کہ محمد علی کی موت کے بعد پہنچنے والی رقم جس سے ان کی تدفین وغیرہ بھی ہونا تھی، وہ حسن کے بجاے میر کو کیوں دی گئی درحالے کہ میر باپ کے صدمے سے پاگل ہو رہے تھے، اور اس سوال کے ساتھ یہ سوال سر اٹھاتا ہے کہ کیا محمد علی کی موت نے میر اور ان کے چھوٹے بھائی کی طرح محمد حسن کو یتیمی کا داغ نہیں دیا تھا؟

ذکرِ میر کے ایک مخطوطے کے مطابق محمد حسن میر کے ''برادرِ بے مات'' تھے، لیکن جن لغات تک ہماری رسائی ہوئی ان میں ''بے مات'' نہیں ملا۔

Scanned with CamScanner

2 میر کی سجادہ نشینی

حافظ محمد حسن نے اپنی گفتگو میں میر اور ان کے بھائی کو محمد علی کا سجادہ نشین کہا تھا۔ ذکرِ میر کا متن براہِ راست یہ نہیں بتاتا کہ باپ کی وفات کے بعد میر باضابطہ ان کے سجادہ نشین مقرر ہو گئے تھے، لیکن کتاب کے بین السطور سے نکلتا ہے کہ یہی ہوا تھا۔ میر بتاتے ہیں کہ باپ کی موت کے بعد میں نے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا بلکہ ''دمِ خود را بہ برادرِ خود سپردم'' اور خود روزگار کی تلاش میں اکبرآباد کے آس پاس دوڑ دھوپ کرنے لگا۔ ''دم خود بہ کسے سپردن'' کے معنی ''وقتِ مُردن رازِ خود بااو گفتن وقائم مقامِ خود کردن'' بتائی گئی ہیں (بہارِ عجم)۔ یعنی تلاشِ معاش کی مہم پر نکلنے کے وقت میر باپ کے سجادہ نشین تھے۔ اب انھوں نے چھوٹے بھائی کو ضروری ہدایتیں کر کے انھیں سجادہ سونپا اور خود نکل کھڑے ہوے۔ اطراف اکبرآباد میں کار برآری نہ ہونے پر دہلی گئے اور صمصام الدولہ سے اپنا وظیفہ مقرر کرا کے واپس آئے اور صمصام الدولہ کی وفات کے ساتھ وظیفہ ختم ہونے تک اکبرآباد میں رہے، یا کم از کم دہلی میں نہیں رہے۔ وظیفے کی موقوفی کے بعد میر خانِ آرزو کے پاس دہلی چلے گئے اور اکبرآباد میں ان کی سکونت ہمیشہ کے لیے قریب قریب ختم ہو گئی۔ اس طرح ان کی وظیفہ یابی اور سجادہ نشینی کا زمانہ ایک ہی قرار پاتا ہے۔ وظیفہ ختم ہونے کے بعد میر کا پھر تلاشِ معاش میں سرگرداں ہو جانا بتاتا ہے کہ سجادہ نشینی سے ان کی کفالت نہیں ہوتی تھی۔

3 کتابوں کا کاروبار

ذکرِ میر میں کتابوں اور ''وقفِ اولادی'' کے ذکر سے خیال ہو سکتا ہے کہ یہی کتابیں وقف کا مال تھیں۔ لیکن کسی شے کو وقف کر دینے کے بعد وقف کرنے والے کا اس پر مالکانہ قبضہ ختم ہو جاتا ہے۔ موقوفہ مال کو ترکہ پدری کی طرح تقسیم نہیں کیا جا سکتا، اور ذاتی ضروریات کے لیے فروخت تو بالکل ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ''وقفِ اولادی'' یا ''وقف علی الاولاد'' وہ وقف ہوتا ہے جس کے منتظم یا متولی کا واقف کی اولاد میں ہونا ضروری ہو، یعنی اس اولاد کو بھی اس وقف کے مال کی تقسیم یا فروخت کا حق نہیں ہوتا ہے۔ محمد علی کی کتابوں کے معاملے میں یہ خلاف باتیں موجود ہیں۔ وہ انھیں اپنا ذاتی مال بتا

Scanned with CamScanner

کر ان کی تقسیم کی بات کرتے ہیں اور جب وہ میر سے تین سو روپے قرض کی ادائی کے متوقع ہوتے ہیں تو میر کے جواب سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ قرض محمد علی کی کتابیں بیچ کر ادا کیا جا سکتا تھا۔ مزید برآں حافظ محمد حسن، جن کی یہ درخواست کہ سب کتابیں ان کی تحویل میں دے دی جائیں محمد علی نے منظور کر لی تھی، محمد علی کی موت کے بعد کی گفتگو میں خود کو وقفِ اولادی سے بے تعلق بتاتے ہیں۔ اس طرح اس بات میں شک کی گنجائش نہیں رہتی کہ وقفِ اولادی کتابوں سے الگ کچھ اور شے تھی، اور یہ تین سو کتابیں موقوفہ نہیں بلکہ فروختنی مال تھیں۔

ذکرِ میر سے واضح طور پر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ محمد علی کی بسر اوقات صرف عقیدت مندوں کے نذرانوں وغیرہ پر تھی یا ان کا کوئی اپنا ذریعۂ معاش بھی تھا، لیکن ذکرِ میر میں کتابوں کا حوالہ جس طرح آیا ہے اس سے خیال ہوتا ہے کہ محمد علی کا کچھ تعلق کتابوں کے کاروبار سے ضرور تھا اور یہ تین سو کتابیں دراصل مالِ تجارت تھیں۔ ان کے بسترِ مرگ پر ہونے والے مکالموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتابیں محمد علی کے شوقیہ کتاب خانے کی نہیں بلکہ ان کے گھر کے ''دم و پوست'' یعنی ''سرمائے اور پونجی'' (نثار فاروقی) کی حیثیت رکھتی تھیں، اسی لیے انھوں نے مرنے سے پہلے ان کو بیٹوں میں تقسیم کرنا چاہا تھا۔ اگر یہ محض مطالعے اور علمی استفادے یعنی گھر میں مستقلاً رکھنے کے لیے ہوتیں تو اس حصہ بانٹ کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ حافظ محمد حسن یہ کہہ کر کتابوں کی تقسیم سے اختلاف کرتے ہیں کہ چھوٹے بھائی اس سرمائے کی قدر و قیمت سے واقف نہیں، اسے کھیل کا سامان بنا کر برباد کر دیں گے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ میں پڑھنے والا آدمی ہوں اور اس کام میں میری مہارت اور واقفیت زیادہ ہے (کرم ایں کار مرا بیشتر است)۔ اس سے اشارہ ملتا ہے کہ اس گھر میں کتابوں کا کاروبار ہوتا تھا اور اس میں حافظ محمد حسن بھی کسی حیثیت سے لگے ہوئے تھے۔ تقسیمِ کتب کی مخالفت میں محمد حسن یہ نہیں کہتے کہ بھائیوں کے لیے کتابیں بے کار ہیں اس لیے یہ سب جلد یں مجھ کو دے دیجیے، میں ان سے استفادہ کروں گا۔ وہ کہتے ہیں کہ انھیں میرے پاس بطورِ امانت رکھوا دیجیے تو بہتر ہے۔ کسی چیز کو امانت کے طور پر رکھنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وقت آنے پر وہ چیز اس کے حق دار کے حوالے کر دی جائے گی۔ محمد حسن کی تجویز میں بھی یہ وعدہ پنہاں ہے کہ وہ کتابوں کو سنبھال کر رکھیں گے اور بالآخر چھوٹے بھائیوں کو ان کے حصے کی کتابیں دے دیں گے۔ محمد علی اس اندیشے کا اظہار کرتے ہیں کہ محمد حسن امانت داری کا حق ادا نہیں

Scanned with CamScanner

کریں گے۔ وہ عجیب بات کہتے ہیں کہ محمد تقی تیرا دست نگر نہیں ہوگا، اور اگر تو اپنی سی کر گذرا تو وہ ایک جلد کتاب کے لیے تیری کھال کھینچ لے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ کتابیں اگر گھر میں رکھی رہنے کے لیے ہوتیں تو انھیں ایسی بات کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ محمد تقی بڑے ہو کر خود ہی کتابیں لے سکتے تھے۔ محمد علی دراصل یہ شبہ ظاہر کر رہے ہیں کہ محمد حسن ان کتابوں کو فروخت کر دیں گے اور ان کے پیسے محمد تقی کو نہیں دیں گے۔ بہر حال محمد حسن کی تجویز معقول تھی اور محمد علی نے سخت برہمی کے اظہار کے باوجود اسے منظور کر لیا اور کہا کہ خیر، ان کتابوں کو لے جا، اور ''نگاہ دار'' یعنی ان کی حفاظت (بہ طور امانت) کر، نہ یہ کہ یہ سب کتابیں تو ہی لے لے۔

اس بین السطوری استخراج میں ایک تضاد نظر آ رہا ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ اس وقت ادائے قرض کے لیے روپے کی شدید ضرورت ہے۔ گھر میں تین سو کتابیں موجود ہیں جو تجارت کا مال ہیں، لیکن محمد علی انھیں فروخت کرنے کی وصیت نہیں کرتے۔ اس سے کتابوں کا مالِ تجارت ہونا مشکوک معلوم ہونے لگتا ہے لیکن اس تضاد کا حل بھی ایک تضادیے (Paradox) کی صورت میں ملتا ہے۔ محمد علی چاہتے تھے کہ ان کی میت اٹھنے سے پہلے پہلے قرض کی ادائی ہو جائے۔ کتابوں کی فروخت کے ذریعے یہ رقم مہیا کرنے کی صورت میں کتابوں کو اونے پونے داموں بیچنے کی نوبت آ جاتی کیونکہ اس عجلت اور ایسی ہنگامی حالت میں انھیں مالِ تجارت کی طرح اطمینان کے ساتھ سوچ سمجھ کر بیچنا ممکن نہ ہوتا۔ محمد علی اس اثاثے اور ذریعۂ آمدنی کو اس طرح تلف نہیں کرنا چاہتے تھے۔ یعنی کتابیں اس لیے نہیں فروخت کی گئیں کہ وہ تجارت کا مال تھیں۔ اس طرح یہ ایک دلچسپ تضادیہ بنتا ہے۔

حافظ محمد حسن نے میر اور ان کے بھائی کے حصے کی کتابیں انھیں دے دی تھیں یا نہیں؟ اگر دے دی تھیں تو میر نے ان کا کیا کیا؟ کیا دہلی کے دوسرے سفر میں وہ کتابیں بھی ساتھ لے گئے تھے؟ خان آرزو کے پاس پہنچنے کے بعد وہ خود بھی کماتے تھے یا سوتیلے ماموں کے دست نگر تھے؟ ذکرِ میر ان سوالوں کا براہ راست جواب نہیں دیتی، لیکن ایک دن ہم کتاب، میر، اور دہلی کے بازار سے بیک وقت دوچار ہوتے ہیں۔

اس موقعے کا بیان میر نے کچھ بند بند انداز میں اور کچھ باتیں چھوڑ چھوڑ کر کیا ہے۔ بتاتے

Scanned with CamScanner

ہیں کہ ایک دن میں بازار میں ایک کتاب کا جز ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا۔ میر جعفر نامی ایک جوان اُدھر سے گذرے اور مجھے دیکھ کر آ بیٹھے۔ ایک ساعت بعد کہنے لگے، معلوم ہوتا ہے تم کو مطالعے کا ذوق ہے۔ میں بھی ''کشتۂ کتاب'' ہوں لیکن کوئی مخاطب نہیں ملتا۔ اگر تمھیں شوقِ کامل ہو تو میں چندے آ جایا کروں۔ میں نے کہا، میں اتنی مقدرت نہیں رکھتا کہ کوئی خدمت کر سکوں۔ اگر آپ فی سبیل اللہ یہ زحمت گوارا کریں تو عین بندہ نوازی۔ وہ بولے، بس یہ ہے کہ جب تک کچھ نہ ملے (تھوڑا سا ناشتہ نہ مل جائے: نثار فاروقی) میں باہر قدم نہیں رکھتا۔ میں نے کہا، خدائے کریم یہ مشکل آسان کر دے گا، حالانکہ میرے پاس بھی کچھ نہیں ہے۔ انھوں نے اس ''نسخۂ درہم'' کے ''پاورق'' ''مطابق سرِ صفحہ ہائے آئندہ'' کر کے مجھے دیے اور چلے گئے۔ اس دن سے اکثر اس ''ملک سیرت و آدم صورت'' سے ملاقات ہوا کرتی تھی اور وہ بڑی مہربانی کے ساتھ دماغ سوزی کرتے اور مجھے کچھ نہ کچھ سکھاتے رہتے تھے۔ میں بھی مقدور بھر ان کی خدمت کرتا... اچانک ان کے وطن سے خط آ گیا اور وہ مجبوراً وہاں چلے گئے۔

یہ کچھ عجیب بیان ہے۔ اس کے شروع میں میر جعفر غرض مند معلوم ہوتے ہیں اور بازار میں میر کے پاس کتاب دیکھ کر اپنے ''کشتۂ کتاب'' ہونے کا ذکر کرتے ہیں۔ پھر کبھی کبھی میر کے پاس چلے آنے کو کہتے ہیں۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں جس کے لیے وہ معاوضے کے طالب ہوں۔ لیکن میر اس گفتگو کو کاروباری رنگ دے کر ان کے معاوضے کی بات چھیڑ دیتے ہیں۔ یہ بات طے ہو جاتی ہے اور میر جعفر کو اس بات کا معاوضہ ملنے لگتا ہے کہ وہ اکثر میر سے ملتے اور انھیں کچھ سکھاتے رہتے تھے۔ کیا سکھاتے تھے؟ اس کی صراحت میر نہیں کرتے۔ اس کا امکان کم ہے کہ وہ مدرّس کی حیثیت سے میر کو گویا ٹیوشن پڑھاتے ہوں اور میر تنگ دست ہونے کے باوجود فیس دے کر اُن سے پڑھتے ہوں۔

یہ پورا واقعہ میر کی کتاب فروشی سے متعلق معلوم ہوتا ہے۔ مندرجۂ ذیل امور اسی طرف اشارہ کرتے ہیں:

(1) خان آرزو سے بدمزگیوں کے بیان میں میر بتاتے ہیں کہ میں صد ہزار احتیاج کے باوجود ان سے ایک روپیہ بھی نہیں مانگتا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میر کا اپنا کوئی ذریعۂ آمدنی تھا لیکن وہ زیادہ مقدرت نہیں رکھتے تھے اور کبھی کبھی ضروری ہو جاتا تھا کہ وہ کسی اور سے پیسے مانگیں۔

Scanned with CamScanner

(2) اسی بدمزگی کے زمانے میں میر پاگل ہو گئے۔ بتاتے ہیں کہ کئی مہینے کے بعد میں نے مکمل صحت پائی اور ''ترسّل'' پڑھنا شروع کیا۔ یہ ترسّل خوانی بہت قابلِ غور ہے۔ ذکرِ میر کی فرہنگ میں ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے ''ترسّل'' کی حسب ذیل وضاحت کر دی ہے:

''نظم و نثر کی کچھ عبارتیں مختلف خطوں میں لکھ کر بچوں سے پڑھوائی جاتی ہیں تا کہ انھیں ہر طرح کے خط کی شناخت ہو جائے۔'' ظاہر ہے کہ اب میر بچوں کی طرح ابتدائی درسیات کے ایک شعبے کے طور پر نہیں بلکہ باقاعدہ خط شناسی اور مخطوطہ خوانی میں مہارت حاصل کرنے کے لیے ترسّل خوانی کر رہے تھے۔ یہ مہارت کتاب شناسوں کے لیے جتنی کارآمد ہوتی ہے اتنی ہی، بلکہ زیادہ، کارآمد ان لوگوں کے لیے ہوتی ہے جو قلمی کتابوں کا کاروبار کرتے ہوں۔ میر کی ترسل خوانی اسی کاروبار کے سلسلے میں ہو سکتی ہے۔

(3) میر نے صاف صاف نہیں لکھا کہ سرِ بازار کتابوں کی دکان لگائے بیٹھے تھے۔ وہ کتاب کے ایک ''جز'' اور ''نسخۂ درہم'' کا ذکر کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ انھیں دیکھ کر میر جعفر وہاں آ گئے اور ''بعدِ ساعتے'' انھوں نے میر سے گفتگو شروع کی۔ ساعت سے بالعموم ایک گھنٹہ یا کچھ دیر مراد لیتے ہیں۔ اغلباً اس مدت میں میر جعفر دوسری کتابیں دیکھتے رہے، پھر میر کی طرف متوجہ ہوئے جو کسی کتاب کے ''نسخۂ درہم'' کا ایک جز لیے اس کے منتشر اوراق کو صفحہ وار مرتب کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پرانے مخطوطوں میں ورق یا صفحے پر نمبر ڈالنے کا دستور تقریباً نہیں تھا۔ اس کے بجائے ہر ورق کے دوسرے (کتاب کے داہنے) صفحے پر آخری لفظ کے نیچے وہ لفظ لکھ دیا جاتا تھا جس سے اگلے ورق کا پہلا (کتاب کا بایاں) صفحہ شروع ہوتا تھا۔ یہ لفظ ''ترک'' کہلاتا ہے اور اسی سے کتاب کے اوراق کی ترتیب معین ہوتی تھی۔ اسی سے محاورہ ''ترک بگڑ جانا'' (کام کا بے ترتیب اور غیر منظم ہو جانا) بنایا گیا۔ میر کسی کتاب کی ترک درست کر رہے تھے۔ یہ منظر کسی دیکھنے والے کو یہ تاثر دے سکتا تھا کہ وہ کتاب کے مطالعے میں منہمک ہیں اور ''ذوقِ خواندن'' رکھتے ہیں۔ میر جعفر خود بھی کتابوں کے دیوانے تھے لیکن ان کی پریشانی یہ تھی کہ انھیں کوئی مخاطب نہیں ملتا تھا۔ اس وقت تک میر خان آرزو کی بدولت مخاطب ہی نہیں ''مخاطبِ صحیح'' ہونے کی لیاقت پیدا کر چکے تھے۔ میر جعفر نے اجازت مانگی کہ وہ میر کے پاس آ جایا کریں، بشرطیکہ میر کو ''شوقِ کامل'' ہو۔ یہ شرط بظاہر اس لیے تھی کہ میر جعفر میر کی

Scanned with CamScanner

کتابیں دیکھنے کے علاوہ، ہم مذاقی کی وجہ سے ان کے ساتھ علمی گفتگوئیں بھی چاہتے تھے۔ شوقِ کامل نہ ہونے کی صورت میں میر کو میر جعفر کا بار بار آنا کچھ ناگوار ہو سکتا تھا۔ بہر حال یہاں تک تو میر جعفر میر سے ایک طرح کی رعایت اور اجازت کے طالب ہیں جو میر کی طرف سے میر جعفر کی خدمت ہوتی نہ کہ برعکس، اور اس کا صلہ میر کو ملنا چاہیے تھا نہ کہ میر جعفر کو جو اپنے علمی ذوق کی تسکین کے لیے میر کے پاس آتے رہنا چاہتے ہیں اور میر پر بار بھی نہیں ہونا چاہتے۔ لیکن میر ان سے جو کچھ کہتے ہیں وہ معاملے کو الجھا دیتا ہے۔ میر نہیں بتاتے کہ اس کے بعد گفتگو کس نہج پر آگے بڑھی، لیکن اب ہم دیکھتے ہیں کہ میر ایک کاروباری، وہ بھی سیانے کاروباری، کی طرح عظیم آبادی نو وارد سے تہی دستی کا عذر کر کے بلا معاوضہ کچھ کام لینا چاہتے ہیں۔ جواب میں میر جعفر بھی کاروباری ہو جاتے ہیں اور کچھ نہ کچھ صلے کے بغیر زحمت کشی سے انکار کر دیتے ہیں۔ میر اپنی تہی دستی کا مکرر ذکر کرتے ہیں لیکن معاملہ طے بھی کر لیتے ہیں۔ یہ اب بھی نہیں بتاتے کہ میر جعفر کو کس خدمت کا صلہ دینے کی بات چھڑ گئی ہے۔

(4) لیکن اس کے بعد معما حل ہونے لگتا ہے۔ میر کی پہلی خدمت اسی دن اور وہیں کے وہیں میر جعفر یہ کرتے ہیں کہ ان کے "نسخۂ درہم" کی ترک درست کرنے کا مشکل، دیر طلب اور تکنیکی کام انجام دے کر نسخہ میر کے حوالے کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ اس طرح میر کا یہ مخطوطہ، جو ابھی تک منتشر اوراق کا ایک بے ترتیب پلندہ تھا، اب ایک مرتب کتاب کی صورت اختیار کر کے زیادہ قیمتی ہو جاتا ہے۔

(5) اس دن کے بعد سے میر جعفر دماغ سوزی کر کے میر کو کچھ نہ کچھ سکھاتے اور میر ان کو کچھ نہ کچھ معاوضہ دیتے رہتے ہیں۔ اس سکھانے کا تعلق اغلباً علمی تدریس سے نہیں بلکہ کتاب شناسی کے اُن رموز سے تھا جن سے کسی "کشتۂ کتاب" کا واقف ہونا متوقع ہوتا ہے، مثلاً کون سی چیزیں مخطوطوں کی اہمیت اور قیمت بڑھاتی ہیں؛ کاغذ، روشنائی اور خط سے کسی نسخے کے بارے میں کیا کیا معلوم کیا جا سکتا ہے، وغیرہ، یعنی وہ باتیں جن کا جاننا قلمی کتابوں کا کاروبار کرنے والوں کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ باپ کی وفات کے وقت میر کتابوں کے معاملے میں ناواقف تھے۔ بعد میں بھی جب وہ صمصام الدولہ کے یہاں سے بلا خدمت عمدہ وظیفہ پا رہے تھے، انھوں نے کتاب شناسی اور کتاب فروشی کی باقاعدہ تربیت حاصل کرنے کی غالباً ضرورت نہیں سمجھی یا اس کا موقع نہیں پایا۔

Scanned with CamScanner

میر جعفر ان کی اسی خامی کو دور کر رہے تھے۔ ممکن ہے ترسل پڑھنے میں بھی میر نے میر جعفر ہی سے استفادہ کیا ہو، اس لیے کہ ترسل کے ذکر کے معا بعد وہ میر جعفر کا قصہ شروع کر دیتے ہیں (روزے برسر بازار... نشستہ بودم... الخ) جس کو ہم اس بات کی وضاحت بھی سمجھ سکتے ہیں کہ انھوں نے ترسل خوانی کس طرح شروع کی۔

میر کا کمھیر میں راجا ناگرمل کے یہاں کتب خانے سے متعلق ہونا، خان آرزو کے تذکرے مجمع النفائس کے اس نسخے میں جو ناگرمل کے لیے تیار کیا گیا تھا، کسی اور کے قلم سے میر کے حالات کا داخل کیا جانا اور اس کارروائی کا امکانی ذمہ دار خود میر کو سمجھا جانا بھی اسی بحث سے مربوط ہے لیکن ہم نے اپنی گفتگو کو ذکرِ میر تک محدود رکھا ہے۔

4 حافظ محمد حسن کا کردار

ذکرِ میر کے متن کی روشنی میں ہم نے حافظ محمد حسن کو میر کی داستانِ حیات کے ولین کا سا درجہ دے دیا ہے جو روایتی سوتیلے بھائی کی طرح میر کے درپئے آزار تھے اور ان کی کارشکنی میں سرگرم رہتے تھے۔ لیکن کتاب کا بین السطور ان کے اس نقش کی توثیق نہیں کرتا بلکہ انھیں ہم میر سے کچھ بڑھ کے کم نصیب پاتے ہیں۔ محمد علی کا رویہ ان کے ساتھ ویسا مشفقانہ نہیں تھا جیسا میر کے ساتھ تھا، بلکہ انھوں نے مرتے مرتے محمد حسن کو بہت سخت سست کہا۔ اس نازک وقت میں محمد حسن نے تین سو کتابوں کو بہ طورِ امانت اپنے پاس رکھنے کی پیشکش کی تو محمد علی نے اس پیشکش کو منظور کر لینے کے باوجود پہلے ہی سے ان کو خائن قرار دے دیا۔ گھر کے معاملات میں وہ کسی کام میں دخیل نہیں تھے، وقفِ اولادی سے ان کو حصہ نہیں ملا تھا، محمد علی کی سجادہ نشینی ان کو نہیں، میر کو ملی تھی، درحالے کہ وہ "ترکِ لباس" کر چکے تھے، یعنی مالِ دنیا سے درویشوں کی طرح بے نیاز، یا محروم، تھے اور درویش کا قرض اور اس کے آخری رسوم ادا کرنے کی استطاعت غالباً نہیں رکھتے تھے۔ پھر اس ادائی کی وصیت ان کو نہیں میر کو کی گئی تھی، اسی لیے انھوں نے معقول بات کہی کہ یہ اُن کا فرض ہے جو مرنے والے کے وارث اور جانشین مقرر ہوے ہیں، اور ان کے غم میں بال اور منھ نوچ رہے ہیں۔ (یہ آخری بات طعنے کے طور پر کہی گئی ہے

Scanned with CamScanner

اور اس سے محمد حسن یہ شبہ ظاہر کرتے معلوم ہوتے ہیں کہ میر غم سے بے آپ ہو جانے کی اداکاری کر رہے ہیں اور یہ اپنی ذمہ داریوں سے گریز کا بہانہ ہے تاکہ باپ کے قرض خواہ میر کو ان کے حال پر چھوڑ کر محمد حسن کے ''دامن گیر'' ہوں۔) یہ خود محمد حسن کی زیادتی معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے اس سانحے میں بڑے کی حیثیت سے میر کی دل جوئی کرنے کے بجائے جلی کٹی شروع کر دی اور ایک بیگانے کی طرح پورے معاملے سے کنارہ کش ہو گئے۔ اسی لیے میر نے اس بیان پر ''بے مروتی برادر'' کا عنوان ڈالا۔ لیکن میر ہی کے بیان کے مطابق محمد علی دم توڑنے سے پہلے محمد حسن کو چھوٹے بھائیوں کا دشمن ''کج پلاس''، کم ظرف، ذلیل، بخیل، حاسد کہہ چکے تھے اور میر کی طرف سے ان کو یہ کہہ کر للکار بھی چکے تھے کہ محمد تقی تیرا دست نگر نہیں ہوگا بلکہ تیری درگت بنا کے رکھ دے گا۔ یہ محمد حسن کے حق میں مرتے ہوئے آدمی کے آخری الفاظ تھے اور ان کا جو ردِعمل محمد حسن پر ہوا وہ ناگزیر تھا۔

اس کے بعد میر نے محمد حسن کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا، گویا اپنے باپ کی امید کا پاس کیا، لیکن معاش کے لیے تگ و دو کرتے ہوئے آخر محمد حسن ہی کے ماموں کے سائے میں آ گئے۔ آرزو کے ساتھ رہ کر میر نے خاصی لیاقت پیدا کر لی۔ اور اب ایک بار پھر حافظ محمد حسن ذکرِ میر کے صفحات پر نمودار ہوتے ہیں۔ میر بتاتے ہیں کہ خان آرزو کے پاس ''اخوان پناہ'' کا خط پہنچا کہ میر محمد تقی ''فتنۂ روزگار'' ہے، اس کی تربیت میں ہرگز نہ پڑیے بلکہ دوستی کے پردے میں اسے بھگتا دیجیے (ظاہر ہے کہ میر کو اس خط کے مضمون کی اطلاع نہیں ہو سکتی تھی لیکن اس امکان کو نظر میں رکھنا چاہیے کہ خان آرزو والوں میں سے کسی نے، یا خود خان آرزو نے، میر کو اس سے مطلع کر دیا ہو)۔ اس خط کے پہنچنے کے بعد میر کے ساتھ خان آرزو کا رویہ بدل گیا۔ یہاں پہنچ کر حافظ محمد حسن ذکرِ میر کے صفحات سے غائب ہو جاتے ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے اپنے ماموں پر میر کے فتنۂ روزگار ہونے کا جو انکشاف کیا تھا وہ محض اتہام تھا، لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ خان آرزو پر اپنے اس بھانجے کا خاصا اثر تھا، اور اس لیے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اول اول محمد حسن نے اس بات کی مخالفت نہیں کی تھی کہ ماموں میر کی سرپرستی اور تربیت کریں۔

Scanned with CamScanner

5 خانِ آرزو کا کردار

ذکرِ میر نے خانِ آرزو کو میر کی زندگی کا دوسرا ولین بنا دیا اور بالعموم یہ سمجھا جانے لگا کہ انھوں نے میر کو کچھ پڑھایا نہ سکھایا بلکہ اپنی بدسلوکیوں سے اپنے مرحوم بہنوئی کے اس بے یار و مددگار غم زدہ بیٹے کو پاگل کر دیا۔ یہ بات بلا اختلاف مان لی گئی کہ میر نے نکات الشعرا میں ان کو اپنا استاد لکھنے کے باوجود ذکرِ میر میں ان سے تلمذ کا انکار کیا ہے۔ یہ خیال درست نہیں ہے۔ میر نے لکھا ہے کہ انھوں نے خان آرزو کے پاس رہ کر ''کتابے چند از یاران شہر'' پڑھیں۔ اس فقرے سے میر کا مطلب یہ سمجھا گیا کہ وہ رہے تو خان آرزو کی خدمت میں، لیکن کتابیں انھوں نے آرزو سے نہیں بلکہ شہر کے دوسرے لوگوں سے پڑھیں۔ یہ غلط فہمی میر کے فقرے میں ''از'' کا فارسی مفہوم نظر انداز کر دینے سے پیدا ہوگئی۔ ''کتابے از فلاں'' کا مطلب ''فلاں کی کتاب'' ہوتا ہے۔ ''کتابے چند از یاران شہر خواندم'' کا مطلب ہے یاران شہر کی کچھ کتابیں پڑھیں، نہ کہ یاران شہر سے کچھ کتابیں پڑھیں۔ ''کچھ'' فارسی لفظ ''چند'' کے دو متضاد معنوں میں سے ایک کا ترجمہ ہے۔ ''چند'' تھوڑی تعداد کے لیے بھی آتا ہے اور بڑی تعداد کے لیے بھی۔ میر کا پورا جملہ ہے ''چندے پیش او ماندم و کتابے چند از یارانِ شہر خواندم'' جس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ میں نے ان کے حضور میں رہ کر ان سے اہلِ شہر کی کچھ یا بہت سی کتابیں پڑھیں۔[1]

میر نے خان آرزو کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا بین السطور محمد حسن کی طرح آرزو کو بھی تقریباً بے تقصیر ٹھہراتا ہے۔

خان آرزو کے پاس دہلی آنے سے پہلے میر اکبرآباد میں صمصام الدولہ کی سرکار سے تیس روپے ماہوار وظیفہ پا رہے تھے اور باپ کے سجادہ نشین بھی تھے۔ اس طرح انھیں دین اور دنیا دونوں کی آسودگی میسر تھی۔ اس کے بعد دو انقلاب ہو گئے۔ ایک تو صمصام الدولہ کی وفات کے نتیجے میں میر کی تیس روپے مہینے کی یافت بند ہوگئی، دوسرے کسی وجہ سے ان کی مقدس درویشی حیثیت باقی نہیں رہی۔

---

1 تفصیلی بحث کے لیے دیکھیے مضمون ''میر اور خان آرزو: تضاد بیان اور انکار تلمذ کا قضیہ'' از نیر مسعود۔ مشمولہ تحفۃ السرور، مرتبہ شمس الرحمٰن فاروقی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی 1980۔

Scanned with CamScanner

میر بتاتے ہیں کہ جو لوگ باپ کی زندگی میں میرے پاؤں کی دھول کو سرمہ بناتے تھے انھوں نے یکبارگی مجھ کو نظروں سے گرا دیا۔ یہ کیوں ہوا؟ میر کا یہ نظروں سے گرنا ظاہر ہے اس سبب سے نہیں تھا کہ وہ تہی دست ہو گئے تھے۔ درویشوں کے مریدان کی دولت کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کے فقر اور روحانیت کی وجہ سے عقیدت کے ساتھ ان کی تعظیم کرتے ہیں، اور یہ عقیدت نسل بہ نسل ان کے جانشینوں اور خلفا کو منتقل ہوتی رہتی ہے۔ ذکرِ میر ہمیں کوئی اشارہ نہیں دیتی کہ درویش محمد علی کے معتقدوں نے ان کے بعد ان کے جانشین اور لاڈلے بیٹے سے کیا دیکھا جو ان کی نظروں سے گر گیا، مگر اس میں شک نہیں کہ یہ میر کا کوئی ایسا رنگ تھا جس نے محمد علی کے حلقے والوں کو میر کی گویا بیعت توڑ دینے پر مجبور کر دیا، اور میر کو بھی مجبور کر دیا کہ وہ اکبر آباد کی سکونت ترک کر کے کہیں اور نکل جائیں۔ ان حالات میں دہلی شہر اور خان آرزو کی ڈیوڑھی نے ان کو پناہ دی۔

سراج الدین علی خان آرزو اس وقت ہندوستان میں فارسی کی سب سے بڑی ادبی شخصیت تھے۔ ان کی صحبت میسر آنا خوش نصیبی کی بات تھی۔ میر ان کی بہن کی اولاد نہیں تھے اور اس لحاظ سے میر کی ذمہ داری ان پر عائد نہیں ہوتی تھی۔ آرزو کے بھانجے حافظ محمد حسن سے میر کے تعلقات خوشگوار نہیں تھے۔ پھر بھی میر ان کے ماموں کے پاس دہلی کس طرح پہنچ گئے؟ وہ آرزو کو میر کی سرپرستی سے روک سکتے تھے، اور بعد میں انھوں نے یہ کیا بھی، لیکن اس وقت میر کا خانِ آرزو کے پاس پہنچنا بتاتا ہے کہ اس اقدام کو خان اور حافظ دونوں کی رضامندی حاصل تھی، بلکہ ممکن ہے یہ انھیں دونوں کی تجویز پر عمل میں آیا ہو۔

دہلی پہنچ کر میر خانِ آرزو کے زیرِ تربیت رہے یہاں تک کہ بقول خود "قابل ایں شدم کہ مخاطبِ صحیح کسے می توانم شد" (میں اس قابل ہو گیا کہ کسی کا "مخاطبِ صحیح" بن سکوں)۔ اس فقرے کی اہمیت کو نظر میں رکھنا چاہیے۔ میر جعفر عظیم آبادی میر سے دہلی کے سے شہر میں کوئی مخاطب نہ ملنے کی شکایت کرتے ہیں اور میر کو مخاطب ہونے کے لائق پاتے ہیں۔ خود میر ذکرِ میر میں فریادی ہوئے ہیں کہ انھیں کوئی "مخاطبِ صحیح" نہیں ملا۔ ان کے ذہن میں مخاطبِ صحیح کا ایک معیار تھا۔ خانِ آرزو نے ان کو اس معیار پر پہنچا دیا۔ میر نے اُن کے اس احسان کا اعتراف بھی کیا، لیکن اس کے فوراً بعد وہ خان کی شکایتوں کا دفتر کھول دیتے ہیں اور ان کی بدسلوکیوں کا سبب محمد حسن کے اس خط کو بتاتے ہیں

Scanned with CamScanner

جس کا ذکر آ چکا ہے۔ اس خط کے پہنچنے کے بعد کا بیان بہت قابلِ غور ہو جاتا ہے۔ میر بتاتے ہیں:

وہ عزیز [آرزو] پکے دنیادار تھے۔ اپنے بھانجے کی خصومت دیکھ کر میری بداندیشی پر اُتر آئے۔ میں اُن کے سامنے آ جاتا تو بُرا بھلا کہنے لگتے، اُن سے کتراتا تو طعنے دیتے۔ ہر روز میری تاک میں رہتے۔ اکثر بدسلوکی کرتے۔ کیا بتاؤں انھیں کیسا پایا۔ کیا کہوں میری کیا حالت ہو گئی۔ ہر چند خاموشی اختیار کرتا لیکن وہ مجھے کونچنے سے باز نہ آتے۔ لاکھ ضرورت پڑنے پر بھی ان سے ایک روپیہ تک نہ مانگتا لیکن وہ میری کھال کھینچنا نہ چھوڑتے۔

میر کا بیان یہ تاثر دے رہا ہے کہ ماموں بھانجے نے طے کیا کہ محمد تقی کی سرپرستی نہ کی جائے لیکن کھل کر اس سے دشمنی بھی ظاہر نہ کی جائے بلکہ دنیاداری برتتے ہوئے دوستی کے پردے میں اس سے نپٹ لیا جائے۔ چنانچہ خانِ آرزو نے میر کی گویا اصلاحی اور بزرگانہ سرزنش شروع کر دی، اور ان کے پیچھے پڑ گئے۔ میر ان کے سامنے آنے سے گریز کرتے، ان کی ڈانٹ ڈپٹ کے جواب میں چپکے رہتے، مگر آرزو کی سخت گیری میں فرق نہیں آیا۔ مقصد یہ تھا کہ بزرگانہ عتاب کے حیلے سے میر کو اتنا عاجز کیا جائے کہ میر کی زندگی دوبھر ہو جائے، اور ان سے پیچھا چھوٹ جائے۔

میر یہ سب تاثر تو دیتے ہیں لیکن یہ نہیں بتاتے کہ محمد حسن نے اپنے نوشتے میں میر کے متعلق کیا کیا لکھا تھا جس کو پڑھ کر آرزو کے سے پختہ کار نے بھی ان کو فتنۂ روزگار سمجھ لیا اور ان سے پیچھا چھڑانا ضروری سمجھا۔ خود میر نے اس ساری کشمکش کے بنیادی سبب پر بھاری پردہ ڈال دیا ہے اور بالکل نہیں بتاتے کہ آرزو ان کو کس بات کا قصوروار ٹھہرا کر ان کی سرزنش کرتے تھے۔ ظاہر ہے وہ کسی بھی جا بے جا شکایت کے بغیر یوں ہی تو میر کے پیچھے ہاتھ دھو کر نہیں پڑ گئے تھے۔ میر ان پر اس زیادتی کا الزام لگاتے بھی نہیں، اور خود کو بے تقصیر بھی نہیں بتاتے۔ وہ اس باب میں بالکل خاموش ہیں، جس طرح اس باب میں کہ محمد علی کے بعد ان کے عقیدت مندوں نے ان کو نظروں سے کیوں گرا دیا۔ اس خاموشی کا ایک سبب سمجھ میں آتا ہے۔ ذکرِ میر کی پہلی تسوید کے وقت میر بہ قولِ خود پچاس سال کے تھے۔ اس وقت میر کی طرح اکبر آباد کے بہت سے لوگ دہلی میں موجود تھے اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان میں میر سے بڑی عمر کے ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے میر کا بچپن تک دیکھ رکھا تھا۔ ایسے لوگ بھی

Scanned with CamScanner

بہت تھے جو میر کی دہلی آمد کے بعد کے حالات سے واقف تھے۔ یہ لوگ اکبرآباد میں محمد علی کے معتقدوں اور دہلی میں خان آرزو کے رویوں کی تبدیلی کے اسباب سے بے خبر نہیں تھے، اس لیے میر نے یہی مناسب سمجھا کہ ان اسباب کے وجود کا نہ انکار کریں نہ اقرار، بلکہ ان کا ذکر ہی چھوڑ جائیں۔

میر نے بتایا ہے کہ خان آرزو روزانہ اُن کی تاک لگاتے تھے (ہر روز ان کی آنکھیں میرا پیچھا کرتی تھیں) یعنی انھیں شبہ تھا کہ میر ان سے چھپا کر کسی غلط کارروائی میں لگے ہوئے ہیں۔ میر کا ان کے سامنے آنے سے گریز کرنا اور ان کی تند گفتاریوں کے جواب میں چپ سادھے رہنا ان کو سراسر مظلوم اور مصالحت پسند ثابت نہیں کرتا۔ ان کے اسی بیان کا بین السطور یہ بھی بتاتا ہے کہ انھوں نے آرزو سے ملنا ترک سا کر کے ان کے ساتھ بے پروائی کا انداز اختیار کر لیا تھا، اور اگر کبھی سامنا ہو جانے پر آرزو کچھ سرزنش کرتے تو میر سنی ان سنی کر دیتے اور وہ گستاخانہ خاموشی اختیار کرتے جو پلٹ کر جواب دینے سے زیادہ اشتعال دلاتی ہے، خصوصاً بزرگوں کو۔ اور اس سلسلے کا جاری رہنا بتاتا ہے کہ خان آرزو میر کی جس روش سے برہم تھے وہ میر نے ترک نہیں کی تھی، اور یہ بھی کہ اگر خان کا مقصد میر کے پیچھے پڑ کر ان سے پیچھا چھڑانا تھا تو یہ مقصد فی الوقت پورا نہیں ہو رہا تھا۔

خان کے رویے کی یہ برحق یا ناحق تبدیلی بہر حال میر کے حق میں زہر ثابت ہوئی۔ یہ احساس کہ ان کی مستقل نگرانی کی جا رہی ہے اور تیز نگاہیں ان کا پیچھا نہیں چھوڑتیں، سخت خلجان میں مبتلا کرنے والا تھا، اور اب میر ایک اور معنی خیز جملہ لکھتے ہیں کہ ''خاطرِ گرفتۂ من گرفتہ تر شد''۔ گرفتہ خاطری کا مطلب گھٹن کے احساس میں مبتلا ہونا ہے۔ ایسا شخص جو پہلے ہی سے اندر اندر گھٹ رہا ہو، اوپر سے کسی بڑے کا عتاب سہتا ہو اور کچھ نہ کہتا ہو اور مستقل زیرِ نگرانی ہونے کے احساس سے مستقل جھجک اور رکاوٹ میں مبتلا ہو، اس کے پاگل ہو جانے میں زیادہ کسر نہیں رہتی، خصوصاً اس صورت میں کہ اس کے خاندان میں جنون کا سلسلہ موجود ہو۔ میر کے دادا کا مزاج ''اعتدال سے منحرف'' ہو گیا تھا۔ ''تبرید'' یعنی سودائیت کم کرنے والی ٹھنڈی دواؤں سے وہ ابھی صحت یاب نہیں ہوئے تھے کہ وفات پا گئے۔ ان کے دونوں بیٹوں میں ایک، یعنی میر کے بڑے چچا، ''خالی از خللِ دماغ'' نہیں تھے، جوان مر گئے۔ دوسرے بیٹے کا بھی مزاج اعتدال سے منحرف تھا، گھر کی ماما کی ایک بات کا بُرا مان گئے۔ ماما کو نکالنے کے بجائے خود گھر سے نکل گئے، اور کسی سامانِ سفر کے بغیر اکبرآباد سے لاہور چل

دیے۔ بہ قولِ میر شراب عشق نے ان کے ہوش زائل کر دیے تھے اور وہ ''مستانہ و بیخودانہ'' گفتگو کرتے تھے۔ یہ میر کے باپ محمد علی تھے۔

6 جنون

خاطرِ گرفتہ کے گرفتہ تر ہونے کا ذکر کرتے ہی میر بتاتے ہیں، ''میں پاگل ہو گیا''۔ اور یہ کہ میں اس عالم میں اپنے حجرے کا دروازہ بند کر لیتا اور اپنے غم کو لیے تنہا بیٹھا رہتا۔ چاند نکلتا تو مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑتی۔ یوں تو میں بچپن ہی سے چاند کو تکا کرتا تھا مگر ایسا کبھی نہیں تھا کہ جنون تک نوبت پہنچے اور وحشت اتنی بڑھ جائے کہ لوگ میرے حجرے کا دروازہ ڈرتے ڈرتے کھولیں اور میری صحبت سے احتراز کرنے لگیں۔

میر کے جنون کا حال بہت دلچسپ اور بہت غور طلب ہے، لیکن ہمارے موضوع سے اس کا زیادہ تعلق نہیں ہے، اس لیے کہ یہاں ہم کو ذکرِ میر کے متن اور بین السطور میں کوئی خاص اختلاف نظر نہیں آتا۔ البتہ ان کا فقرہ ''خاطرِ گرفتہ‌ام گرفتہ تر شد'' بتاتا ہے کہ ان کے جنون کا سبب جو گھٹن تھی وہ خان آرزو کے رویے نے پیدا نہیں کی تھی بلکہ پہلے سے موجود تھی۔ میر نہیں بتاتے کہ یہ گھٹن کس بات سے تھی، لیکن یہی گھٹن تھی جسے آرزو کی تہدیدی توجہ نے بڑھا کر جنون میں بدل دیا تھا۔

کچھ غور کا مطالبہ وہ حسین پیکر بھی کرتا ہے جو شبِ مہتاب میں کرۂ ماہ سے اُتر کر میر کے پاس آ جاتا تھا، جس کے ساتھ رات کو میر کی صحبت رہتی تھی اور صبح کو اس کے واپس چلے جانے کے بعد اُن پر جارحانہ وحشت سوار ہوتی تھی۔ وہ میر کے سوا کسی کو نظر نہ آتا تھا اسی لیے میر اسے وہم کا باندھا ہوا نقش کہتے ہیں اور اس کے ساتھ کسی قسم کے جسمانی اتصال کا ذکر نہیں کرتے، یعنی وہ لامسے کی گرفت سے باہر تھا۔ میر غالباً اس جنون کی کیفیت میں بھی اس کو غیر مادّی وجود سمجھتے تھے، اس کی کشش کے اثر میں ہونے کے باوجود اس سے کچھ خوفزدہ بھی تھے اور اس کی مستقل مفارقت پر اطمینان کی سانس لیتے معلوم ہوتے ہیں۔ میر یہ نہیں بتاتے کہ وہ کوئی بالکل اجنبی صورت تھی یا ان کی پہچان کے کسی ایسے حقیقی وجود کا ہیولائی پیکر جو اَب ہستی کی اقلیم سے معدوم ہو چکا تھا، البتہ اسی موضوع پر اپنی مثنوی خواب و

Scanned with CamScanner

خیال اس شعر سے شروع کرتے ہیں:

خوشا حال اس کا جو معدوم ہے　　　　که احوال اپنا تو معلوم ہے

خواب و خیال میں میر نے اپنے جنون کا حال شاعرانہ رنگ آمیزیوں کے ساتھ بیان کیا ہے، پھر بھی اس کے بین السطور میں کچھ مبہم اور بھید بھری حقیقتیں جھلک مارتی محسوس ہوتی ہیں۔ لیکن ہمارا موضوع صرف ذکرِ میر کا بین السطور ہے، اس لیے یہاں خواب و خیال کے جائزے کا محل نہیں ہے۔

7　بین السطور کا بین السطور

ایسی آپ بیتیاں کم دیکھنے میں آتی ہیں جنھیں ان کے لکھنے والوں نے اپنی شخصیت کا جھوٹا یا سچا سکہ جمانے کے لیے استعمال نہ کیا ہو۔ بے سلیقہ لکھنے والے کی تحریر اس کوشش میں بے اثر اور پڑھنے والے کو بدمزہ کر دینے کی حد تک سطحی ہو جاتی ہے، لیکن ہوشیار اور سلیقہ مند لکھنے والا اس معاملے میں بالواسطہ پیرایہ اختیار کرتا ہے اور بہ ظاہر کچھ نہ کہتے ہوئے بھی بین السطور میں بہت کچھ کہہ جاتا ہے اور توجہ سے پڑھنے والا اس بین السطور کو بہت کچھ پڑھ لیتا ہے۔ لیکن اس حیثیت سے ذکرِ میر کے بین السطور کو ہم حیرت خیز، ناقابلِ یقین حد تک خالی پاتے ہیں۔ میر کی شاہانہ فقیری اور عجوبہ شخصیت کا جو نقش اور ان کا جو فنی دبدبہ ان کی زندگی میں قائم ہو چکا تھا اس کا تصور کرتے ہوئے ہم ذکرِ میر پڑھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب میر نے نہیں، میر کے کسی در پردہ حریف نے لکھی ہے جو ان کی شخصیت کو دبانا چاہتا ہے۔ کتاب میں میر سے متعلق جن بنیادی اور اہم باتوں کو نظر انداز، یا بالکل رواروی میں ان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، ہم ان کی فہرست بناتے ہیں اور حیران ہوتے ہیں۔ میر اپنی ادبی تخلیقی سرگرمیوں کے بیان میں بھی دلچسپی نہیں رکھتے اور شکارناموں کے ذکر کو مقدم سمجھتے معلوم ہوتے ہیں، وہ بھی صرف اس لیے کہ ان کا تعلق میر کے مربی نواب آصف الدولہ سے ہے۔

میر کا شخصی نقش ایک فلک زدہ، غم دیدہ انسان کا سا بن گیا ہے۔ ذکرِ میر میں خود میر بھی اپنا کچھ ایسا ہی نقش بناتے ہیں، لیکن یہ نقش کتاب کے بین السطور میں نہیں بلکہ براہِ راست لفظوں سے

بنایا گیا ہے۔ دوسری طرف میر کا کلام اور ان کے بارے میں بیانات ان کو ایک بہت پیچیدہ اور مرموز شخصیت بناتے ہیں، لیکن یہ شخصیت ذکرِ میر کے بین السطور تک سے غائب ہے۔ اور یہ بات میر کی شخصیت کو اور بھی پیچیدہ اور مرموز کر دیتی ہے۔

❁❁

Scanned with CamScanner

میر اور خانِ آرزو

تضادِ بیان اور انکارِ تلمذ کا قضیہ

خان آرزو کا تذکرہ میر نے اپنی دو کتابوں نکات الشعرا اور ذکرِ میر میں کیا ہے۔ دونوں کتابوں کے متعلقہ اقتباس حسب ذیل ہیں:

نکات الشعرا

1۔ آب ورنگِ باغِ نکتہ دانی، چمن آرائے گلزارِ معانی، متصرفِ ملکِ زورِ طلبِ بلاغت، پہلوان شاعرِ عرصۂ فصاحت، چراغِ دودمانِ صفات گفتگو کہ چراغش روشن باد، سراج الدین علی خان آرزو سلمہ اللہ تعالیٰ ابداً۔ شاعرِ زبردست، قادرِ سخن، عالمِ فاضل۔ تا حال ہمچوایشاں بہ ہندوستانِ جنت نشان بہم نہ رسیدہ بلکہ بحث در ایران رود، شہرۂ آفاق، در سخن فہمی طاق۔ صاحبِ تصنیفاتِ دہ پانزدہ کتب و رسالہ و دیوان و مثنویات۔ حالِ کمالاتِ اوشاں از حیزِ بیان بیرون است۔ ہمہ استادانِ مضبوطِ فنِ ریختہ ہم شاگردانِ آں بزرگوار اند۔ گاہے برائے تفننِ طبع دو سہ شعر ریختہ فرمودہ، ایں فنِ بے اعتبار را کہ ما اختیار کردہ ایم اعتبار دادہ اند۔

2۔ مرزا معز فطرت کے حال میں لکھتے ہیں:

احوالِ او من وعن در تذکرۂ سراج الدین خاں صاحب کہ استاد و پیر و مرشدِ بندہ است، مسطور۔

Scanned with CamScanner

ذکرِ میر

1۔ (صمصام الدولہ کی وفات کے بعد اپنے بے سہارا ہو کر دہلی جانے کا ذکر کرتے ہیں)

ناچار بارِ دیگر بہ دہلی رسیدم و منت ہائے بے منتہائے خالوے برادرِ کلاں [حافظ محمد حسن] کہ سراج الدین علی خان آرزو باشد، کشیدم۔ یعنی چندے پیش او ماندم و کتابے چند از یارانِ شہر خواندم۔ چوں قابلِ ایں شدم کہ مخاطبِ صحیح کسے می توانم شد، نوشتۂ اخوان پناہ [محمد حسن] رسید کہ میر محمد تقی فتنۂ روزگار است، زنہار بہ تربیتِ او نہ باید پرداخت و در پردۂ دوستی کارش باید ساخت، آں عزیز دنیادار واقعی بود، نظر بر خصومتِ ہمشیرہ زادۂ خود بد من اندیشید۔ اگر دو چاری شدم چار چاری زد، دگر اعراض می کردم نوا خوانی می کرد۔ ہر روز چشمش بہ دنبالِ من می بود۔ اکثر سلوکِ مدعیانہ می نمود۔ چہ بیان کنم کہ از او چہ دیدم۔ چہ گویم کہ چہ حالت کشیدم۔ ہر چند پنبہ دہانی اختیار می کردم او از حلاجی دست بر نمی داشت۔ با صد ہزار احتیاج یک روپیا نمی خواستم۔ اما شلاخی نمی گذاشت۔ خصمی او اگر بہ تفصیل بیان کردہ آید، دفترے جداگانہ می باید۔ خاطرِ گرفتۂ من گرفتہ تر شد، سودا کردم۔ دلِ تنگم تنگ تر گردید، وحشتے پیدا کردم۔ در حجرہ اے کہ می بودم درش می بستم و با ایں کثرتِ غم تنہا می نشستم۔ (اس کے بعد اپنے جنون کی تفصیل۔)

2۔ (جنون سے افاقہ ہونے، میر جعفر سے پڑھنے، سعادت علی امروہوی کی تحریک سے اردو میں شاعری کرنے اور مشہور شاعر ہو جانے کے بعد:)

یک روز خالوے کذائی بر طعام طلبید۔ تلخے از او شنیدم۔ بے مزہ شدم و دست در طعام ناکردہ برخاستم۔ چوں پائے چراغ نہ داشتم شام از خانۂ او بر آمدہ راہِ مسجدِ جامع پیش گرفتم۔ (اس کے بعد علیم اللہ سے ملاقات اور رعایت خاں کی ملازمت کا بیان۔)

3۔ (رعایت خاں، نواب بہادر جاوید خاں، مہا نرائن کی ملازمتوں کے بیان کے بعد:)

در ایں ایام من از نا مساعدتِ بخت ہمسایگی خالو گذاشتہ نظر بر ایں کہ مرا بہ چشم کم خواہد دید در حویلی امیر خاں ... انجام ... سکونت اختیار کردم و بہ لطائف الحیل بسر بردم۔

4۔ دریں حالت خبر رسید کہ صفدر جنگ بساطِ حیات در پیچید و ریاست صوبہ بہ شجاع الدولہ پسرِ او قرار یافت۔ خالوے من بادیہ پیماے طمع شد۔ یعنی در لشکرِ شجاع الدولہ بہ ایں توقع رفت کہ برادرانِ اسحاق خاں شہید آں جا ہستند، نظر بر حقوقِ سابق رعایتے خواہند کرد۔ جز باد بہ دست نیامد۔ لکد زمانہ خورد و ہماں جا مرد۔ مردۂ او را آوردند و در حویلی اش بہ خاک سپردند۔

❋

نکات الشعرا اور ذکرِ میر میں خانِ آرزو کے متعلق میر کے ان بیانوں میں جو فرق نظر آ رہا ہے اس پر متعدد محققوں کی نظر پڑی ہے اور انھوں نے اس کے بارے میں اظہارِ رائے کیا ہے، مثلاً:

مولوی عبدالحق:

''تمام تذکروں میں یہ لکھا ہے کہ انھوں (میر) نے باپ کے مرنے کے بعد... خان آرزو ہی کی آغوشِ شفقت میں تربیت پائی اور انھیں کے فیضِ تربیت سے علمی استعداد اور شاعری کا ذوق حاصل کیا۔ جب میر صاحب کا تذکرہ نکات الشعرا چھپ کر شائع ہوا تو اس بیان پر تصدیق کی مہر لگ گئی۔ اس کتاب میں انھوں نے خان آرزو کا بڑے ادب سے ذکر کیا ہے اور ان کے کمال اور سخن فہمی کی بے حد تعریف کی ہے اور مرزا معز [فطرت] موسوی خاں کے حال میں انھیں ''استاد و پیرومرشدِ بندہ'' لکھا ہے۔ ان شواہد کو دیکھتے ہوئے آزاد کا یہ قول نہایت ناگوار گزرتا ہے [کہ میر خان آرزو سے بگڑ کر الگ ہو گئے]... لیکن جب یہ کتاب [ذکرِ میؔر] ہماری نظر سے گزری تو معلوم ہوا کہ آزاد بڑے پتے کی بات لکھ گئے ہیں۔ میر صاحب، خان آرزو کے دل آزار برتاؤ اور بے مروتی کے نہایت شاکی ہیں... اب قابلِ غور یہ ہے کہ میر صاحب کے ان دو بیانات میں اس قدر تفاوت اور تضاد کیوں ہے... بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ تذکرہ میر صاحب کے خیال میں ایک ایسی چیز تھی جو مقبول ہونے والی تھی... یقین تھا کہ لوگ اسے شوق سے پڑھیں گے اور ہر کس و ناکس کے ہاتھ میں جائے گا۔ انھوں نے اس ناگوار قضیے کو چھیڑنا مصلحت

نہ سمجھا... لیکن جب وہ آپ بیتی لکھنے بیٹھے تو رہا نہ گیا۔ ساری رام کہانی کہہ سنائی... اور یہ خیال بھی نہ تھا کہ یہ کتاب کبھی دوسرے ہاتھوں میں جائے گی یا مقبول ہوگی... اس کتاب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ جو مشہور چلا آتا ہے کہ خان آرزو میر صاحب کے استاد تھے صحیح نہیں ہے۔ ہاں وہ اتنی بات کے قصوروار ضرور ہیں کہ دوبارہ جب دلی آئے تو ماموں ہی کے ہاں آکے ٹھیرے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ ''چندے پیش او ماندم و کتابے چند از یارانِ شہر خواندم''۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی تعلیم کا حال لکھا ہے کہ کیونکر اتفاق سے راستے ہی میں میر جعفر سے مدبھیڑ ہوئی اور ان سے فارسی پڑھنی شروع کی۔''[1]

سرشاہ محمد سلیمان:

نکات الشعرا میں میر نے خان آرزو کو اپنا استاد [و] پیرومرشد تسلیم کیا ہے لیکن ذکرِ میر میں خان آرزو سے کسی قسم کی تحصیل علم کا اعتراف نہیں کیا ہے۔[2]

خواجہ احمد فاروقی:

میر نے نکات الشعرا میں سراج الدین علی خان آرزو کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے [نکات الشعرا سے احوالِ آرزو کا اقتباس۔] ...اس کے علاوہ میر نے موسوی خاں فطرت کے حال میں خان آرزو کو پیرومرشدِ بندہ لکھا ہے۔

لیکن میر نے ذکرِ میر میں جو بعد کی تصنیف ہے اس کے خلاف واقعات بیان کیے ہیں۔ اس میں نہ خان آرزو کے کمالات کا اعتراف ہے اور نہ ان کے پیرومرشد ہونے کا... میر نے ذکرِ میر میں خانِ آرزو کو اپنا استاد بھی نہیں مانا ہے۔ حالانکہ ''یارانِ شہر'' (ص 63) اور میر جعفر عظیم آبادی (ص 66) سے فیض اٹھانے اور سعادت

[1] مقدمۂ ذکرِ میر، طبع اول، انجمن اردو پریس، اورنگ آباد، دکن، 1928۔

[2] مقدمۂ انتخابِ مثنویاتِ میر، نظامی پریس، بدایوں، 1930۔ ص 12۔

امروہوی کی تحریک وترغیب (ص 67) تک کا ذکر کیا ہے۔ خان آرزو کی استادی کا ذکر انھوں نے مروتاً یا مصلحتاً ان کی زندگی تک روا رکھا اور اس کے بعد غیر ضروری سمجھ کر اس سے انحراف کیا... میر نے دیدہ ودانستہ خان آرزو کے مرنے کے بعد ان کی شاگردی سے انکار کیا ہے۔"[3]

مالک رام:

"آزاد نے آبِ حیات میں غالباً خود میر کے ایک بیان (نکات الشعرا، ص 4) سے بھروسا کر کے انھیں خانِ آرزو کا شاگرد لکھا ہے جو ان کے سوتیلے ماموں بھی ہوتے تھے۔ اس کتاب [ذکرِ میر] سے معلوم ہوا کہ نہ صرف یہ کہ وہ ان کے استاد نہیں تھے بلکہ انھوں نے ان کی تعلیم وتربیت میں کسی طرح کی دلچسپی ہی نہیں لی۔"[4]

صفدر آہ:

"میر نے ایک طرف نکات الشعرا میں خان آرزو کی علمیت کا مبالغہ آمیز اعتراف کیا ہے اور انھیں بہ فخر اپنا استاد مانا ہے لیکن دوسری طرف ذکرِ میر میں انھیں خان آرزو کو اپنا بدترین دشمن، دنیادار اور انتہائی خود غرض آدمی قرار دیا ہے۔ اتنے بڑے شاعر کے بیان میں یہ بدیہی تضاد دیکھ کر قاری کے لیے ایک الجھن پیدا ہو جاتی ہے۔ اپنی ایک کتاب میں جسے "پیرومرشد واستادِ بندہ" کہا جائے اس کو دوسری کتاب میں شیطنتِ مجسم قرار دیا جائے، یہ کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔... سب سے پہلے ہمیں اس بات پر غور کرنا ہے کہ خان آرزو کے لیے میر کا بیان نکات الشعرا میں درست تھا یا ذکرِ میر میں؟

---

3 میر تقی میر: حیات اور شاعری، انجمن ترقی اردو (ہند)، علی گڑھ، 1954۔ ص 90، 91، 92، 98، 99۔

4 مقدمۂ میر کی آپ بیتی (ترجمۂ ذکرِ میر از نثار احمد فاروقی)، مکتبۂ برہان، دہلی، 1957۔

Scanned with CamScanner

اس کا جواب بالکل واضح ہے۔ نکات الشعرا میں خان آرزو پر اظہار خیال کرتے وقت میر کا مزاج معمول پر تھا۔ لیکن ذکرِ میر کا بیان غصے اور اشتعال کا نتیجہ ہے۔ ظاہر ہے کہ غصے کی باتیں قابلِ قبول نہیں ہوتیں۔ لہٰذا ذکرِ میر میں خان آرزو کے لیے میر کا بیان نا قابلِ قبول ہے اور حقیقت وہی ہے جو نکات الشعرا میں تحریر کی گئی ہے۔"[5]

قاضی عبدالودود:

"میر نے ذکرِ میر میں تلمذ آرزو سے صراحۃً انکار نہیں کیا، یہ بات کہ انھوں نے اس کا ذکر نہیں کیا اور دوسروں سے استفادے کا اعتراف کیا ہے انکار پر مشعر سمجھی جائے تو اور بات ہے۔"[6]

"تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ محمد تقی نے خان آرزو سے استفادہ کیا تھا۔ نکات الشعرا میں محمد تقی انھیں استاد و پیر و مرشدِ بندہ بھی کہتے ہیں اور محسن پسرِ حافظ محمد حسن و شاگردِ میر انھیں تلامذۂ آرزو میں شمار کرتا ہے لیکن ذکرِ میر میں مطلقاً کسی نوع کے علمی و ادبی استفادے کا ذکر نہیں اور یہ لکھتے ہیں کہ "چندے پیش او ماندم و کتابے چند از یارانِ شہر خواندم۔"[7]

محققوں کی ان تحریروں سے مندرجۂ ذیل نتیجے برآمد ہوتے ہیں:

1۔ نکات الشعرا اور ذکرِ میر میں خان آرزو سے متعلق میر کے بیان متضاد ہیں اور ذکرِ میر میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں وہ نکات الشعرا کے واقعات کی تردید کرتے ہیں۔

---

5 میر اور میریات، علوی بک ڈپو، بمبئی، 1976، ص 3-42۔

6 عیارستان، ادارۂ تحقیقاتِ اردو، پٹنہ، 1957۔ (تبصرہ بر میر تقی میر: حیات اور شاعری۔)

7 (میر کے) "مختصر حالاتِ زندگی"، مشمولہ کلیاتِ میر، حصہ اول، مرتبہ ظل عباس عباسی، علمی مجلس، دہلی، 1968، ص 11-10۔

Scanned with CamScanner

2۔نکات الشعرا کی اشاعت سے تمام تذکروں کے اس بیان کی تصدیق ہوگئی کہ باپ کے مرنے کے بعد میر۔ خان آرزو کی آغوشِ شفقت میں پرورش پائی اور انھیں کی تربیت کے فیض سے ''علمی استعداد اور شاعری کا ذوق حاصل کیا'' لیکن ذکرِ میر سے معلوم ہوتا ہے کہ خان آرزو نہ تو میر کے استاد تھے نہ انھوں نے میر کی تعلیم و تربیت کی۔

3۔میر نے خان آرزو کی وفات کے بعد عمداً ان سے تلمذ کا انکار کیا۔

4۔ذکرِ میر میں آرزو سے تلمذ کا صراحۃً انکار تو نہیں ہے لیکن دوسروں سے استفادے کا ذکر ہے اور خان آرزو سے ''مطلقاً کسی نوع کے علمی و ادبی استفادے'' کا ذکر نہیں۔

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میر کے بیانوں اور محققوں کی آرا کا مختصر تجزیہ کیا جائے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھنا چاہیے کہ نکات الشعرا اور ذکرِ میر میں خان آرزو سے متعلق میر کے بیانات مختلف النوع کہے جا سکتے ہیں، متضاد نہیں۔ اس لیے کہ دونوں میں سے کسی کتاب کے کسی بیان کی تردید دوسری کتاب کے کسی بیان سے نہیں ہوتی۔ نکات الشعرا میں خان آرزو کی علمیت اور مہارتِ فن کے بارے میں جو تعریفی فقرے استعمال ہوئے ہیں ان میں سے کسی بھی فقرے کے برخلاف کوئی فقرہ ذکرِ میر میں استعمال نہیں ہوا ہے، یعنی ذکرِ میر سے قطعاً یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ خان آرزو بڑے عالم یا شاعر نہیں تھے۔ اسی طرح ذکرِ میر میں خان آرزو کی جن (واقعی یا غیر واقعی) بدسلوکیوں کا ذکر اور اخلاقی کمزوریوں، دنیاداری اور طمع کی طرف اشارہ کیا گیا ہے نکات الشعرا میں ان کے برعکس کسی واقعے یا صفت کا ذکر نہیں ہوا ہے، یعنی اس تذکرے میں میر نے یہ نہیں کہا ہے کہ خان آرزو مجھ پر بہت مہربان اور بڑے تارک دنیا اور متوکل انسان ہیں۔ میر کے بیانوں میں سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ عالم، شاعر اور مصنف کی حیثیت سے خان آرزو قابلِ تعریف تھے (نکات الشعرا) لیکن بشری حیثیت سے ان میں کچھ خامیاں بھی تھیں (ذکرِ میر) اور میر ان کی علمیت اور شاعری کے معترف (نکات الشعرا) لیکن برتاو کے شاکی تھے (ذکرِ میر)۔ ظاہر ہے اسے تضاد بیانی نہیں کہا جا سکتا۔

یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ ذکرِ میر سے معلوم ہوتا ہے کہ خان آرزو نے میر کی ''تعلیم و تربیت میں کسی طرح کی دلچسپی ہی نہیں لی''۔ میر بتاتے ہیں کہ جب میں اس قابل ہو گیا کہ کسی کا مخاطب صحیح ہو

Scanned with CamScanner

سکوں تو ''اخواں پناہ'' (سوتیلے بھائی محمد حسن) کا خط پہنچا کہ میر محمد تقی فتنۂ روزگار ہے، اس کی تربیت ہرگز نہ کرنا چاہیے بلکہ دوستی کے پردے میں اس کا کام تمام کر دینا چاہیے، اور اسی خط کے نتیجے میں میر کے ساتھ خان آرزو کا رویہ بدل گیا۔ محمد حسن کا خان آرزو کو میر کی تربیت سے منع کرنا خود بتا رہا ہے کہ ابھی تک آرزو میر کی تربیت کر رہے تھے اور میر کے ساتھ ان کا برتاو بھی ٹھیک تھا۔ اور محمد حسن کے خط کے بعد خان آرزو کے رویے میں جو تبدیلی میر نے بیان کی ہے وہ بھی تربیت کے انداز سے خالی نہیں ہے۔ یعنی اب خان آرزو میر کو ڈانٹنے ڈپٹنے اور ہر وقت ان کی نگرانی کرنے لگے جس کا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ وہ میر کو کسی قسم کی (حقیقی یا غیر حقیقی) بے راہ روی سے روکنا چاہتے تھے۔

جواب میں میر نے بہ قولِ خود خاموشی اختیار کی اور خان آرزو سے سروکار اس حد تک کم کر دیا کہ لاکھ احتیاج کے باوجود ان سے ایک روپیا بھی نہیں مانگتے تھے۔ اس بیان میں اس بات کا اشارہ موجود ہے کہ تعلقات کی اس کشیدگی سے پہلے میر خان آرزو سے مالی امداد حاصل کرتے رہتے تھے۔

ذکرِ میر میں خان آرزو سے پڑھنے کے انکار، یا کم از کم عدم اقرار، کا مسئلہ خاص طور پر دلچسپ اور توجہ کا طالب ہے۔ بعض محققوں نے میر کی تردید کے طور پر دوسرے تذکرہ نگاروں کے اقتباس دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ خان آرزو کے شاگرد تھے۔ یہ تحصیل حاصل کے سوا کچھ نہیں۔ میر تو خود ہی اپنے تذکرے میں خان آرزو کو اپنا استاد کہہ چکے ہیں، پھر دوسرے تذکروں سے رجوع کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔

حقیقت یہ ہے کہ ذکرِ میر میں بھی میر نے خان آرزو سے تلمذ کا اعتراف کیا ہے، لیکن ان کے اسی اعتراف کو عدمِ اعتراف بلکہ انکار تک سمجھ لیا گیا۔ اس متفقہ اور متواتر غلط فہمی کی بنیاد دراصل میر کی متعلقہ عبارت میں ایک چھوٹے سے لفظ کا صحیح محل استعمال نظر انداز ہو جانے سے پڑی ہے۔ وہ عبارت یہ ہے:

> بہ دہلی رسیدم و منت ہاے بے منتہاے خالوے برادر کلاں، کہ سراج الدین علی خان آرزو باشد، کشیدم۔ یعنی چندے پیش او ماندم و کتابے چند از یارانِ شہر خواندم۔

اس عبارت کے فقرے ''کتابے چند از یارانِ شہر خواندم'' میں 'از' کو بمعنی 'سے' سمجھ کر اس کا مطلب یہ نکالا گیا ہے کہ میں نے یارانِ شہر سے کچھ کتابیں پڑھیں۔ درحالے کہ فارسی میں ایسے محل پر 'از' بمعنی

'سے' نہیں بلکہ بمعنیٰ 'کا، کی، کے' آتا ہے۔ مثلاً ''ذکر میر'' ہی میں صمصام الدولہ خواجہ باسط سے میر کے بارے میں پوچھتے ہیں ''ایں پسر از کیست'' (یہ لڑکا کس کا ہے) اور خواجہ باسط جواب دیتے ہیں ''از میر محمد علی است'' (میر محمد علی کا ہے)۔ میر نے ذکر میر میں اپنا یہ شعر نقل کیا ہے:

از ہر کہ سخن کردم، گفتند کہ ایں جانیست

از ہر کہ نشاں جستم، گفتند کہ پیدا نیست

(میں نے جس کی بات کی کہا گیا کہ وہ یہاں نہیں ہے، میں نے جس کا پتا پوچھا بتایا گیا کہ غائب ہے)

خود نکات الشعرا اور فارسی میں لکھے ہوئے دوسرے تذکروں میں کسی شاعر کے کلام کے اندراج سے پہلے ''از اوست'' کا فقرہ بہ کثرت ملتا ہے، جس کا مطلب ہوتا ہے کہ یہ اس شاعر کا کلام ہے۔ میر کی زیرِ بحث عبارت میں بھی ''کتابے چند از یارانِ شہر خواندم'' کا مطلب ہے ''میں نے یاران شہر کی کچھ کتابیں پڑھیں'' نہ کہ یاران شہر سے'۔ 8

کسی سے پڑھنے کے لیے ''از فلاں خواندن'' فارسی محاورے کے مطابق نہیں ہے۔ اس محل پر فارسی میں ''پیش از فلاں خواندن'' یا بہ خدمتِ/ در خدمتِ فلاں خواندن'' کہتے ہیں۔ ذکرِ میر میں امان اللہ سے قرآن پڑھنے کا ذکر میر نے ان لفظوں میں کیا ہے:

''روز و شب با او ماندم و قرآن شریف بہ خدمتِ اومی خواندم''

میر کے جملے ''پیش او ماندم و کتابے چند از یارانِ شہر خواندم'' میں فعل ''ماندم'' کی طرح ''خواندم'' بھی ''پیش او'' کا تابع ہے، یعنی ''پیش او (ماندم و) کتابے چند از یارانِ شہر خواندم'' اور اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ میں خان آرزو کے پاس رہا اور میں نے ان سے یارانِ شہر کی کچھ کتابیں پڑھیں۔

''یارانِ شہر'' سے بہ ظاہر مقامی مصنفین مراد ہیں اور اس تخصیص سے میر شاید یہ جتانا چاہتے

---

8 اردو میں بھی 'سے' بہ معنیٰ 'کا، کی، کے' کی مثالیں ملتی ہیں۔ نکات الشعرا میں یقین کے جس شعر سے میر نے اپنے شعر کو بہتر بتایا ہے اس کا پہلا مصرع ہے:

مجھے یہ بات خوش آئی ہے اک مجنونِ عریاں سے

(یعنی مجھے ایک مجنونِ عریاں کی یہ بات پسند آئی ہے۔)

Scanned with CamScanner

ہیں کہ انھوں نے خان آرزو سے کوئی خاص اہم کتابیں نہیں پڑھی تھیں۔ نکات الشعرا میں انھوں نے برسبیلِ تذکرہ خان آرزو کو اپنا استاد تو لکھا ہے لیکن اس سے یہ معلوم نہیں ہو پاتا کہ وہ شاعری میں میر کے استاد تھے یا درسیات میں۔ اس تذکرے میں خان آرزو کے اور خود اپنے احوال کے تحت میر نے استادی اور شاگردی کے رشتے کا ذکر نہیں کیا ہے۔ ذکرِ میر میں ان کے بیانات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خان آرزو سے کچھ کتابیں پڑھنے کے بعد جب حافظ محمد حسن کے خط کے زیرِ اثر آرزو کا رویہ بدلا تو تعلقات کی کشیدگی کے ساتھ تدریس کا یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ جس کے بعد میر نے ایک اور شخص (میر جعفر عظیم آبادی) سے پڑھنا شروع کیا۔ ان مرحلوں کے بعد اب وہ سعادت علی امروہوی کی تحریک سے اردو میں شاعری شروع کرتے ہیں۔ ان حالات میں اس کا امکان کم رہ جاتا ہے کہ وہ شاعری میں خان آرزو کے شاگرد ہوئے ہوں۔

بہر حال خان آرزو نے میر کو جو کچھ اور جتنا کچھ بھی پڑھایا اس کے نتیجے میں وہ بہ قولِ خود اس قابل ہوئے کہ کَس کے مخاطبِ صحیح ہو سکیں۔ اسی لیے میر نے شروع ہی میں لکھ دیا تھا کہ ''منت ہاے بے منتہاے... سراج الدین علی خان آرزو... کشیدم''۔ اب خواہ ان منت ہاے بے منتہا کا اعتراف بادلِ نخواستہ ہو، خواہ آرزو کے احسان اٹھانا انھیں بہت کھلا ہو، لیکن ذکرِ میر میں میر کے بیانات یہی بتاتے ہیں کہ اگرچہ بعد میں ان کو خان آرزو سے شکایتیں پیدا ہو گئی تھیں لیکن شروع میں یہی خان آرزو ان کے مربی بھی تھے، محسن بھی تھے، اور استاد بھی۔

❁❁

رجب علی بیگ سرور کے نثری اسالیب

مرزا رجب علی بیگ سرور کی باضابطہ نثر نویسی کا آغاز 1825 کے قریب فسانۂ عجائب کی تصنیف سے ہوتا ہے۔ یہ داستان اولاً انھوں نے ایک صحبت میں زبانی سنائی تھی۔ ان سے فرمائش کی گئی کہ اس داستان کو تحریر کردیں۔ اس مجوزہ تصنیف کے اسلوب اور زبان کے بارے میں انھیں ہدایت ہوئی کہ یہ ''لغت سے صاف ہو'' اور ''جو روزمرہ اور گفتگو ہماری تمھاری ہے، یہی ہو۔ ایسا نہ ہو کہ آپ رنگینی عبارت کے واسطے دقت طلبی اور نکتہ چینی کریں، ہم ہر فقرے کے معنی فرنگی محل کی گلیوں میں پوچھتے پھریں''۔ سرور کا دعویٰ ہے کہ کتاب لکھتے وقت انھوں نے اس ہدایت کا لحاظ رکھا، ''بلکہ نظرِ ثانی میں جو لفظ دقت طلب، غیر مستعمل، عربی فارسی کا مشکل تھا، اپنے نزدیک اسے دور کیا اور جو کلمہ سہل، محاورے کا تھا، رہنے دیا۔''

سرور کا یہ دعویٰ سو فیصد تو نہیں لیکن بڑی حد تک صحیح ہے اور فسانۂ عجائب کی نثر جا بہ جا اس دعوے کی تائید کرتی ہے، مثلاً:

''یہ سن کر وہ شرمندہ ہوئی۔ پھر لڑکا گھوڑے سے لپٹا۔ یہ بے چارہ نادان ان باتوں کا سود و زیاں کچھ نہ سمجھا۔ جو کچھ باپ نے سکھایا تھا کہنے لگا۔ جب کہہ چکا، شہزادی نے تپنچہ قبور سے کھینچ لڑکے پر جھونک دیا، دھم سے گر پڑا۔''

''اس وقت تو تا رنجیدہ دل، کبیدہ خاطر، مضمحل بیٹھا تھا، چپ ہو رہا۔ شہزادی نے پھر پوچھا۔ توتے نے بے اعتنائی سے کہا، ''ایسا ہی ہو۔'' یہ رنڈی، معشوق مزاج، طرہ یہ کہ شہزادے کی جورو، شوہر مالکِ تخت و تاج، برہم ہو کے بولی، ''میاں مٹھو، جینے سے خفا ہو جو ہمارے روبرو چبا چبا کر گفتگو کرتے ہو؟'' توتے نے کہا، ''سوال و جواب اور یہ دھمکانا

Scanned with CamScanner

اور حکومت سے ڈرانا، غصے کی آنکھ دکھانا اور ہے۔ کیوں الجھتی ہو، شاید تمھیں بچی ہو۔"

"انجمن آرا نے جادوگرنی کے قصے پر تاسف کیا، ملکہ کے مذکور پر بناوٹ سے ہنس دیا، پھر روکھی صورت بنائی، ناک بھوں سمیٹی، تیوری چڑھائی، مگر چلے آنے کے سہارے پر مسکرائی۔"

لیکن فسانۂ عجائب میں پر تکلف رنگین، انشا پردازانہ نثر کے نمونے بھی مل جاتے ہیں، خصوصاً داستان کے مختلف اجزا کی تمہید میں وہ "رنگینیِ عبارت کے واسطے دقت طلبی" کرتے نظر آتے ہیں۔

سرور نے داستان نویسی بھی کی، تاریخ نگاری بھی، ترجمے بھی کیے، خطوط بھی لکھے۔ موضوعات کی طرح ان کی نثر میں بھی تنوع ہے اور اسے مختلف اسالیب میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن سرور کے بارے میں ایک عمومی رائے یہ قائم ہوگئی ہے کہ وہ بہت پر تکلف، رنگین اور مصنوعی نثر لکھتے ہیں اور یہ ان کا واحد اسلوب ہے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد فسانۂ عجائب کے یہ تمہیدی فقرے نقل کرتے ہیں:

"گرہ کشایانِ سلسلۂ سخن و تازہ کنندگانِ فسانۂ کہن، یعنی محرّرانِ رنگیں تحریر و مورّخانِ جادو تقریر نے اشہبِ جہندۂ قلم کو میدانِ وسیع بیان میں با کرشمۂ سحر ساز و لطیفہ ہائے حیرت پرداز گرمِ عنان و جولان یوں کیا ہے۔۔۔"

پھر لکھتے ہیں، "جس انہماک کے ساتھ اس مصنوعی طرز کو فسانۂ عجائب میں شروع سے آخر تک برتا گیا ہے اس کی مثال اردو میں بہت کم ملے گی۔" (فنِ داستان گوئی)

❁

نثر کا وہ اسلوب جسے دقیق رنگین کا نام دیا گیا ہے، سرور کے یہاں کم کم نظر آتا ہے۔ ملا رضی کی فارسی داستان حدائق العشاق دقیق رنگین نثر میں ہے۔ سرور نے گلزارِ سرور کے نام سے اس کا اردو ترجمہ کیا تو دقیق رنگین کو سلیس رنگین سے بدل دیا۔ دیباچۂ حدائق العشاق کا انھوں نے جو لفظی ترجمہ کیا ہے اسے البتہ دقیق رنگین کہا جا سکتا ہے، اور اس کا انداز یہ ہے:

"نقش کرنے والا قلمِ شکستہ زبان سے، جاگنے والا اندھیری رات ناکامی کا، دلالۂ خامہ کی لکنت کرنے والی لسان سے، فسانہ پرداز جلسۂ بے سرانجامی کا، رضی پسرِ محمد شفیع، نقش اس

Scanned with CamScanner

مطلب کا لوحِ خاطرِ عاطر نقش بندوں پر کھینچ کے دکھاتا ہے، اور معشوقِ دلفریبِ مدعا کو زیورِ تقریر سے آراستہ کر کے نظر بازوں کے پیشِ چشم لاتا ہے۔ جس رات اس پائمالِ رنج والم اور تختۂ مشقِ درد وغم کے وجودِ بے بود کا ستارہ مشرقِ عمر سے چمکا اور نیرِ حیاتِ بے ثبات اس رہ نوردِ بادیۂ حسرت والم کا مطلعِ ایجاد پر نبضِ علیل کی طرح دھمکا، گردونِ گرداں گردش سے معذور، سپہرِ نیلی سائباں حرکت سے ساکت، مجبور تھا۔" (ص 2)

واقعات کی تمہید، صبح اور رات کے بیان میں سرور نسبتاً زیادہ رنگین عبارت لکھتے ہیں، لیکن یہ عبارت بھی سلیس رنگینی کی طرف مائل رہتی ہے۔ سرور کا عمومی اسلوب اگرچہ انشا پردازانہ ہے لیکن یہ انشا پردازی زیادہ تر ہم قافیہ جملوں اور کچھ لفظی رعایتوں، خصوصاً ایہام، کے استعمال تک محدود رہتی ہے۔ طولِ کلام، جو عبارت میں قافیوں کے التزام کی وجہ سے اکثر پیدا ہو جاتا ہے، اس سے سرور دامن بچاتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ ان کی عبارت کے فقرے ہم قافیہ تو ہوں لیکن ہم معنی نہ ہوں اور ان کا مفہوم آگے بڑھتا رہے۔ مثلاً ایک کتاب کے فقروں میں انھوں نے یہ قافیے استعمال کیے ہیں:

"کیا ہے"/"آیا ہے"، "دیا"/"تھا"، "کہا"/"دیکھا"، "گیا"/"کیا"، "چاہو"، "دو"

اتنے قافیوں کے التزام کے ساتھ لکھی جانے والی وہ مختصر عبارت یہ ہے:

"ایک روز ملکہ زمانی کے محل میں حضرت تشریف فرما ہوے۔ ایک رقعہ ہاتھ میں تھا، انھوں نے پوچھا، مرزا ہاتھ میں یہ کیا ہے۔ فرمایا، بچاسی لاکھ روپیہ فیض آباد سے آیا ہے۔ انھوں نے کہا، مجھے دو۔ یہ سنتے ہی رقعہ ہاتھ سے پھینک دیا، گویا بڑا بوجھ تھا۔ قدسیہ محل نے کہا، اشرفیوں کا ڈھیر نہیں دیکھا۔ فوراً محل میں انبار ہو گیا۔ ارشاد کیا، لطف اگر دیکھا چاہو تو لٹا دو۔" (فسانۂ عبرت، ص 13)

ایک اور مقفیٰ عبارت دیکھیے:

"اب صبح کو جب ہم گردن مارے جائیں گے تب سو روپے تمھارے ہاتھ آئیں گے۔ خونِ بے گناہ کی جزا حشر کو پاؤ گی۔ بیکنٹھ چھوڑ نرک میں جاؤ گی۔ پیسہ روپیہ ہاتھ کا میل ہے، اس پر جو میل کرتی ہو، کتنے دن کھاؤ گی؟ کلنک کا ٹیکہ ہے، دھبا اس کا جیتے جی نہ چھوٹے گا، دھوتے دھوتے گھر بہاؤ گی۔ اگر ہمارے حال پر رحم کرو، خدا اور کوئی صورت

کرے گا۔ سو روپے کے بدلے تمھارا گھر اشرفیوں سے بھرے گا۔" (فسانۂ عجائب، ص 207)

❁

شبستانِ سرور میں سرور نے الف لیلہ کی داستانوں کو اپنے طور پر لکھا ہے۔ صبح اور رات کے ذکر میں وہ روایتی رنگین بیانی اور قصے کے حسبِ حال حسنِ تعلیل سے کام لیتے ہیں، لیکن اصل قصے کے بیان میں سادگی اور اختصار کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ دو مثالیں دیکھیے:

"میرا باپ تاجروں میں بہت گرامی، بڑا نامی تھا۔ بغداد وطن ہے، وہیں آج تک مسکن ہے۔ میری ولادت ہارون رشید کی خلافت میں ہوئی۔ باپ میرا پیشۂ تجارت میں مسرفِ فضول تھا، صَرف بے جا، نامعقول تھا۔ جب دنیا سے کوچ کیا، ترکے میں قرض ہاتھ آیا۔ بہت گھبرایا۔ لیکن بڑی دقت سے رفتہ رفتہ قرض خواہوں سے نجات پائی۔ بہ فضلِ خدا تھوڑے کام میں بڑی برکت ہوئی کہ بہ خوبی روٹی کھائی۔" (ص 129)

"دفعتاً دو چڑیاں لڑتی ہوئی ایک ٹہنی پر آ بیٹھیں۔ ایک تو گر کر زمین پر مر گئی، دوسری اُڑ کے خدا جانے کدھر گئی۔ تھوڑی دیر میں دو اور آئیں۔ قد و قامت میں ان سے بڑی تھیں۔ جس جگہ وہ چڑیا مردہ پڑی تھی وہاں کی زمین چونچ سے کھود کر اس کو تہہِ خاک کیا، پھر اُڑ گئیں۔ یہ حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ وہ پھر آئیں اور پہلی چڑیا جو قاتل تھی اس کو پکڑ لائیں۔ دونوں نے اس کے پر نوچے، پھر جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دیے۔ شہزادہ قمر الزماں اس بے جان چڑیا کے پاس آیا، پر تو سب نُچے تھے، معدے میں کچھ سرخ سرخ نظر آیا۔ اس نے پوٹا چیر کے دیکھا تو وہی تختی تھی جس کو جانور اس کے ہاتھ سے لے گیا تھا۔" (ص 191)

اودھ کے بادشاہ محمد علی شاہ کے عہد میں وزارت کا کام کرنے والے پانچ افراد کا بیان سرور نے فسانۂ عبرت میں اس طرح کر دیا ہے:

"محمد علی شاہ کے زمانے میں پہلے نواب روشن الدولہ بہادر کچھ دن وزیر رہے، پھر یہ اندھیر

Scanned with CamScanner

ہوا کہ نواب منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خان بہادر کے زیر دست ہوئے، جور ہے۔ کئی مہینے نواب منتظم الدولہ بہادر نے زور شور سے وزارت کی، مگر حسرت نہ کھلنے پائی کہ قضا آئی۔ پھر نواب ظہیر الدولہ غلام یحییٰ خان بہادر کی باری ہوئی۔ یہ عہدہ پیام مرگ تھا۔ چندے قیام نہ ہوا۔ کوچ کی تیاری ہوئی۔ بعد نواب منور الدولہ احمد علی خان بہادر اس خدمت پر مامور ہوئے، مگر اس عہدے سے عہدہ برآ نہ ہوئے، رخنے پڑے، فتور ہوئے۔ جس دم استعفیٰ دے کر جج و زیارت کو وہ راہی ہوئے، نواب شرف الدولہ بہادر پیش دست ہو کے محلِ اعتبارِ بادشاہی ہوئے۔"

❁

انشائیہ نثر بالعموم تاثراتی ہوتی ہے۔ سرور کی نثر کے جو اقتباس اوپر پیش کیے گئے ہیں اگرچہ ان میں سے کچھ تاثراتی انداز سے خالی ہیں، لیکن زیادہ تر سرور بیان میں اپنے تاثرات اور جذباتی ردِ عمل کا اظہار کرتے چلتے ہیں۔ تاریخ نویسی میں بھی وہ اس روش کو برقرار رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر فسانۂ عبرت کے وہ مقامات پیش کیے جاتے ہیں جہاں سرور ایک بادشاہ کی موت اور دوسرے کی تخت نشینی کا ذکر کرتے ہیں:

1۔ [نصیر الدین حیدر/محمد علی شاہ] "تیسری ربیع الثانی 1253ھ مطابق 1837ء جمعے کو چار گھڑی رات رہے یہ حادثۂ غم انجام ظہور میں آیا۔ فلک نے روزِ سیاہ دکھایا۔ سبحان اللہ، دن کو سلطنت، جہان کی حکومت تھی، شب کو گور میسر نہ ہوئی، تنہا نعش پڑی رہی۔ پھر ابوالفتح نصیر الدولہ محمد علی شاہ اورنگ نشین کامرانی، اریکہ آرائے بزمِ سلطانی ہوئے۔ جو روتے تھے، مصروفِ شادمانی ہوئے۔ وزیر، امیر، رئیس، سپہ سالار، اہلِ دربار حاضر ہوئے۔ مراتب بہ مراتب نذریں دیں۔ کچھ خلعتِ ضروری اسی وقت عنایت ہوئے، باقی حوالۂ فردا کیے . . .

وقتِ نصف النہار جنازہ اس مقتولِ فرقۂ جہول کا تیار ہوا۔ بہ صد تجمل و شان تابوتِ نعش اٹھایا گیا . . . آخر اس کشتۂ دغا، غلامِ باوفائے سید الشہداؑ کو روضۂ ابا عبد اللہ

الحسینؑ کی غلام گردش میں دفن کیا۔ سب نے اپنے اپنے گھر کا رستہ لیا۔''

2۔ (محمد علی شاہ/ امجد علی شاہ) ''4 ربیع الثانی، دوشنبہ، 1258ھ کچھ رات باقی تھی کہ داعیِ اجل کو لبیک کہہ کے فردوسِ بریں کی راہ لی۔ دل کی دل میں رہی۔ ... 5 ربیع الثانی سہ شنبے کو بعد نمازِ صبح ثریا جاہ محمد امجد علی شاہ ولی عہد بہادر تخت نشین ہوئے، جلوس کیا۔ خالق نے صاحبِ نقارہ وکوس کیا۔ منادی نے ندا دی۔ دہائی امجد علی شاہ بادشاہ کی۔ گز سکے پر نام ہوا۔ درِ دولت پر ملازموں کا ازدحام ہوا... سبحان اللہ، کہیں کافور وکفن، غسال وگورکن، کہیں خلعت پہنے کوئی خندہ زن، یہاں تخت، وہاں تختہ... اِدھر نذریں گذریں، ناچ ہونے لگا، اُدھر ٹھیک دوپہر کو جنازہ اٹھا۔''

3۔ (امجد علی شاہ/ واجد علی شاہ) ''چھبیسویں ماہ صفر 1263ھ، شنبے کو دنیا سے سفر ہوا۔ اڑتالیس سال، پانچ مہینے، بارہ دن عمر کے گذرے تھے۔ وقتِ عصر سرائے ہستی سے کوچ کا نقارہ ہوا... پہر رات گئے مرزا ولی عہد بہادر واجد علی شاہ مالکِ تخت وتاج ہوئے، وہ زیرِ خاک فاتحے کو محتاج ہوئے، ستائیسویں صفر... دوپہر دن ڈھلے جنازہ اٹھایا... کسی کو فرح بخش [1] دل کشا [2] ملی، تخت اور خزانہ پایا، خود بدولت نے مینڈو خاں کی لین میں اصطبل پسند کر کے مقبرہ بنوایا۔''

❄

شگفتگی اور چلبلا پن سرور کی نثر کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے اور جب وہ طنز ومزاح یا ہجونگاری پر آتے ہیں تو ان کے قلم میں شوخی کے ساتھ عجب کاٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ نثر کا یہ اسلوب سرور سے پہلے اردو میں بہت کم نظر آتا ہے۔ خصوصاً فسانۂ عبرت میں سرور کا یہ رنگ بہت تیز ہے۔ عہدِ امجد علی شاہ کی بدعنوانیوں اور بدانتظامیوں کا جو بیان انھوں نے کیا ہے وہ مزاحیہ ادب کے عمدہ نمونوں میں رکھا جا سکتا ہے۔ اس عہد میں سرور کی ملازمت جاتی رہی تھی اس لیے ان کو غصہ زیادہ تھا اور انھوں نے مبالغے سے بھی خوب کام لیا ہے، لیکن سیاسی، سماجی، انتظامی خلفشار اور ابتلائے عام کا

1,2 فرح بخش، دل کشا: لکھنؤ کی شاہی کوٹھیاں۔

ایسا مرقع کم از کم سرور کے وقت تک اردو نثر میں اور کہیں نظر نہیں آتا۔ انشائی تکلفات اور نثرِ رنگین کے لوازم کے باوجود اس نثری شہر آشوب میں عجب بے ساختگی اور آمد کی کیفیت ہے۔ یہ بیان خاصا طویل ہے۔ چند ٹکڑے دیکھیے:

''حکومت ظنّی، نیا طور ہوا۔ اس دورے میں رنڈیوں کا دور ہوا۔ ایسی ہوا بگڑی، قوتِ ممیزہ شہر سے لٹ گئی۔ کسی کی ماں نے رسالہ نہ چھوڑا، بیٹا رسالدار ہوا۔ کسی کی بہن نے پلٹن سے منھ نہ موڑا، سالا سالار ہوا۔''

''یہ رسم قدیم تھی، جس کا جو عہدہ ہوتا وہی پاتا تھا۔ لئیق، کار آزمودہ ڈھونڈھا جاتا تھا۔ عالی خاندان، والا دودمان جو لوگ ہیں ان کو تلاش کر کے بلاتے تھے... اب تو یہ خلطِ مبحث ہوا، خیاط کو نیزہ بازوں کا سالار کیا، جمع دیکھ کر بہ صد پریشانی جمعدار کیا۔ جو چھچھوندر چھوڑنے میں جی چھوڑتے تھے، چنگاری سمجھ کے جگنو سے منھ موڑتے تھے، اب جو ایک آدھ پھلجھڑی سی پٹاخا تیار کر کے محل میں چھوڑی، آتش خانے کے داروغہ ہوے۔''

''گیدڑوں نے دیماسِ شیر گھیر لیا۔ غیرت نے منھ پھیر لیا۔ ایک کو دوسرے سے کینہ ہوا، کنجشک کے پنجے سے باز کا زخمی سینہ ہوا۔ شاہین کبوتر کے جور سے حاملِ رنج و محن ہوا۔ لٹورا سیمرغ پر طعنہ زن ہوا۔ زاغ شب گرد کے مقابلے میں بد دماغ ہوا، آنکھ دکھانے لگا۔ پدا بلبلِ بُستاں کو آوازے سنانے لگا۔''

''اس سرکار کی کیا توقیر ہو جس کا لندنی سفیر ہو۔ جب منھ کھولا انگریزی ہانک بولا۔ نہ جرأتِ تقریر نہ لیاقتِ تحریر، مردِ پیر، دامِ حرص میں اسیر۔ منھ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ مکھڑے کی قطع کیا کہوں، جیسے اودھی کی چوں چوں۔''

''عجب سرکار لاابالی ہے۔ ہزبرِ نیستاں فرطِ ضعف سے شیرِ قالی ہے۔ ایسا ناطاقتی نے گھیرا ہے کہ جب بکری سے مٹھ بھیڑ ہوئی ہے، بزدلی سے منھ پھیرا ہے۔ دبی بلّی کی طرح کٹہروں سے جھانکتے ہیں۔ اللہ اللہ، شیروں کی اس عصر میں یہ معاش ہے کہ جوار پھانکتے ہیں۔''

''اصطبل کا یہ حال ہے، گھوڑوں کو زندگی وبال ہے۔ رات دن ٹاپتے ہیں، خاک

Scanned with CamScanner

اُڑاتے ہیں۔ مٹی کے گھوڑے نظر آتے ہیں۔ ٹوٹا خرخرہ، پھٹی پرانی بنتی ہے۔ ہاتھ لگانے میں دو دو سے دولتی ہے۔ چاندنی ہے یا اندھیرا ہے، ہر دم گنجڑوں کا پھیرا ہے۔ سائیس ہاں ہاں کر کے غل مچاتے ہیں، وہ کھینچے لیے جاتے ہیں۔ زندے مردے کا فیصلہ تب ہوتا ہے جب سالوتری سرکار سے طلب ہوتا ہے۔''

''جب سوار پرا جماتے ہیں تو دیکھنے والے پھبتیاں سناتے ہیں کہ وہ انگریزی گنہگار لوہے کے پنجرے میں نظر آتے ہیں۔ اگر بازار میں نکلتے ہیں تو لڑکے اچھلتے ہیں، گود میں لینے کو ہاتھ بڑھاتے ہیں، مٹی کا کھلونا سمجھ کے مچل جاتے ہیں۔''

''عدالت میں روبہ بازی ہے، سب سے زیادہ اندھیر ہے، دربان جو کتا مشہور ہے، وہ بھی شیر ہے۔ داروغہ خود متلاشی ہے کہ کون سے مقدمے والا راشی ہے۔''

''جائزہ نویس کے ہاتھ سے سوار پیادے پر جور و ستم ہے، سب کا ناک میں دم ہے۔ جب تک اس کے واسطے کچھ مقرر نہ کر دو، سامنے کھڑے ہیں مگر کہتا ہے غیر حاضر ہو۔''

❋

اسلوبِ نثر کے لحاظ سے (اور معلومات کے لحاظ سے بھی) فسانۂ عبرت کو سرور کی اہم ترین تصنیف کہا جا سکتا ہے۔ اس کتاب میں سرور کی بیانیہ نثر کے جوہر کھلتے ہیں اور ان کے عہد کے لکھنؤ کی بہت سی متحرک تصویریں ہماری نگاہوں کے سامنے آ جاتی ہیں۔ حسین آباد کے گذری بازار کا بیان منظر آفرینی میں فسانۂ عجائب کے مشہور بیانِ لکھنؤ سے زیادہ جان دار ہے۔ اس بیان کا ایک حصہ دیکھیے:

''کسی جا سن رسیدہ عورتیں برقع پوش، کرتی، ازار بند، گڑیاں، پنچکیں لیے موجود... ایک طرف میوہ فروشوں کی صدا؛ کہیں سقوں کے کٹوروں کا کھنکنا، گرمی کی فصل میں فالودے والے غل مچاتے ہیں۔ بےفکرے برف کی قلفیاں کھاتے کھلاتے ہیں۔ کسی جگہ کوپ کے گھڑوں میں فرید کی گھانس، گرد اس کے مفلسوں کی ٹھنڈی سانس، بانس گڑا، نٹ سر پر

Scanned with CamScanner

گھڑا لے کے چڑھا، کوئی سانپ اور نیولا لڑانے کو بڑھا۔ ایک جا قصہ خوان، حمزہ وعمرو کی داستان۔ نقال جدا نیفہ کھونسے مسخراپن کرتے ہیں۔ ہر ایک پیٹ کی خاطر ظاہر اپنا اپنا فن کرتے ہیں۔ کہیں لونگ چڑے والے؛ دال موٹھ کے خوانچوں پر جوبن نرالے؛ ایک طرف مچھلی کے پھڑ پھڑاتے کباب، ان کی ماہیت کے جملے بے حساب... بزازوں کی دکانیں جدا، بنارس، ڈھاکا، چین، گجرات کا ریزہ۔ کم مایہ اپنا بقچہ گٹھری لے کے گزی، گاڑھا، سوسی، دھوتر کا بیوپار کرتے ہیں، دلال اکوائی، چھپّے، کٹوارے کی تکرار کرتے ہیں۔''

❊

سرور کے اسلوبِ نثر کے سلسلے میں ان کے خطوں کا جائزہ علیحدہ مضمون کا طالب ہے۔ یہاں صرف چند باتوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے:

سرور خطوں میں بہت زیادہ رنگینی اور انشا پردازی کے قائل نہیں تھے۔ مہاراجا بنارس کے ایک خط کے جواب میں انھوں نے اولاً اس خط کے لکھنے والے انشا پرداز کو ''تحریرِ منشیانہ'' کی مدح نما ہجو لکھی، پھر لکھا، ''بہ یک نگاہ مضمون کا حاصل ذہن میں نہ آیا، سبحان اللہ! بہ غور غواصی کر کے مدعا نکال لایا۔ مطلب سمجھا۔'' خود سرور کے خطوں میں ادبی چاشنی کے ساتھ کچھ بول چال کا سا انداز ضرور جھلکتا ہے، خواہ ان کا مکتوب الیہ کوئی عالی مرتبت شخص ہی کیوں نہ ہو۔ واجد علی شاہ کے کلکتے چلے جانے کے بعد سرور نے ان کو ایک خط میں لکھنؤ کی خرابی کا حال لکھا۔ اس خط کے چند فقرے جن میں بادشاہ کی کوٹھی فرح بخش کی حالت لکھی ہے، درج ذیل ہیں:

''خدا کسی کو۔ بے وارث ووالی نہ کرے، مالک سے مکان کو خالی نہ کرے، فرح بخش سخت دل تنگ ہے، بے مکین مکان کا عجب رنگ ہے... طالع اس کا شوم ہوا، ہمانے منھ پھیرا، نحوست نے گھیرا، مسکن زاغ و بوم ہوا، طاقوں میں توتے، کانسوں پر کوّے، منڈیروں پر مینا، برجوں میں ابابیل، چھت پر چیلیں ہیں۔ ویرانے پن کی دلیلیں ہیں۔''

انشاے سرور کے کچھ خطوں میں سرور نے ایسا بے تکلف اور رواں اسلوب اختیار کیا ہے

Scanned with CamScanner

کہ غالب کی طرح مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے، مثلاً:

''قبلۂ بندہ، تسلیم بجالاتا ہوں۔ جو کام نیا کرتا ہوں اس کی داد پاتا ہوں۔ آپ کی پوسٹ ماسٹر تک رسائی ہے، میں نے ہرکاروں سے رسم بڑھائی ہے۔ گو ہم پلہ نہیں، کم ہوں، مگر قدم بہ قدم ہوں۔''

یا: ''کیوں حضرت، ہم کیا پوچھتے ہیں، آپ کیا فرماتے ہیں۔ مزاج کا حال چھپاتے ہیں، منضج کا حال، مسہل کا مآل، پھنسی پھوڑوں کا، بہت متھوڑوں کا احوال تو نہ لکھا، ہندو مسلمان کا بکھیڑا چھیڑا۔''

ان خطوں پر بیک نظر غالب کے خطوں کا دھوکا ہوتا ہے، اور یہ بات بڑی معنی خیز ہے کہ سرور کے یہ خط غالب ہی کے نام کے ہیں۔[4] غالب نے سرور کو جو خط لکھے تھے ان کا سراغ ابھی تک نہیں ملا ہے لیکن یقین کیا جا سکتا ہے کہ وہ غالب کے مخصوص مکالماتی اسلوب کے خط ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ سرور کے خطوں پر غالب کے اس اسلوب کا بڑا اثر پڑا ہے اور ان خطوں میں وہی لطف ہے جو ان دونوں ادبی اکابر کی روبہ رو گفتگو میں ہوتا ہوگا۔ سرور کی گردن کی رگ تن گئی تھی، غالب نے اس کا حال پوچھا اور تکیہ دھوپ میں گرم کر کے اس سے سنکائی کرنے کا مشورہ دیا تو سرور نے ''گردن'' کی رعایت سے ''سر'' اور ''گلوگیر'' اور ''تکیہ'' کی رعایت سے خود کو ''فقیر'' لکھتے ہوئے جواب دیا:

''... گردن کے درد کا آپ حال پوچھتے ہیں، اس کا سر کھلتا نہیں کیا ہے، عجب گلوگیر عارضہ ہو گیا ہے۔ آپ کے فرمانے سے تکیہ فقیر نے دھوپ میں رکھا۔ تکیہ تو اہوا، غلاف جلا، فائدہ متصور نہ ہوا، خلاف جلا... گردن ہے اور ہر دم نیا تیل ہے۔ فائدہ بخیر، مگر کھیل ہے۔ گردن ناپی تو نہیں مگر ہر روز ملی جاتی ہے، اتنی چھیڑ چلی جاتی ہے۔''

سرور کے دریافت کرنے پر غالب نے انھیں اپنی پھنسیوں اور منضج مسہل کا احوال لکھا تو سرور

---

4 اس انکشاف کا سہرا ڈاکٹر کاظم علی خاں کے سر ہے جنھوں نے اندرونی شواہد اور دوسرے قرائن کی مدد سے بہت اطمینان بخش طور پر ثابت کر دیا ہے کہ سرور کے یہ خط غالب کے نام ہیں۔ (دیکھیے مضمون ''غالب اور مرزا رجب علی بیگ سرور'' مشمولہ کتاب خطوط غالب کا تحقیقی مطالعہ از کاظم علی خاں، ناشر کتاب نگر لکھنؤ، 1981)

Scanned with CamScanner

نے دلچسپ انداز میں اسے ان کی جوانی کی رنگینیوں کا شاخسانہ ٹھہرایا۔ لکھتے ہیں:

''نصیبِ اعدا مزاج کی بدمزگی کا حال، پھنسیوں کی ایذا کا ملال، تیرہ منضج کا ہونا، مسہل کی خبر سن کر طبیعت پریشان ہوئی۔ مسہل سے زیادہ مصیبت دنیا میں اور نہیں۔ اس کا بھگونا، بنانا، پینا، کیا ستم و جور نہیں۔ جوانی کا قصہ بڑھاپے میں فیصلہ ہوتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان دنوں اور کیا ہوتا ہے۔''

❈

اس گفتگو سے (جس میں عمداً اقتباسات زیادہ رکھے گئے ہیں) رجب علی بیگ سرور کی نثر کے تنوع کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے۔ ہماری بیشتر تنقید نے سرور کے ساتھ کچھ یک طرفہ سا رویہ اختیار کر رکھا ہے اور ان کی نثر کو بے لطف، پر تکلف اور از کار رفتہ قرار دے کر قریب قریب مسترد کر دیا ہے۔ اپنے کلاسیکی سرمائے کے ساتھ یہ سلوک مناسب نہیں ہے اور ہماری ادبی اور تخلیقی نثر کی تاریخ میں سرور زیادہ توجہ اور ہمدردانہ مطالعے کا تقاضا کرتے ہیں۔

❈❈

Scanned with CamScanner

توبۃ النصوح منظوم

اردو کے نثری متون کو منظوم کرنا ہماری ادبی روایت میں شامل رہا ہے۔ گاہ گاہ شعری متون کو نثر بھی کیا گیا ہے، مثلاً بہادر علی حسینی نے مثنوی میر حسن کو نثرِ بے نظیر کے نام سے نثر میں لکھا، لیکن نثری متون کو نظم کرنے کی مثالیں بہت ہیں۔ فسانہ عجائب کو شاید اردو میں سب سے زیادہ نظم کیا گیا۔ ہمارے علم میں اس کے مندرجۂ ذیل منظوم ایڈیشن آ چکے ہیں:

1۔ ترانۂ غرائب (شفاعت اللہ بدایونی) 2۔ ترانۂ عجائب (کریم الدین کریم بریلوی) 3۔ فسانۂ عجائب منظوم (بھولا ناتھ فارغ) 4۔ باغ فردوس (ولایت علی فردوس جائسی) 5۔ فسانۂ عجائب منظوم (ماتا پرشاد نیساں لکھنوی) 6۔ فسانۂ عجائب منظوم (مرزا حامد حسین حامد لکھنوی) 7۔ فسانۂ عجائب ناٹک معروف بہ جان عالم و انجمن آرا (مرزا نظیر بیگ اکبرآبادی) 8۔ فسانۂ عجائب منظوم (سید باقر حسین جمیل) 9۔ مثنوی فسانۂ عجائب فارسی (شاہ عزیز اللہ عزیز صفی پوری)

الف لیلہ، باغ و بہار وغیرہ کے بھی منظوم ترجمے ہوئے، لیکن بیسویں صدی میں یہ روایت ختم ہونے لگی، البتہ ایک اہم نثری تصنیف کو بیسویں صدی میں بھی منظوم کیا گیا۔

سید امیر حسن فروغ لکھنوی مرزا محمد جعفر اوج (فرزندِ مرزا دبیر) اور میر بادشاہ علی بقا (فرزندِ میر وزیر علی صبا) کے شاگرد اور حیدرآباد میں ہائی کورٹ کے وکیل تھے۔ انھوں نے 27-1326ھ (09-1908ء) میں نذیر احمد کے ناول توبۃ النصوح کو مثنوی کی ہیئت میں نظم کیا اور اس کا تاریخی نام مفادِ آخرت رکھا۔ یہ 1918 میں یا اس سے قبل مولوی غلام عباس، مہتمم امامیہ جنرل بک ایجنسی، لاہور، کے زیرِ نگرانی جارج اسٹیم پریس میں ایڈورڈ اس منیجر کے اہتمام سے چھپی۔

Scanned with CamScanner

یہ مثنوی فروغ کو باکمال نظم نگار ثابت کرتی ہے۔ انھوں نے نظم میں بھی بڑی حد تک نذیر احمد کی زبان اور اسلوب کو قائم رکھا ہے۔ اس لحاظ سے، اور اس سے زیادہ اس حیثیت سے کہ یہ کسی اردو ناول کا پہلا اور شاید واحد منظوم روپ ہے، اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

فروغ نے کہیں کہیں اصل سے انحراف بھی کیا ہے۔ بعض مقامات کو مختصر طور پر نظم کیا ہے۔ شروع میں مثنویوں کی روایت کی پیروی میں حمد ونعت ومنقبت کا اضافہ کر دیا ہے اور سب سے بڑا انحراف یہ ہے کہ نصوح کے منجھلے بیٹے علیم کے قصے میں عیسائی پادری کے اہم کردار کو ایک ثقہ مسلمان کے کردار سے بدل دیا ہے، جو بچوں کو مذہبی تعلیم دیتا ہے۔

توبۃ النصوح کے کچھ مقام اور ان کی منظوم شکل حسب ذیل ہے:

1

فصل چہارم: نصوح کا چھوٹا بیٹا سلیم اسے حضرت بی اور اس کے نواسوں کے ذکر میں بتاتا ہے:

نذیر احمد: ''جناب، حضرت بی نے ایک مرتبہ مجھ کو بہ تاکید کہا تھا کہ تم اپنے سر کے بال منڈوا ڈالو۔ اگرچہ مجھ کو بال بہت عزیز تھے اور میں ان کی خدمت بھی بہت کرتا تھا لیکن چونکہ مجھ کو یقین تھا کہ حضرت بی جو بات کہتی ہیں ضرور میری منفعت کے واسطے کہتی ہیں، میں نے کہا، بہت خوب۔ حضرت بی نے اور تو کچھ سبب نہیں بیان کیا مگر اتنا کہا کہ بالوں کی بزرگ داشت میں تمھارا بہت سا وقت صرف ہوتا ہے اور وقت ایسی چیز نہیں ہے کہ اس کو ایسی فضول باتوں میں صرف کیا جائے، اور تم کو بڑے بال رکھنے کی کچھ ضرورت بھی نہیں ہے۔ اگلے دن جو حجام بڑے بھائی کا خط بنانے آیا میں نے اس سے کہا کہ خلیفہ میرے بال بھی مونڈ دینا۔ بالوں کا مونڈنا سن کر بڑے بھائی اس قدر خفا ہوئے کہ میں عرض نہیں کر سکتا۔ مجھ کو جو چاہتے کہہ لیتے، حضرت بی اور ان کے نواسوں کو بہت ہی برا بھلا کہا۔'' یہ کہہ کر سلیم کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

باپ: تمھارے بڑے بھائی سے اور حضرت بی سے کیا واسطہ، اور ان کو تمھارے افعال میں میرے ہوتے کیا دخل؟

Scanned with CamScanner

بیٹا: جناب، نہیں معلوم ان کو کس طرح معلوم ہو گیا تھا کہ میں ان کے گھر آتا جاتا ہوں۔ دو ایک مرتبہ مجھ سے پہلے بھی کہا تھا کہ تو ان مردہ شوقلاؤزیوں کے ساتھ اکثر رہتا ہے، کیا تو بھی ملاّ نا اور مسجد کا ٹکڑگدا بنے گا؟ اس دن بالوں پر کہنے لگے کہ دیکھا، آخر ان نابکاروں کی صحبت کا یہ اثر ہوا کہ آپ اچھے خاصے سر کو چھلا ہوا کسیرو بنانے چلے ہیں کہ دیکھتے ہی ہتھیلی کھجلائے، چانٹا مارنے کو جی چاہے۔ اب اکیلے سر منڈانے سے کیا ہوتا ہے، گھٹنوں تک کا کرتہ پہن، ٹخنوں تک کا پائجامہ بنا۔

فروغ:

بولی اک دن وہ مجھ سے نیک خصال — کیوں بڑھائے ہیں تم نے سر کے بال
ہے جو ان کی نگاہ داشت زیاد — وقت ہوتا ہے مفت میں برباد
تھے مجھے گو عزیز بال بہت — تھا مگر ان کا بھی خیال بہت
مجھ سے کہتی ہیں جو وہ نیک صفات — ہوتی ہے میرے فائدے کی بات
دوسرے روز آیا جب نائی — خط جو بنوا چکے بڑے بھائی
میں یہ بولا ذرا خلیفہ جی — مونڈتے جاؤ بال میرے بھی
بھائی صاحبؑ نے جو یہ سن پایا — کیا کہوں غیظ کس قدر آیا
مجھ کو جو کچھ کہا غم اس کا نہیں — گالیاں ان معظمہ کو بھی دیں
کچھ نہ ان کے نواسوں کی تھی خطا — پر بُرا اور بھلا انھیں بھی کہا
کہہ کے یہ اشک پھر ہوے جاری — ہوئی رقت سلیم پر طاری

باپ: یہ بتاؤ بھلا کلیم کو کیا — واسطہ ان معظمہ سے تھا؟
غصہ کرنے کا بے محل تم پر — میرے ہوتے انھیں تھا حق کیونکر؟

بیٹا: وہ کسی طرح پا گئے تھے خبر — آنا جانا ہے میرا ان کے گھر
مجھ سے پہلے بھی وہ یہ کہتے تھے — نہ ملا کر تو قل اعوذیوں سے
دوستی سے ہے ان کی فائدہ کیا — کیا بنے گا ٹکڑگدا مُلا؟
بولے اس روز پھر تو بالوں پر — ہوا صحبت کا آخر اُن کی اثر
اچھا خاصا ہے سر بنانے چلے — ہو کسیرو چھلا بھنا جیسے

Scanned with CamScanner

تاکوئی چانٹا مارنے آئے دیکھتے ہی ہتھیلی کھجلائے
ہوگا اک سر منڈانے میں اب کیا ڈھیلا گرتا تو پہلے کوئی بنا

2

فصل ہشتم: نصوح کی بیٹی نعیمہ گھر والوں سے خفا ہوگئی ہے۔ اس کی خالہ زاد بہن صالحہ اسے منانے کے لیے آئی ہے اور دونوں میں باتیں ہوتی ہیں۔

نذیر احمد:

نعیمہ: آگ لگے اس نماز کو۔ یہ اب گھر میں کسی کو تھوڑا ہی رہنے دے گی۔ یہ تو حمیدہ کے سوائے سبھی کو نکلوائے گی۔

صالحہ: تو کیا آپا تم بڑے بھائی ہی کے واسطے پڑی رو رہی تھیں؟

نعیمہ: مجھ کو تو بے چارے بڑے بھائی کی خبر بھی نہیں۔ ان سے پہلے میں آپ نکلنے کو بیٹھی ہوں۔

صالحہ: توبہ آپا، توبہ۔ کیسی بد فال منھ سے نکالتی ہو کہ خدا پناہ میں رکھے۔ اللہ نہ کرے کہ کسی بھلے مانس اشراف کی بہو بیٹی گھر سے نکلے۔

نعیمہ: جب سے اس نماز روزے کا چرچا ہمارے گھر میں ہوا ہے بھل منساہت اور شرافت سب گئی گذری ہوئی۔ اب آئی ہو تو دو چار دن رہ کر ہر ایک کا رنگ ڈھنگ دیکھنا۔ نہ وہ زمین رہی نہ وہ آسمان۔ گھر کا باوا آدم ہی کچھ بدل سا گیا ہے۔ نہ وہ ہنسی ہے، نہ وہ دل لگی ہے، نہ وہ چرچے ہیں، نہ وہ مذاق ہے، نہ چہچہے ہیں۔ گھر میں ایک اداسی چھائی رہتی ہے، ورنہ ابھی ایک مہینے کا مذکور ہے کہ محلے کی عورتیں تمام تمام دن بھری رہتی تھیں۔ کوئی گیت گا رہی ہے، کوئی کہانی کہہ رہی ہے۔ یہ ہمسائی عجوبہ کچھ اس طرح کی زندہ دل ہیں کہ ہر روز نئی نئی نقلیں کر کے سب کو ہنساتے ہنساتے لٹا لٹا دیتی تھیں۔ اب کوئی گھر میں آکر تھوکتا بھی نہیں۔ گھر ہے کہ کم بخت اکیلا پڑا بھائیں بھائیں کیا کرتا ہے۔

صالحہ: آخر اس کا سبب کیا؟

نعیمہ: سبب تمھاری خالہ جان اور حمیدہ کے ابا جان کی بد مزاجی۔ کسی کو کیا غرض، کیا مطلب کہ

Scanned with CamScanner

اپنے کام کاج کا حرج کرے اور پرائے گھر آ کر بیٹھے۔ کیا لوگوں کے گھروں میں بیٹھنے کی جگہ نہیں؟ لوگوں کی خاطر داری ہوتی تھی، محبت سے ان کے ساتھ پیش آتی تھیں، لوگ دوڑے آتے تھے۔ اب یہ حال ہے کہ ہر وقت منھ کپّے کی طرح پھولا رہتا ہے۔ غیر آدمی کیوں برداشت کرنے لگے، سب کے سب چلتے پھرتے نظر آئے۔ ابا جان کے اچھے ہونے پر ڈومنیوں نے سیکڑوں ہی پھیرے کیے۔ سبھی نے کہا۔ ہمسائی بجوبہ نے منتیں کیں، ہاتھ جوڑے۔ ایک نہ مانی۔ آخر وہ رت جگا تو خاک بھی نہ ہوا، نگوڑے مسجد کے ملانوں کو بلا کر کھلا دیا۔ اب تو بوا دن رات نماز کا وظیفہ ہے۔ وہ دیکھو تخت پر ہر وقت نماز کا چیتھڑا بچھا رہتا ہے۔ وضو کا کلھڑ کیا مجال کہ کسی وقت پاس سے الگ ہو جائے۔ کام کاج سے فارغ ہوئیں تو یا نماز پڑھنے کھڑی ہو گئیں یا کتاب پڑھنے بیٹھ گئیں۔ ایک حمیدہ کٹنی ان کو ایسی مل گئی ہے کہ اور ان کو اکسایا کرتی ہے۔ میرا بس چلے تو کٹیا کو ایسا ماروں، ایسا ماروں کہ یاد کرے۔

فروغ:

نعیمہ: واہ، ایسی نماز بھاڑ میں جائے　　جس سے گھر میں کوئی نہ رہنے پائے
یہ سبھی کو بجز حمیدہ کے　　بس نکلوائے گی اب اس گھر سے
صالحہ: کیا بڑے بھائی کا ہے غم تم کو؟　　کیا انھیں کا ہے یہ الم تم کو؟
نعیمہ: مجھ کو ان کی خبر نہیں ہے مگر　　ان سے پہلے میں چھوڑنے کو ہوں گھر
صالحہ: باجی، توبہ کرو، خدا کی پناہ　　فالِ بد کیا نکالتی ہو واہ
کسی اشراف کی بہو بیٹی　　گھر سے نکلے خدا کرے نہ کبھی
نعیمہ: ہے یہ چرچا نماز کا جب سے　　سب شرافت بھی مٹ گئی تب سے
تم بھی دو چار روز رہ کے ذرا　　دیکھ لو رنگ ڈھنگ اب اس گھر کا
وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا　　اب تو وہ لوگ وہ مکاں نہ رہا
چہچہے وہ نہ دل لگی ہی رہی　　وہ مذاق اور نہ وہ ہنسی ہی رہی
خامشی ایسی سب کو بھائی ہے　　سارے گھر میں اداسی چھائی ہے
اک مہینہ اُدھر تھا یہ عالم　　رہتی تھی کیا چہل پہل ہر دم
عورتیں اس محلے بھر کی تمام　　جمع رہتی تھیں صبح سے تا شام

Scanned with CamScanner

کوئی تو ڈھول لے کے گاتی تھی — اور کوئی قہقہے لگاتی تھی
چھوٹی خانم یہ ہیں جو ہمسائی — کیا طبیعت انھوں نے ہے پائی
روز نقلیں سنا کے جاتی تھیں — کیا کہوں کس قدر ہنساتی تھیں
اب بھی اگلی سی ہے وہ بات کہیں؟ — کوئی اس گھر میں تھوکتا بھی نہیں
صالحہ: میں نے دُکھڑا تمھارا سب یہ سنا — پر کہو تو سبب ہے کیا اس کا؟
نعیمہ: ٹیڑھاپن اک تمھاری خالہ کا — اک حمیدہ کے باپ کا غصہ
اپنا گھر ہے کسی کو کیا دوبھر — کوئی کیوں آئے یوں کسی کے گھر
وہ محبت سے پیش آتی تھیں جب — دوڑے آتے تھے لوگ بھی پھر سب
اب تو ہر وقت ہے یہ حال ان کا — منہ ہے کپّے کی طرح سے پھولا
کیا غرض پھر کوئی اِدھر آئے — چلتے پھرتے کبھی نظر آئے
اچھے ہوتے ہی ابا جان کے، یاں — کر گئیں کتنے پھیرے ڈومنیاں
سب نے سمجھایا منتیں بھی کیں — واں تھا سب کا جواب ایک نہیں
رت جگا تو جو ہوتا تھا نہ ہوا — مگر اس کے عوض میں گل یہ کھلا
شہر بھر کے نگوڑے سب ملّا — مفت میں آ کے کھا گئے کھانا
رات دن اب تو ہے یہی دھندا — ہے وظیفہ نماز روزے کا
ہوئی جب کام کاج سے فرصت — بندھ گئی بس نماز کی نیت
اور پھر یہ حمیدہ کتنی بھی — ہے کچھ ایسی غضب کی ان کو ملی
ہیں ابھی سے نرالے اس کے طور — ان کو اکسایا کرتی ہے یہ اَور
اگر اس کتیا پر ہو بس میرا — ایسا کچلوں کرے تو یاد ذرا

3

مرزا ظاہر دار بیگ سے نصوح کے بڑے بیٹے کلیم کی ملاقات کا حال توبۃ النصوح کے دلچسپ ترین حصوں میں ہے۔ فروغ نے اس کو نظم بھی خوب کیا ہے۔ اس کے کچھ حصے درج ذیل ہیں:

Scanned with CamScanner

نذیر احمد: کلیم نے وہاں جا آواز دی تو کچھ دیر بعد مرزا صاحب ننگ دھڑنگ جانگھیا پہنے ہوئے باہر تشریف لائے اور کلیم کو دیکھ کر شرمائے اور بولے آہا آپ ہیں۔ معاف کیجئے گا، میں نے سمجھا کوئی اور صاحب ہیں۔ بندے کو کپڑا پہن کر سونے کی عادت نہیں۔ میں ذرا کپڑے پہن آؤں تو آپ کے ہم رکاب چلوں۔

کلیم: چلیے گا کہاں۔ میں آپ کے پاس آیا تھا۔

مرزا: پھر اگر کچھ دیر تک تشریف رکھنا منظور ہو تو میں اندر پردہ کرادوں۔

کلیم: میں آج شب کو آپ ہی کے یہاں رہنے کی نیت سے آیا ہوں۔

مرزا: بسم اللہ، تو چلیے اسی مسجد میں تشریف رکھیے۔ بڑی فضا کی جگہ ہے۔ میں ابھی آیا۔

کلیم نے جو مسجد میں آکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک نہایت پرانی چھوٹی سی مسجد ہے۔ وہ بھی مسجد ضرارہ کی طرح ویران، وحشتناک۔ نہ کوئی حافظ ہے، نہ ملا، نہ طالب العلم، نہ مسافر۔ ہزارہا چمگادڑیں اس میں رہتی ہیں کہ ان کی تسبیح بے ہنگام سے کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں۔ فرش پر اس قدر بیٹ پڑی ہے کہ بجائے خود کھرنجے کا فرش بن گیا ہے۔ مرزا کے انتظار میں کلیم کو چاروناچار اسی مسجد میں ٹھہرنا پڑا۔ مرزا آئے بھی تو اتنی دیر کے بعد کہ کلیم مایوس ہو چکا تھا۔ قبل اس کے کہ کلیم شکایت کرے، مرزا صاحب بطور دفع دخل فرمانے لگے کہ بندے کے گھر میں کئی دن سے طبیعت علیل ہے۔ خفقان کا عارضہ، اختلاجِ قلب کا روگ ہے۔ اب جو میں آپ کے پاس سے گیا تو ان کو غشی میں پایا۔ اس وجہ سے دیر ہوئی۔ پہلے تو یہ فرمائیے کہ اس وقت بندہ نوازی فرمانے کی کیا وجہ ہے۔ کلیم نے باپ کی طلب، اپنا انکار، بھائی کی التجا، ماں کا اصرار، تمام ماجرا کہہ سنایا۔

مرزا: پھر اب ارادہ کیا ہے؟

کلیم: سوائے اس کے کہ اب گھر لوٹ کر جانے کا ارادہ تو نہیں ہے۔ اور جو آپ کی صلاح ہو۔

مرزا: خیر نیتِ شب حرام، صبح تو ہو، آپ بے تکلف استراحت فرمائیے۔ میں جا کر بچھونا وغیرہ بھیجے دیتا ہوں، اور مجھ کو مریضہ کی تیمارداری کے لیے اجازت دیجیے کہ آج اس کی علالت میں اشتداد ہے۔

فروغ:

Scanned with CamScanner

اس پتے سے کلیم نے جا کر ۔۔۔ دی صدا شیخ جی کو چلاّ کر
لائے تشریف وہ بغیر درنگ ۔۔۔ جانگیا پہنے اور ننگ دھڑنگ
دیکھ کر وہ کلیم کو شرمائے ۔۔۔ اور اسی دم سخن زباں پہ یہ لائے
سوتا ہوں رات کو ہمیشہ یوہیں ۔۔۔ نیند کپڑے پہن کے آتی نہیں
کپڑے جا کر ذرا پہن آؤں ۔۔۔ آپ کے ہم رکاب پھر میں چلوں
کلیم: کہیں جانے کا قصد کب ہے مرا ۔۔۔ پاس میں آپ ہی کے آیا تھا
ظاہردار: پھر ٹھہرنا ہو تھوڑی دیر اگر ۔۔۔ جا کے پردہ کرا دوں میں اندر
کلیم: اب بھلا جاؤں گا میں آج کہاں ۔۔۔ رات بھر رہنے آیا ہوں میں یہاں
ظاہردار: یہ ارادہ ہے گر تو بسم اللہ ۔۔۔ ہے یہ مسجد بڑی فضا کی جگہ
آپ چلیے ابھی میں آتا ہوں ۔۔۔ گھر میں کچھ کام کرنے جاتا ہوں
جا کے دیکھا کلیم نے جو وہاں ۔۔۔ ایک مسجد ہے چھوٹی سی ویراں
ٹوٹی پھوٹی اجاڑ وحشت ناک ۔۔۔ جمع ہے جس میں سیکڑوں من خاک
نہ موذن ہے کوئی نے ملاّ ۔۔۔ گھر میں اللہ کے ہے سناٹا
شیخ جی دیر تک نہ آئے وہاں ۔۔۔ اور رہا منتظر کلیم یہاں
سخت تھی انتظار کی تکلیف ۔۔۔ لائے آخر کو شیخ جی تشریف
کرنے پایا نہ تھا کلیم گلہ ۔۔۔ دفعِ دخل اس طرح سے ہونے لگا
ظاہردار: گھر میں حالت عجب مزاج کی ہے ۔۔۔ کہ شکایت کچھ اختلاج کی ہے
آپ کے پاس سے جو اَب میں گیا ۔۔۔ تو انھیں غش کے حال میں دیکھا
کیجیے گا معاف یہ تقصیر ۔۔۔ ہوئی اس وجہ سے مجھے تاخیر
ہوا بندہ جو آج سرافراز ۔۔۔ سبب اس کا بتائیں بندہ نواز
شیخ جی پر کلیم نے آخر ۔۔۔ سرگذشت اپنی ساری کی ظاہر
باپ کے وہ بلانے پر انکار ۔۔۔ ماں کا سمجھانا بھائی کا اصرار
ظاہردار: خیر آرام کیجیے اب تو ۔۔۔ شب کی نیت بہ خیر صبح تو ہو

Scanned with CamScanner

سب ضرورت کی چیزیں اور بستر بھیجے دیتا ہوں میں ابھی جا کر
ہے مریضہ کا حال آج زبوں گھر میں رہنے کا اِذن چاہتا ہوں

4

نذیر احمد: مرزا نے گھر جا کر ایک میلی دری اور ایک کثیف سا تکیہ بھیج دیا۔ دو ہی گھڑی میں کلیم کی حالت کا اس قدر متغیر ہو جانا عبرت کا مقام ہے۔ یا تو خلوت خانے اور عشرت منزل میں تھا یا اب ایک مسجد میں آ کر پڑا اور مسجد بھی ایسی جس کا حال تھوڑا سا ہم نے اوپر بیان کیا۔ گھر کے الوانِ نعمت کو لات مار کے نکلا تھا تو پہلے ہی وقت چنے چبانے پڑے۔ نہ چراغ نہ چارپائی، نہ بہن نہ بھائی، نہ مونس نہ غمخوار، نہ نوکر نہ خدمتگار، مسجد میں اکیلا ایسا بیٹھا تھا جیسے قید خانے میں حاکم کا گنہگار یا قفس میں قید مرغ نوگرفتار۔ اور کوئی ہوتا تو اس حالت پر نظر کر کے تنبیہ پکڑتا، اپنی حرکت سے توبہ اور اپنے اعمال سے استغفار کرتا اور اسی وقت نہیں تو سویرے گجردم باپ کے ساتھ نمازِ صبح میں جا شریک ہوتا، لیکن کلیم کو اور بہت سے مضمون سوچنے کو تھے۔ رات بھر میں ایک قصیدہ تو مسجد کی ہجو میں تیار کیا اور ایک مثنوی مرزا کی شان میں۔ صبح ہوتے آنکھ لگ گئی تو نہیں معلوم مرزا یا محلے کا کوئی اور عیار ٹوپی، جوتی، رومال، چھڑی، تکیہ، دری، یعنی جو چیز کلیم کے بدن سے منفک اور اس کے جسم سے جدا تھی، لے کر چمپت ہوا۔ یوں بھی کلیم بہت دیر کو سو کے اٹھتا تھا، آج تو ایک وجہِ خاص تھی۔ کوئی پہر سوا پہر دن چڑھے جاگا تو دیکھتا کیا ہے فرشِ مسجد پر پڑا ہے اور نیند کی حالت میں جو کروٹیں لی ہیں تو سیروں گرد کا بھبھوت اور چمگادڑوں کی بیٹ کا ضماد بدن پر تھپا ہوا ہے۔ حیران ہوا کہ قلبِ ماہیت ہو کر میں کہیں بھتنا تو نہیں ہو گیا۔ مرزا کو اِدھر دیکھا اُدھر دیکھا، کہیں پتا نہیں۔ مسجد تھی ویران، اس میں پانی کہاں۔ صبر کر کے بیٹھ رہا کہ کوئی اللہ کا بندہ اِدھر کو آ نکلے تو اس کے ہاتھ مرزا کو بلواؤں اور یا منھ ہاتھ دھو کے خود مرزا تک جاؤں۔ اس میں دوپہر ہونے کو آئی۔ بارے ایک لڑکا کھیلتا ہوا آیا۔ جونہی زینے پر چڑھا کہ کلیم اس سے عرضِ مطلب کرنے کے لیے لپکا۔ وہ لڑکا اس کی ہیئت کذائی دیکھ ڈر کر بھاگا۔ خدا جانے اس نے اس کو بھوت سمجھا یا سڑی خیال کیا۔ کلیم نے بہتیرا پکارا، اس لڑکے نے پیٹھ پھیر کر نہ دیکھا۔

بھیجی پھر شیخ جی نے جاتے ہی
تکیہ اک میلا اک کثیف دری

ہو نہ کیونکر کلیم کو عبرت
کیسی جلدی بدل گئی حالت

عیش منزل میں جو کہ رہتا تھا
ٹوٹی مسجد میں یا وہ اب ہے پڑا

بدلے نعمت کے رنج کھانے پڑے
شکر کر کے چنے چبانے پڑے

نہ چراغ اور نہ شمع پائی ہے
نہ بچھونا نہ چارپائی ہے

کوئی مونس ہے نہ کوئی غم خوار
کوئی ماما ہے اور نہ خدمتگار

اَور جو اس مقام پر ہوتا
متنبہ وہ کچھ مگر ہوتا

عقل ہوتی تو اس پہ تھا لازم
ہوتا وہ اپنے فعل سے نادم

پھر کے جاتا ابھی وہ اپنے گھر
رکھتا قدموں پہ اپنے باپ کے سر

نہ کیا پر ادھر کلیم نے غور
کہ سمائی تھی اس کے دل میں اَور

یہ مگر ہو کے بے خبر سویا
خوب ہی لمبی تان کر سویا

اٹھتے ہی سر پہ ہاتھ رکھ کر روئے
یہ مثل ٹھیک ہے جو سوئے وہ کھوئے

بے خبر پا کے لے گیا کوئی
دری رومال ٹوپی تکیہ بھی

حال معلوم چور کا نہ ہوا
شیخ جی تھے کہ اور کوئی تھا

تھی جو کروٹ اِدھر اُدھر کی لی
جسم بھر میں منوں تھی گرد بھری

تھی جو چمگادڑوں کی بیٹ زیاد
پیٹھ میں اس کی ہو گیا تھا ضماد

رکھ کے سر زانوے تحیر پر
دفعتاً بول اٹھا وہ گھبرا کر

ہوئی کیسی یہ قلبِ ماہیت
آدمی ہوں کہ بھوت، ہے حیرت

شیخ جی کو اِدھر اُدھر دیکھا
مگر ان کا کہیں پتا نہ ملا

تھی وہ مسجد بھی اس قدر ویراں
نہ جہاں پانی کا تھا نام و نشاں

صبر کر کے غرض وہ مردِ خدا
ہو کے چپ اس امید میں بیٹھا

مرتا جیتا جو کوئی آ جائے
شیخ جی کو وہ اسی سے بلوائے

تھوڑا پانی کسی سے یا منگوائے
ہاتھ منھ دھو کے خود ہی ان تک جائے

Scanned with CamScanner

گئی اس طرح دوپہر بھی گذر
بارے اک لڑکا آیا اس کو نظر
جیسے ہی لوٹنے کو کنکوا
صحن مسجد میں وہ غریب آیا
شاد ہو کر بڑھا کلیم ادھر
پڑی اس بچے کی جو اس پر نظر
برزخ ایسی تھی کچھ عجیب و غریب
ڈر گیا بھوت جان کر وہ غریب
گو کہ چیخا کلیم بہتیرا
اس نے پھر کر نہ پر ادھر دیکھا

مثنوی آسان زبان میں ہے، پھر بھی اس میں کہیں کہیں جو مشکل لفظ آ گئے ہیں ان کے معنی حاشیے میں لکھ دیے گئے ہیں۔ مثلاً اسی صفحہ 207 پر ضماد، قلبِ ماہیت اور برزخ کے معنی علی الترتیب لیپ، اصلیت کا بدل جانا اور شکل لکھے ہیں۔

کتاب بیس سطری مسطر کے دو سو سینتالیس صفحے میں آئی ہے۔ آزاد حیثیت میں بھی یہ اردو کی دلچسپ مثنوی ہے، نذیر احمد کے قصے نے اس کی دلچسپی کو بہت بڑھا دیا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، یہ اردو میں کسی ناول کا غالباً پہلا منظوم روپ ہے اور اب زمانے کا رنگ بدلنے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ یہ آخری روپ بھی ہے۔

آخر میں توبۃ النصوح منظوم کے کچھ اور اقتباس دیکھیے۔

5

(نصوح خواب دیکھنے کے بعد)

باپ کی اپنے دیکھ کر حالت
چھائی دل پر نصوح کے ہیبت
کھل گئی آنکھ خوابِ غفلت سے
دل دھڑکتا تھا اس کی دہشت سے
دیکھتا کیا ہے پھر وہی ہے مکاں
وہی تیمارداریوں کا سماں
پاس بی بی بھی اس کی بیٹھی تھی
اور آہستہ پنکھا جھلتی تھی
جب یہ دیکھا میاں کی آنکھ لگی
جان میں جان اک ذرا آئی
یہ ہوا تھا جو مبتلائے بلا
دل میں وہم اس کے آتے تھے کیا کیا

سو گیا تھا نصوح آٹھ بجے   دو بجے جاگا خواب غفلت سے
ڈاکٹر کہہ گیا تھا یہ جب سے   سب کو تسکین تھی ذرا تب سے
سو رہے تو نہ ڈرنا تم زنہار   یہ سمجھنا کہ بچ گیا بیمار
پر ہوئی جاگنے میں جب تاخیر   شک ہوا عورتوں کو دامن گیر
ایک نے پھر تو ایک سے یہ کہا   تھی موئے ڈاکٹر کی کیسی دوا
کوئی تدبیر اب کرو جھٹ پٹ   دوپہر ہو گئی نہ لی کروٹ
سو طرف اب خیال جاتا ہے   دیکھیے ہوش کیونکر آتا ہے
اتنے میں جو نصوح جاگ اٹھا   شکرِ خالق کیا سبھوں نے ادا
بولی بی بی مزاج کیسا ہے   جلد بتلاؤ جی تو اچھا ہے
اچھے سوئے ہوئی نہ تم کو خبر   روتا اور پیٹتا رہا گھر بھر
تم جو بولو تو دل کو چین پڑے   کیسے بےتاب سب ہیں چھوٹے بڑے
لڑکیوں کے دلوں کو دو تسکیں۔   روتے روتے ہیں آنکھیں سوج گئیں
گو کہ اس نے بہت کیا اصرار   پر نہ بولا نصوح کچھ زنہار
ہمہ تن تھا خیال اس کا ادھر   واقعہ خواب کا تھا پیش نظر

خصلتیں بھی مزاج بھی بدلا   اب نہیں وہ نصوح پہلے جو تھا
سیر و تفریح سے بھی منہ موڑا   دوستوں میں بھی بیٹھنا چھوڑا
ہو گئے اب تو داخلِ طینت   انکسار و تواضع و شفقت
پہلے سب لوگ اس سے رہتے تھے دور   ایک ہی بدمزاج تھا مشہور
حال غصے کا ہے یہ ادنیٰ سا   اس کو بچے سمجھتے تھے ہوّا
تیور اس کے ذرا ہوے جو کڑے   سہم جاتے تھے ڈر کے چھوٹے بڑے
کھانے کے وقت ایک آفت تھی   تیز یا کم نمک ہوا جو کبھی
اس گھڑی کی تھی سیر قابلِ دید   بس چھنا چھن ہوے پیالے شہید

Scanned with CamScanner

سارا کھانا زمین پر پٹکا
بال بچوں کو ہو گیا فاقہ

ہوئی اس دن محلے بھر کو خبر
کھانا پکا بُرا نصوح کے گھر

بی بی سے منھ تھتھا ہوا خفگی
بچوں کو بات بات پر گھرکی

ہے وہی اب نصوح نیک سیَر
ڈھول سر پر بجے تو ہو نہ خبر

بلکہ بچوں سے ہو کے رنجیدہ
چیختی پیٹتی تھی فہمیدہ

باپ کا ہے نہ کچھ خیال نہ ڈر
شور کرتے ہیں کان میں جا کر

پا کے صحت نصوح جب اٹھا
اور گھر والوں کو ہوا کھٹکا

غصہ ہر بات پر سوا ہو گا
اب مزاج اور چڑچڑا ہو گا

یہ جو چپ ہے تو لوگ کہتے ہیں
اب اسی سے خموش رہتے ہیں

لب کسی وقت کھولتے بھی نہیں
ہیں خفا ہنستے بولتے بھی نہیں

دیکھیے کس کی شامت آتی ہے
دیکھیے کس پہ آفت آتی ہے

برخلاف اس کے تھی یہ کیفیت
اَور سے اَور ہو گئی حالت

سامنے جو بُرا بھلا آیا
کھا لیا شکرِ حق بجا لایا

جب سے بدلی تھی اس کی ہر عادت
آ گئی تھی پسند اسے خلوت

اک الگ کمرے میں یہ کوٹھے پر
بیٹھا رہتا اکیلا دن دن بھر

کوئی سمجھا یہ دیکھ کر حالت
نہیں چڑھنے اترنے کی طاقت

اور کسی نے کیا یہ دل میں خیال
آج کل نیند بڑھ گئی ہے کمال

جانے آنے کا اتفاق مگر
ہوتا تھا اس کی بیوی کو اکثر

دیکھتی تھی ہمیشہ وہ ہمراز
کبھی چپ ہے کبھی ہے محوِ نماز

آخر اک روز اس نے یہ پوچھا
کیا کِیا کرتے ہو یہاں تنہا؟

اتر آیا کرو کبھی نیچے
دل ذرا بال بچوں میں بہلے

نصوح: آج پوچھا ہے تم نے شکرِ خدا
جب سے بیمار ہو کے میں اٹھا

دیکھے بدلے ہوئے مرے اطوار
سبب اس کا کیا نہ استفسار

Scanned with CamScanner

فہمیدہ: سچ کہا تم نے ٹھیک ہے یہ خیال
مگر اس کا نہ پوچھو مجھ سے حال
گو کئی بار دل میں کی نیت
نہ ہوئی پوچھنے کی پر جرأت
کچھ بُرا ماننے کی بات نہیں
تھا تمھارا مزاج تیز یوہیں
ایک تو تھا بُرا اب اَور ہوا
جیسے کڑوا کریلا نیم چڑھا
ملتفت بھی نہ پایا تم کو ادھر
چھا گیا اور خوف ہم سب پر
سب یہ سمجھے مزاج ہے برہم
پھر یہ جرأت تھی پوچھتے کچھ ہم

نصوح: تھا جو میں بدمزاج حد سے سوا
متنبہ نہ تم نے مجھ کو کیا

فہمیدہ: کس کو منھ کھولنے کی تھی طاقت
بات کرنے کی کس کو تھی جرأت

نصوح: خیر اچھا یوہیں سہی بہتر
ان دنوں میں خفا ہوا کس پر؟
اب جو غصہ مجھے نہیں آتا
لوگ کیا اس کا کرتے تھے چرچا؟

فہمیدہ: پوچھتے ہو جو یہ تو مجھ سے سنو
اک تعجب ہے اس کا گھر بھر کو
جتنے منھ اتنی باتیں ہیں مشہور
سبھی کہتے ہیں اپنے اپنے حضور
ڈاکٹر نے دوا جو قبض کی دی
چڑھ گئی ہے دماغ پر گرمی
رائے ہے سب کی ہو تمھارا علاج
ٹھیک اب تک نہیں ہوا ہے مزاج

(کلیم،علیم،سلیم)

کلیم: ٹھیک کہتے ہو یاد آیا اب
کیا ہوے وہ تمھارے ہم مکتب؟
تھے وہ چاروں فریب کے مرجع
مکر کے تھے عناصرِ اربع
خوب بہکایا تھا تمھیں مری جاں
کہ وہ چاروں تھے ثانیِ شیطاں

سلیم: آپ کہتے ہیں ناحق ان کو بُرا
وہی تو ابا جان نے بھی کہا

کلیم: ہو کے بیمار وہ اٹھے ہیں ابھی
کہی تھی پہلے بھی یہ بات کبھی؟
بس سمجھ لو دماغ کا ہے خلل
تم کرو ان کی بات پر نہ عمل
تم سے پہلے بھی تھا یہ میں نے کہا
ڈاکٹر نے جو دی تھی ان کو دوا

Scanned with CamScanner

جس کے زور حد سے تھے جو بڑھے ۔۔۔ وہ بخارات مغز پر ہیں چڑھے
علیم: حفظِ آداب آپ کو نہ رہا ۔۔۔ آپ نے سوچے تو کیا یہ کہا
آتا ہوں ان کے پاس سے میں ابھی ۔۔۔ دیر تک مجھ سے بات چیت رہی
میرے نزدیک ان کے اب اکثر ۔۔۔ ہیں خیالات پہلے سے بہتر
کلیم: سنتا ہوں آج کل میں یہ انداز ۔۔۔ کہ پڑھا کرتے ہیں وہ روز نماز
علیم: ہاں تو پھر آپ اے بلند وقار ۔۔۔ دیتے ہیں کیا جنون اس کو قرار
کلیم: تم تو کرتے نہیں ہو غور ذرا ۔۔۔ سینگ سر پر جنوں کے ہوتے ہیں کیا؟
دور کی تھی خدا نے بیماری ۔۔۔ ہوتا جلسہ کوئی بڑا بھاری
کرتے تعریف ان کی خاص و عام ۔۔۔ کس قدر شہر بھر میں ہوتا نام
یہ گھرانے کے ہیں نئے انداز ۔۔۔ جا کے مسجد میں پڑھ رہے ہیں نماز
لیجیے اب خدا کی ہے قدرت ۔۔۔ آپ کے مولوی ہیں ہم صحبت
گو ذلیل اس قدر ہیں یہ ملاّ ۔۔۔ کہ ہے خیرات پر گذر ہوتا
اس پہ انسانیت سے بھی ہیں دور ۔۔۔ کس قیامت کے ہوتے ہیں مغرور
ملتے ہیں راہ میں جو یہ خودکام ۔۔۔ اتنی طاقت نہیں کریں نہ کلام
پر کسی کا ادب ہے نے تعظیم ۔۔۔ بندگی کورنش ہے نے تسلیم
حدِ آداب سے گزرتے ہیں ۔۔۔ کہ سلام علیک کرتے ہیں

(چھوٹے بھائی کی طرف مخاطب ہو کر)

حکم تھا سر منڈانے ہی کا سلیم ۔۔۔ یا عبادت کی بھی ہوئی تفہیم؟
سلیم: سخت تاکید اس کی ہے بھیا ۔۔۔ کہ خبردار ہو کبھی نہ قضا
ماورا اس کے یہ بھی ہے اصرار ۔۔۔ لے چکے ہیں ابھی وہ یہ اقرار
تاش شطرنج اور گلی ڈنڈا ۔۔۔ مرغ تیتر بٹیر کنکوا
شیر بکری بھی سولہ گٹے بھی ۔۔۔ دس کھڑاکا چتمن پچیسی (؟)
تختہ و نرد گنجفہ چوسر ۔۔۔ ہیں یہ لہو ولعب سبھی بدتر

شہدوں میں بیٹھنا قسم کھانا　　گالیوں کا زبان پر لانا
کبھی ان باتوں کو نہ تم کرنا　　اپنے اللہ پاک سے ڈرنا
کلیم: یہ نہ کیوں کہہ دیا کہ مر جاؤ　　اس زمانے ہی سے گذر جاؤ

(کلیم اور فہمیدہ)

فہمیدہ: واہ اچھی کہی یہ میری جاں　　وہ ہیں باپ اور میں تمہاری ماں
کلیم: خوب چھیڑیں نئی نکالی ہیں　　یہ زبردستیاں نرالی ہیں
اس سے انکار ہے مجھے بھی کہاں　　کہ وہ ہیں باپ اور آپ ہیں ماں
ہم پہ لیکن کچھ اختیار نہیں　　کیا میں بچہ ہوں ہوشیار نہیں؟
مجھ کو ہے نیک و بد کا اپنے دھیان　　میں سمجھتا ہوں نفع اور نقصان
گر یہ منظور تھا کہ ہو کے بڑا　　کسی مسجد کا میں بنوں ملاّ
تو خبر پہلے ہی سے لی ہوتی　　ایسی تعلیم مجھ کو دی ہوتی
کربلا بھی بہ چشم تر جاتا　　جا کے دوچار حج بھی کر آتا
وردِ تلقین کرتا صبح و شام　　سیکھتا پنج سورہ بارہ امام
پھر کوئی شہر میں جہاں مرتا　　چار پیسوں کی فکر میں کرتا
کیسے کیسے مزے اڑاتا میں　　جوڑے چالیسویں کے پاتا میں
مفت کے خوب ہاتھ آتے مال　　مجھ کو قربانیوں کی ملتی کھال
ہوتے پھر مستحق زکوٰۃ کے ہم　　ملتی روزے نماز کی بھی رقم
جس قدر ہیں رئیس اور خوش حال　　نہیں ان سے بُرے مرے احوال
ہیں کھلاڑی جو شاہ رُخ مرزا　　وہ تو شطرنج میں ہیں مجھ سے سوا
اَور سے مات میں اگر کھاؤں　　ٹانگ کی راہ سے نکل جاؤں
گنجفے کی اگرچہ مشق ہے کم　　لیکن ایسے نہیں ہیں اس میں بھی ہم
جو کوئی ہم سے اس قدر بڑھ جائے　　کبھی صفو پہ نادری چڑھ جائے

Scanned with CamScanner

تاش چوسر کا بھی یہی ہے حال   کبھی چلتے نہیں کسی کی چال
آج جیسے مرے کبوتر ہیں   ویسے اس شہر بھر میں کمتر ہیں
گھر سے صیدی ہیں لے چلے آتے   نہیں بھولے سے بھی پھڑک کھاتے
ہاتھ کنکوّے میں بھی ہے تیار   کم نہیں ہوں کسی سے میں زنہار
جیسے دُہرا ہے آج میرا مضاف   پیچ ایسا نہیں کسی کا صاف
یہ میں کہتا نہیں کہ یکتا ہوں   لکھ بھی لیتا ہوں پڑھ بھی لیتا ہوں
وہ امیروں کا کون سا ہے ہنر   جس سے واقف نہیں ہے یہ کمتر
ابھی کل کی ہے اماں جان یہ بات   کہ بیاں ہوتے تھے ہمارے صفات
دفعتاً انقلاب یہ کیسا؟   ہو گیا اب میں بے ہنر ایسا
مجھ کو تعلیم کی ضرورت ہے   اب مجھے تربیت کی حاجت ہے
میرے افعال سے خدا ہے گواہ   آپ سب پہلے ہی سے تھے آگاہ
نہ کبھی آپ نے مجھے روکا   نہ کبھی باپ نے مجھے ٹوکا
ہے نیا امتحاں نئے استاد   کہ سکھائیں تو کچھ، رہے کچھ یاد
اب جو باتیں نئی نکالی ہیں   یہ کوئی مجھ سے ہونے والی ہیں

فہمیدہ: تم سے سچ کہتی ہوں میں اے بیٹا   تم سمجھتے ہو جس کو دیوانہ
سب یہ باتیں ہیں ان کے پیشِ نظر   تم نے اس دم بیاں جو کیں فرفر
ہاں وہ اس بات کے بھی ہیں قائل   کہ سنبھلنا تمھارا ہے مشکل
بس یہی تو انھیں ہے رنج عظیم   پہلے ہی سے بُری ہوئی تعلیم
خود وہ کہتے ہیں رو کے یہ اکثر   سب یہ الزام ہیں مرے سر پر
ہے ہماری ہی تربیت کا فتور   نہیں اولاد کا ہے کوئی قصور
تھی کہاں عقل کیا سڑی پن تھا   ان کا میں باپ تھا کہ دشمن تھا
ہائے یہ کھیل میں ہوے غارت   میں نے ان کو دلائی خود رغبت
اس ندامت سے کاش مر جاؤں   اب میں کس منھ سے ان کو سمجھاؤں

Scanned with CamScanner

رہا غافل میں آج تک کیسا — نہ کیا اب تلک جو فرض ادا
اب نہیں مانتا ہے میرا دل — کہ میں اس فرض سے رہوں غافل
کلیم: ایسا ہی فرض ہے جو سر پہ چڑھا — دوسرے بچوں پر کریں وہ ادا

(نصوح کا کلیم کے جانے کے بعد اس کے کمرے دیکھنا)

غرض آ کر نصوح نے باہر — کہا یہ نوکروں کو بلوا کر
ساتھ چل کر کلیم کا اسباب — کس جگہ رہتا ہے بتاؤ شتاب
نوکر: نئے کمرے شمال رُخ ہیں جو — خاص انھی کے ہیں رہنے کے دونوں
ہیں بڑے شوق سے حضور سجے — نام بھی رکھ دیے ہیں دونوں کے
ہیں جہاں کھیل کود میں رہتے — عیش منزل وہ اس کو ہیں کہتے
لکھنے پڑھنے کی ہیں کتابیں جہاں — اس کا خلوت کدہ ہے نام رکھا (؟)
نام سنتے ہی ہو کے چوکنا — عیش منزل کے دیکھنے کو بڑھا
اسی منزل کو پہلے کھلوا کر — دیکھتا کیا ہے جب گیا اندر
عیش منزل غلط کہا کیا ہے — وہ مقام اسم بامسمیٰ ہے
تخت بچھے ہیں کمرے کے اندر — اور دری چاندنی بھی ہے اس پر
اس سلیقے سے فرش بچھا ہے — نہ شکن ہے کہیں نہ دھبا ہے
ہے عجم کا نفیس اک قالین — گاو تکیہ ہے اس پر باتزئین
لبِ قالیں اگال دان ہے ایک — متصل اس کے پیچوان ہے ایک
کرسیاں گرد تختوں کے ہیں بچھی — آئینے کی طرح چمکتی ہوئی
چھت میں لٹکا ہوا ہے اک پنکھا — سرخ جھالر میں ہے ٹکا لچکا
ہے لگی اک سفید چھت گیری — لٹکے ہیں جھاڑ اور ہانڈیاں بھی
جب یہ ساماں نصوح نے دیکھا — بولا افسوس سے وہ مردِ خدا
ہوئی برباد کس قدر دولت — ایسے بیہودہ شوق پر لعنت

Scanned with CamScanner

کاش یہ مال جو ہوا برباد
اس سے ہوتی غریبوں کی امداد

ابھی اس فکر میں تھا یہ ناگاہ
جا پڑی اک طرف کو اس کی نگاہ

دیکھتا کیا ہے ایک پہلو میں
آمنے سامنے ہیں دو میزیں

اک پہ ہے تاش گنجفہ چوسر
باجا اور اک کتاب دوسری پر

بڑھ کے اس بندۂ خدا نے شتاب
فوراً اس میز سے اٹھائی کتاب

کھول کر دیکھا جب کھلا اس دم
کہ وہ تصویروں کی ہے اک البم

اور بیہودہ پن یہ ہے اس میں
رنڈیوں کی ہیں ساری تصویریں

اب تو غصے کی کوئی حد نہ رہی
نوکروں سے یہ بات اس نے کہی

جس قدر یہ تمام ہے اسباب
رکھو لے جا کے باہر اس کو شتاب

جمع جب ہو چکا وہ سب کھٹ راگ
شعلۂ غیظ اٹھا لگا دی آگ

فرصت اس سے ہوئی جوں ہی حاصل
ہوا خلوت کدے میں وہ داخل

ایک الماری واں پہ آئی نظر
جو کتابوں سے پُر تھی سرتاسر

جلدوں کی عمدگی غضب کی تھی
رنگ اور وضع ایک سب کی تھی

خوش ہوا تھا وہ مرد حق آگاہ
کی مضامیں پہ کھول کر جو نگاہ

جھوٹے قصے ہیں واہیات مذاق
ساری باتیں بعید از اخلاق

نہ تامل زرا کیا اس نے
سب کو آخر جلا دیا اس نے

ہوئی چھوٹوں بڑوں کو جب یہ خبر
خوف سے تہلکے میں تھا گھر بھر

کام اس دم علیم نے یہ کیا
دوڑ کر دو کتابیں لے آیا

یہی بیہودہ پن تھا ان میں بھی
زہرِ عشق اک بہارِ عشق اک تھی

عرض کی آ کے باپ سے اس نے
آگ میں آپ انھیں بھی رکھ دیجے

ان کو دیکھا نصوح نے پڑھ کر
اور مطالب پہ کی بہ غور نظر

کیا اس دم علیم سے یہ خطاب
گو مضامین ان کے بھی ہیں خراب

پر بہ فضلِ خدائے ذوالاحسان
ہے تمھاری طرف سے اطمینان

Scanned with CamScanner

نہیں تم سے خیال کچھ مجھ کو ‫ ‫ ان کتابوں کو چاہے رہنے دو
ہے اگرچہ مطالعہ ان کا ‫ ‫ خالی از معصیت نہیں بیٹا
علیم: رکھنے سے ان کتابوں کے حاصل ‫ ‫ جو نہ ہوں دیکھنے کے بھی قابل
نصوح: اے مرے دل کے چین نورِ نگاہ ‫ ‫ یہی مرضی ہے گر تو بسم اللہ
لایا فوراً علیم حکم بجا ‫ ‫ ان کتابوں کو آگ میں جھونکا
دیکھادیکھی علیم بھائی کی ‫ ‫ کی یہ تیزی میاں سلیم نے بھی
آپ کو بھی کلیم نے تھا دیا ‫ ‫ کہیں واسوخت اک امانت کا
دوڑ کر یہ اسے اٹھا لائے ‫ ‫ تاکہ پیار ان پہ باپ کو آئے
آگ کا شعلہ جو بھڑکتا تھا ‫ ‫ اس میں واسوخت کو بھی ڈال دیا
خرمنِ عشرتِ کلیم ادھر ‫ ‫ ہو چکا جبکہ جل کے خاکستر
پا کے فرصت نصوحِ نیک نہاد ‫ ‫ آیا بیوی کے پاس با دلِ شاد
بیوی: تم کو جس کی تلاش تھی اتنی ‫ ‫ کہو پرچہ وہ ہاتھ آیا بھی؟
نصوح: گو کہ کاغذ نہ میں نے وہ پایا ‫ ‫ مدعا پر مرا نکل آیا
بیوی: ہاں ابھی کوئی کہہ رہا تھا یہاں ‫ ‫ یہ لگا دی تھی تم نے آگ کہاں؟
نصوح: کچھ کتابیں کلیم کی تھیں بہم ‫ ‫ میں نے ان کو جلا دیا بیگم
بیوی: ایسے غصے سے بھی خدا کی پناہ ‫ ‫ کہ جلا دیں کتابیں تم نے واہ
ہے جلانا گناہ کاغذ کا ‫ ‫ پھر بھلا ذکر ہے کتاب کا کیا
کوئی پرزہ پڑا جو پاتے ہیں ‫ ‫ لوگ اسے آنکھوں سے لگاتے ہیں
قاعدہ ہے کسی کتاب کو گر ‫ ‫ لگتی ہے بھولے سے کہیں ٹھوکر
چوم کر توبہ توبہ کرتے ہیں ‫ ‫ سب سرآنکھوں پہ اس کو دھرتے ہیں
نصوح: کہتی ہو سچ تم اے خجستہ سیَر ‫ ‫ لوگوں کی یہ زیادتی ہے مگر
اس کی بے کار اتنی عزت ہے ‫ ‫ کیونکہ کاغذ ہے ایک بے جاں شے
وہ کتابیں ہیں قابلِ توقیر ‫ ‫ جن میں مضمون عمدہ ہوں تحریر

Scanned with CamScanner

نعت یا حمدِ خالقِ باری   حق پرستی خیالِ دیں داری
جو کتابیں جلائیں میں نے ابھی   تھیں پُر از شرک و کفر و بے دینی
بے حیائی میں رکھتی تھیں نہ جواب   فحش سے تھی بھری ہر ایک کتاب

بیوی: لکھی ہوتی ہیں کیا کتابوں میں   سچ کہو یہ بُری بُری باتیں؟

نصوح: کیا فرشتے فلک سے لاتے ہیں؟   آدمی ان کو بھی بناتے ہیں
پھر یہ سمجھو کہ حضرتِ انساں   کیسے سرکش ہیں اور نافرماں
ہے کتابوں میں شرک و کفر بھرا   یوں دکھایا ہے زورِ طبعِ رسا
واقفیت نہیں ہے۔ کیا تم کو؟   جانتی شعر و شاعری کو تو ہو

بیوی: اس قدر حال ہے مجھے معلوم   دیکھی اکثر کتابیں ہیں منظوم
پر بُری بات ان میں کوئی بھی   دیکھنے میں مرے نہیں آئی
سنتی ہوں میں کلیم کو تھا یہ ذوق   شعر اور شاعری کا تھا کچھ شوق
اور ہے یہ بات قابلِ تعریف   اس کی ہر ایک کرتا ہے توصیف

نصوح: ہو جسے فنِ شاعری حاصل   ہے وہ انسان قدر کے قابل
شاعری اک مذاقِ علمی ہے   واقفیت زباں کی ہوتی ہے
واقعی اس لحاظ سے یہ فن   قابلِ قدر ہے بہ وجہِ حَسَن
قابلیّت کو اپنی لوگ مگر   صرف کرتے ہیں بے محل اکثر
حسن کو عیب یہ بناتے ہیں   کہ بُرے راستے۔ پہ جاتے ہیں
کیوں نہ ہو ایسی شاعری مذموم   جس میں ہو کذب و افترا منظوم
مدح بے جا ہے باعثِ ذلت   ہجوِ مومن ہے داخلِ غیبت
شاعروں کو نہیں خدا کی پناہ   ادبِ عیسیٰ و کلیم اللہ
ہیں یہ مضموں خلافِ شرعِ نبی   نہیں اس معصیت کی حد کوئی
ہے اچھلتا عمامہ زاہدوں کا   کرتے ہیں اہلِ دیں سے استہزا
ہوتی ہے دین و شرع کی توہیں   خوف کچھ کفر و معصیت سے نہیں

Scanned with CamScanner

بیوی: ہے اگر شاعری اسی کا نام تو پھر اس شاعری کو میرا سلام

نصوح: کیا نہیں یاد واقعہ وہ اب پڑھتی تھیں مجھ سے تم گلستاں جب

بیوی: دودھ جس دن حمیدہ کا تھا چھٹا تھا اسی دن اسے شروع کیا

نصوح: یاد ہے یہ بھی جا بہ جا اکثر پھیرتا تھا قلم میں سطروں پر؟

بلکہ تھے بعض صفحے بھی ایسے سادہ کاغذ سے جو چھپائے تھے

بیوی: رتی رتی مجھے ہے سب کچھ یاد یوں وہ چوتھائی سے کٹی تھی زیاد

نصوح: باتیں ایسی لکھی تھیں بیہودہ جن کو یوں تم سے میں چھپاتا تھا

بیوی: سچ کہو، ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ ہو مشکل سمجھ کے چھڑواتے

نصوح: پھر یہ ہے اُس کتاب کی حالت پند میں جس کی ہے بڑی شہرت

اور ہے اُس بزرگ کی تصنیف جس کی ہر ایک کرتا ہے تعریف

جو ہے دنیا میں باعثِ برکت نام کی جس کے کرتے ہیں عزت

کب مسلماں خموش رہتے ہیں رحمۃ اللہ علیہ. کہتے ہیں

بس یہ عزّ و وقار ہے ان کا اولیا میں شمار ہے ان کا

جو کتابیں کہ دی ہیں میں نے جلا ہیں خرافات سب وہ اس سے سوا

بیوی: کیوں جلائیں کتابیں وہ تم نے؟ بک بکا جاتیں کچھ تو قیمت سے

تھیں وہ داموں کی چیز یا کہ نہیں؟ کس لیے پھر پڑی نہ رہنے دیں؟

نصوح: یاد ہے کوٹھری میں اگلے سال سانپ نکلا تھا اے خجستہ خصال

کہتے تھے سب خیال ہے تم کو جس طرح ہو سکے اسے مارو

تم نے اس سانپ کے لیے نہ کہا مارتے کیوں ہو رہنے بھی دو پڑا

اس کی خاطر یہ بات بھی نہ کہی رہنے بھی دو خرید لے گا کوئی

ٹھیک کہتا ہوں تم سے میں بہ خدا وہ کتابیں تھیں موذی اس سے سوا

بک کے جو ہاتھ آتے ان کے دام بڑھ کے چوری کے مال سے تھے حرام

اور کیا ہے کلیم کو پھٹکار زہر اسی سانپ کا ہے اس پہ سوار

Scanned with CamScanner

بیوی: کچھ ہے اس زہر کی دوا آخر؟ کوئی منتر بھی ہے بھلا آخر؟
نصوح: کون سے درد کا علاج نہیں دین و اخلاق کی کتابیں تھیں
ہے مگر کون دیکھنے والا اترے پھر کس طرح سے زہر بھلا

(خاتمہ)

مر چکا جب کلیم نیک انجام ہوئی کوشش نصوح کی بھی تمام
کیونکہ جتنے تھے اور چھوٹے بڑے وہ تو سب تھے درست ہو ہی چکے
مطمئن تھا نصوح نیک اساس کر چکا تھا علیم بی اے پاس
آئے تھے گو بہ اشتیاق تمام متعدد ملازمت کے پیام
چاہتا تھا جو نفعِ قوم علیم اس کو بھاتا تھا صیغۂ تعلیم
سنو حالِ سلیم نیک سیَر ہوا حاذق طبیب وہ بڑھ کر
گذرے دہلی میں جس قدر بھی حکیم کرتے ہیں اس کے نام کی تعظیم
اب حمیدہ کا حال باقی ہے اک وہی خوش خصال باقی ہے
علم کے ساتھ اس کی عمر بڑھی حفظ قرآں کیا حدیث پڑھی
نہیں کچھ جھوٹ اس میں سچ ہے یہ بات شہر میں جس قدر ہیں مستورات
علم کا ان میں کچھ جو چرچا ہے بی حمیدہ کا سب وہ صدقہ ہے

❁❁

اکبر کی علامت سازی

ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط کا اثر اکبر کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کا بنیادی موضوع ہے۔ قدیم و جدید کا تصادم، مغربیت کا بڑھتا ہوا غلبہ، مشرقیت کی پسپائی، نئی قدروں کے مقابل پرانی قدروں کی پامالی، ہندوستانیوں کی تہذیبی کشمکش، اور ایک سماجی انقلاب کے مختلف مظاہر وغیرہ۔ اسی بنیادی موضوع کے ضمنی موضوعات ہیں جو اکبر کی شاعری میں بار بار اور طرح طرح سے اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ اکبر سے پہلے ان موضوعات کو اس التزام اور اہتمام کے ساتھ نہیں برتا گیا تھا۔ اقبال کی شاعری کی طرح یہ بھی ایک نئی قسم کی شاعری تھی اور اقبال ہی کی طرح اکبر کو بھی اپنی شاعری کے لیے نئی علامتیں درکار ہوئیں۔ اقبال ہی کی طرح اکبر نے بھی کچھ پرانی علامتوں مثلاً شمع، چراغ، شیخ وغیرہ کو نئے مفاہیم میں استعمال کیا لیکن بہت سی ایسی علامتیں وضع بھی کیں جو مجرد الفاظ تک کے طور پر ہماری روایتی شعری زبان میں شامل نہیں تھیں۔ اس کا خاص سبب یہ ہے کہ اکبر نے اپنی بیشتر علامتیں انگریزی لفظوں سے بنائی ہیں، اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ ان علامتوں کی تعداد سوا سو سے متجاوز ہے تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ اکبر ہمارے سب سے بڑے علامت ساز شاعر ہیں اور ان کے یہاں ایک بالکل نیا اور مکمل علامتی نظام کارفرما ہے۔

اکبر کی علامتوں پر گفتگو کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ایک فہرست (جو مکمل نہیں ہے) الفبائی ترتیب کے ساتھ پیش کر دی جائے۔ یہ فہرست کچھ اس طرح ہے:

آنر، آئس کریم، اخبار، اذان، اسپتال، اسپنسر، اسپیچ، استانی، اسٹیج، اسکول، امتحان، انجن، انگریز، انگریزی، انگلش، اونٹ، ایروپلین، بابو، بال، بجلی، بدھو، بسکٹ، بگل، بل، بلب، بندر، بنگلہ، بوزنہ، پارک، پاکٹ، پالسی، پالش، پانی، پانیر، پائپ، پتلون، پٹرولیم، پریڈ،

پلیٹ، پنشن، پھاگن، پیانو، پیرس، پیرو، تار، تھیٹر، ٹائپ، ٹٹو، ٹم ٹم، نیچر، جاکٹ، جمن، چاے، چراغ، چوٹ، چندہ، حسو، حقہ، خضر، دربار، دسمبر، ڈارون، ڈاکٹر، ڈبل روٹی، ڈنر، ڈولی، رجسٹر، ریل، سائنس، سایہ، سرٹفکیٹ، سرجن، سڑک، شمع، شیخ، شیکسپیئر، صاحب، صلو، فٹن، فرنچ، فرنگن، فونوگراف، فیشن، قرآن، کالج، کل، کلرک، کلو، کمپ، کمیٹی، کنٹوپ، کوٹ، کورس، کونسل، کیروسین، کیک، گریجویٹ، گزٹ، گملے، لائسنس، لیکچر، لیمپ، لمنڈ، لنگوٹ، لونڈر، لیڈر، ماسٹر، مٹن، مس، مسٹر، مسواک، مشین، مل (اسٹوارٹ)، مل (کارخانہ)، مٹن، موٹر، ناول، نصیبن، نل، نیٹو، نیچری، وارنش، ووٹ، ہوٹل، ہیٹ، یورپ۔

اکبر کے کلام سے، بلکہ بڑی حد تک اس فہرست سے ہی، اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ علامتیں کن عناصر کی نمائندگی کر رہی ہیں۔ اس طرح یہ علامتیں آپ اپنی وضاحت کر دیتی ہیں، لیکن کہیں کہیں اکبر خود بھی کسی علامت کی وضاحت کر دیتے ہیں، مثلاً

بدھو سے صرف ہند کا مسلم مراد ہے　　مقصود عاجزی ہے غرور اک فساد ہے

چنانچہ اکبر کے یہاں بدھو اور اس قبیل کی مسلم عرفیتیں جمن، حسو، پیرو، کلو، صلو، نصیبن وغیرہ اور کچھ ہندو نام بھی پس ماندہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی علامتیں ہیں۔ کچھ شعر دیکھیے:

اسلام کی رونق کا کیا حال کہیں تم سے　　کونسل میں بہت سید، مسجد میں فقط جمن

خلل نہ شغل میں بدھو کے ہے نہ حسو کے　　کہ شیخ سدو بھی ہیں اور قدم رسول بھی ہے

فقط مذہب سے تم میں عزت وقوت کی ہے یہ بو　　وگرنہ اور کیا نسبت، کجا ولیم کجا کلو

یہ بولے رو کے پیرو اور گیا دین　　دھرم دنیا سے اٹھا اور گیا دین

پوچھتے کیا ہو کہ تو پیرو ہے یا ہرمن ہے　　بندہ جو کچھ ہے بہ ہر حالت بلا لائسنس ہے

حکم انگلش کا ملک ہندو کا　　اب خدا ہی ہے بھائی صلو کا

رہیں ہر پھر کے آیا بی نصیبن　　وہ گو اسکول میں برسوں پڑھا کیں

اسی طرح کالج کی علامت جو اکبر کے یہاں کثرت سے استعمال ہوئی ہے، اس طرح واضح

ہوتی ہے:

نئی تعلیم نے کھویا بزرگانہ مدارج کو
بنایا تو نے چندوں کی فراوانی سے کالج کو

اکبر نے کالج کو نئی تعلیم کی علامت بنا کر اس کے بہت سے نقائص ظاہر کیے ہیں۔ مثلاً کالج کی تعمیر مذہبی عقائد کو مجروح کر رہی ہے:

نظر ان کی رہی کالج میں بس علمی زوائد پر
گرا کیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر

طفلِ دل محوِ طلسمِ رنگِ کالج ہو گیا
ذہن کو تپ آ گئی مذہب کو فالج ہو گیا

کالج میں مذہبی تعلیم اور نماز کا رسمی بندوبست بھی اکبر کے طنز کا نشانہ بنتا ہے:

کالج ہے دنیوی فوائد کے لیے
قائم ہے یہ ایسے ہی مقاصد کے لیے

مسجد میں یہاں جو مولوی صاحب ہیں
کپتان ہیں مذہبی قواعد کے لیے

اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ کالج والوں کی نظر میں مذہب سے وابستگی تاریک خیالی اور کم عقلی کے مترادف ہو گئی۔ یہ قطعہ دیکھیے:

میں نے اکبر سے کہا آیئے حجرے میں مرے
اس چٹائی پہ نمازیں پڑھیں حسبِ دستور

چھوڑیے آپ یہ ہنگامۂ تعلیمِ جدید
کاٹ ہی دے گا کسی طرح خداوندِ غفور

بولا جھنجھلا کے کہ ہے سہل جہنم مجھ پر
اس کی نسبت کہ میں کالج میں ہوں احمق مشہور

تصوف بھی اس نئی تعلیم کا شکار ہوتا ہے:

لیڈر کو دیکھتا ہوں تصوف پہ معترض
کالج کے کیڑے پڑ گئے دلق فقیر میں

کالج کی تعلیم میں ایک بڑا عیب اکبر کے نزدیک یہ ہے کہ یہ طالب علم کی دماغ شوئی کر کے اس کے نسلی مزاج کو مسخ اور ذہنی پس منظر کو غائب کر دیتی ہے۔ ذیل کی رباعی اور شعر میں انھوں نے اس مضمون کو بہت عمدگی کے ساتھ ادا کیا ہے:

کالج میں کسی نے کل یہ نغمہ گایا
قومی خصلت کا سر سے اُٹھا سایہ

کہتے تھے ولد کو لوگ سِرٌّ لِاَبیہ
سِرٌّ لِلماسٹر کا وقت اب آیا

رنگ چہرے کا تو کالج نے بھی رکھا قائم
رنگ باطن میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا

نئی تعلیم حاصل کر لینے کے بعد بھی ہندوستانیوں کو اچھی ملازمتیں نہیں ملتی ہیں اور قوم کو حقیقتاً اس سے کوئی

Scanned with CamScanner

فائدہ نہیں پہنچ رہا ہے:

کالج میں دھوم مچ رہی ہے پاس پاس کی عہدوں سے آ رہی ہے صدا دور دور کی

(قطعہ)

باغوں میں تو بہار درختوں کی دیکھ لی کالج میں آ کے کانووکیشن کو دیکھیے
لیموے کاغذی تو بہت دیکھے آپ نے اب کاغذی ترقی نیشن کو دیکھیے

کالج کے متوازی اسکول ہے۔ اسکول کو اکبر نے زیادہ تر لڑکیوں کی نئی تعلیم کی علامت بنایا ہے جو انھیں کوئی دنیوی فائدہ پہنچانے کے بجائے حیا سے عاری اور خانگی فرائض سے غافل کر رہی ہے۔ بی نصیبن والا شعر اوپر گذر چکا، کچھ اور شعروں میں اس علامت کی کارفرمائی دیکھیے:

اپنی اسکولی بہو پر ناز ہے اُن کو بہت کمپ میں ناچے کسی دن اُن کی پوتی تو سہی
داخلِ اسکول ہو دختر تو کچھ حاصل کرے کیا نتیجہ صرف اگر بے باک ہو کر رہ گئی
شوہر افسردہ پڑے ہیں اور مرید آوارہ میں بیبیاں اسکول میں ہیں شیخ جی دربار میں
اُن سے بی بی نے فقط اسکول ہی کی بات کی یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

اور ذیل کا شعر، جو ایک پوری روایت کے خاتمے کا نوحہ ہے، کچھ تمہید چاہتا ہے۔ واجد علی شاہ کی بیگم نواب بادشاہ محل عالم کا بنایا ہوا ایک گیت اودھ کے مسلم گھرانوں میں بہت شوق سے گایا جاتا تھا۔ اس گیت کا نام ''ہل مل'' رکھا گیا تھا اس لیے کہ اس کا مکھڑا یہ ہے:

''ہل مل کے پپیا کو جائے ری ننديا''.

اکبر کہتے ہیں:

اب نہ ہل مل ہے نہ اب پپیا کا وہ معمول ہے اک ننديا تھی سو وہ بھی داخلِ اسکول ہے

نئی تعلیم ہی کے سلسلے میں اکبر نے مغرب اور مشرق کی علمی ادبی شخصیتوں کو بھی علامت بنایا ہے۔ مغربی علوم اور ادب فیشن میں داخل ہو رہے ہیں اور مشرقی افکار مسترد کیے جا رہے ہیں اور اس میدان میں مغرب مشرق پر غالب آتا جا رہا ہے۔ اکبر خود اس غلبے کو قبول کرنے پر تیار نہیں لیکن اسے

Scanned with CamScanner

ایک حقیقت تسلیم کرنے پر مجبور ہیں اور اس پر کڑھتے ہیں:

کتابِ دل مجھے کافی ہے اکبر درسِ حکمت کو
میں اسپنسر سے مستغنی ہوں مجھ سے مِل نہیں ملتا

غزالی و رومی کی بھلا کون سنے گا
محفل میں چھڑا نغمۂ اسپنسر و مِل ہے

ہماری محفلیں اب بھی لطیف اجزا سے مملو ہیں
بُزِ اخفش تھے قبل اس کے اب اسپنسر کے ٹٹو ہیں

مِل سے کہہ دو کہ تجھ میں خامی ہے
زندگی خود ہی اک غلامی ہے

بات بالکل صاف ہے پیچیدگی کچھ بھی نہیں
میں ہوں سعدی کا بھتیجا، وہ ہیں ملٹن کے غلام

دلوں پہ مارتے جاتے ہیں چھاپا شیکسپیئر
پڑھو گے حضرتِ سعدی کی بوستاں کب تک

ڈارون کو اس کے نظریۂ ارتقا کی وجہ سے اکبر نے مغرب کی پست خیالی کی علامت بنایا ہے۔ ان کا یہ قطعہ طنزیہ شاعری کے شاہکاروں میں شمار ہو سکتا ہے:

کہا منصور نے خدا ہوں میں
ڈارون بولے بوزنہ ہوں میں

ہنس کے کہنے لگے مرے اک دوست
"فکرِ ہر کس بہ قدرِ ہمتِ اوست"

اس علامت کے کچھ اور نمونے دیکھیے:

ڈارون صاحب یہ اچھا مسئلہ سمجھا گئے
دعویٰ مخدومیت میں مست ہر لنگور ہے

نیست کس مصروفِ کارِ خود بہ قلبِ مطمئن
یک فنافی الآنر است و یک فنافی الڈارون

(قطعہ)

جورِ فلک کا ماجرا آپ سے کیا بیاں کریں
تفرقہ دیکھیے زرا ہم پہ یہ ہیں عجیب دن

عقل سپردِ ماسٹر، مال سپردِ آنجناب
جاں سپردِ ڈاکٹر، روح سپردِ ڈارون

اور ڈارون ہی کے ذیل میں اکبر نے بندر، بوزنہ، لنگور کی بھی علامتیں بنائی ہیں:

تمھارے کھیت سے لے جاتے ہیں بندر چنے کیونکر
یہ بحث اچھی ہے اس سے حضرت آدم بنے کیونکر

سرافرازی ہو اونٹوں کی تو گردن کاٹیے ان کی
اگر بندر کی بن آئے تو فیضِ ارتقا کہیے

گلہ میں نے کیا مجھ کو ترقی دی نہیں تو نے
تو بولا ارتقا چپ رہیے بس، کیا آپ بندر ہیں؟

ان شعروں میں ڈارون اور بندر کے علاوہ کچھ مزید علامتیں دَر آئی ہیں یعنی آنر، ماسٹر، ڈاکٹر، اونٹ، ارتقا، اور ان شعروں کی پوری معنویت کو سمجھنے کے لیے ان مزید علامتوں سے واقفیت ضروری

Scanned with CamScanner

ہے۔ اکبر کے بہت سے شعروں نے کئی کئی علامتوں سے ترکیب پائی ہے، اور اکبر کی شاعری کا صحیح لطف اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب ہم اُن کی بنائی ہوئی علامتوں کے پورے نظام سے واقف ہوں۔ ان علامتوں کی جو الفبائی فہرست ہم نے پیش کی ہے اس کو دو بڑے خانوں — انگریزی اور ہندوستانی، یا مغربی اور مشرقی، یا جدید اور قدیم — میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پھر ان خانوں کے اندر مزید خانے بنائے جا سکتے ہیں اور ان میں بھی بعض کو ایک دوسرے کے مقابل رکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً انگریزی کے مقابل اردو، فارسی، عربی ہیں؛ صاحب کے مقابل نیٹو ہے؛ انجن، ریل، موٹر کے مقابل اونٹ، میانہ اور ٹٹو ہیں؛ اور اونٹ کے مقابل گاے ہے، یعنی اونٹ ایک طرف مشرقی وسائل سفر کی علامت ہے، دوسری طرف اسلام کی بھی علامت ہے۔ اکبر کے یہاں ان علامتوں کا استعمال دیکھیے:

(انگریزی، عربی)

اکبر مجھے شک نہیں تری تیزی میں — اور تیرے کلام کی دل آویزی میں
شیطان عربی سے ہند میں ہے بے خوف — لاحول کا ترجمہ کر انگریزی میں
حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی — اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

(صاحب، نیٹو)

مرزا غریب چپ ہیں، ان کی کتاب ردّی — بدھو اکڑ رہے ہیں صاحب نے یہ کہا ہے
میری نصیحتوں کو سن کر وہ شوخ بولا — نیٹو کی کیا سند ہے، صاحب کہیں تو مانوں
اکبر اس اندیشے میں رہتا ہے غرق — کافر و نیٹو میں ہے تھوڑا ہی فرق
کافری کا ہے علاج ایمان سے — نیٹویت تو ہے لپٹی جان سے
نیکوں کے حق میں کج ادائی نہ کرو — اللہ کے ساتھ بے وفائی نہ کرو
نیٹو بھی رہو گے اور مرو گے بھی ضرور — کہتا ہوں کہ دعواے خدائی نہ کرو
نیٹویت پر کیا میں نے جو اظہار خیال — سن کے صاحب نے کہا سچ ہے مگر ہم کیا کرے

صاحب کے سلسلے میں یہ بات ذہن میں رہنا چاہیے کہ اکبر کے یہاں یہ علامت خالص انگریزوں کے علاوہ اُن مغرب زدہ ہندوستانیوں کی بھی نمائندگی کرتی ہے جنھوں نے انگریزوں کے طور طریقے اختیار کر لیے ہیں، مثلاً:

رہ گئے نا آشنا، احباب غائب ہو گئے ہم نفس دو اک جو باقی تھے وہ صاحب ہو گئے

(اونٹ، ریل، انجن)

اے شیخ جب نکیل نہیں دستِ قوم میں پھر کیا خوشی جو اونٹ ترے ریل ہو گئے

یا الٰہی ہم غریبوں کا کہاں ہو گا نباہ بدگمان اُشتر سے ہیں جب حضرتِ انجن نواز

(اونٹ، گائے)

گائے کا تو کچھ ٹھکانا بھائی گاندھی نے کیا شیخ جی کا اونٹ کس کل بیٹھتا ہے دیکھیے

اونٹ نے گایوں کی ضد پر شیر کو ساجھی کیا پھر تو مینڈک سے بھی بدتر سب نے پایا اونٹ کو

سینگ غائب ہے تو پھر گردن اٹھانا ہے فضول حضرت اُشتر سے کہہ دو، یا لدیں یا ذبح ہوں

ہند میں شیخ رہ گیا افسوس اونٹ گنگا میں بہہ گیا افسوس

مغربی ذوق ہے اور وضع کی پابندی بھی اونٹ پر چڑھ کے تھیٹر کو چلے ہیں حضرت

شیخ صاحب چل بسے کالج کے لوگ اُبھرے ہیں اب اونٹ رخصت ہو گئے پولو کے گھوڑے رہ گئے

(ٹٹو، موٹر)

کیا طعن شیخ جی کا ٹٹو جو اڑ گیا ہے حضرت کا بھی تو موٹر آخر بگڑ گیا ہے

اوپر کے شعروں میں پانچ جگہ شیخ کی علامت بھی استعمال ہوئی ہے۔ یہ اکبر کی بنائی ہوئی سب سے اہم اور ان کے کلام میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والی علامت ہے، اور یہ اکبر کی سب سے زیادہ کثیر المفہوم علامت بھی ہے۔ اس کے بعد کثرتِ استعمال کے لحاظ سے انجن اور پھر مس اور کالج کی علامتیں ہیں جو اکبر نے طرح طرح سے استعمال کی ہیں۔ کالج کی مثالیں پیش کی جا چکی ہیں۔ اب انجن، مس اور شیخ کی علامتوں کا جائزہ لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ان علامتوں کے ذیل میں اکبر کی دوسری علامتیں بھی آ گئی ہیں۔ پہلے انجن اور اس کے متعلقات کو دیکھیے۔

اکبر کے یہاں انجن محض ایک ترقی یافتہ وسیلۂ سفر کی نہیں بلکہ اس پورے صنعتی، مشینی اور مادی دور کی علامت ہے جو ہندوستان بلکہ مشرق پر مغرب کے تسلط کو مستحکم کر رہا ہے اور مشرق کو مغرب کا محتاج بنا رہا ہے:

Scanned with CamScanner

اس کا پسینا ہے اور اس کے ہیں بھپارے　　یورپ نے ایشیا کو انجن پہ رکھ لیا ہے

یہ مادّی دور ذہنوں پر حاوی آ رہا ہے اور مذہب کی روحانیت کو اس انجنی دور کی مادیت سب سے زیادہ نقصان پہنچا رہی ہے:

آگے انجن کے دین ہے کیا چیز　　بھینس کے آگے بین ہے کیا چیز

اذانوں سے سوا بیدار کن انجن کی سیٹی ہے　　اسی پر شیخ بے چارے نے چھاتی اپنی پیٹی ہے

تسبیح وہ اب کہاں وہ تہلیل کہاں　　قرآنِ مجید کی وہ ترتیل کہاں

کل کے آگے خیالِ فردا کس کو　　جب ریل ہے سامنے تو جبریل کہاں

مال گاڑی پہ بھروسا ہے جنھیں اے اکبر　　اُن کو کیا غم ہے گناہوں کی گراں باری کا

انجن کی موجد قوم کو خطاب کر کے کہتے ہیں:

عیسیٰ نے دلِ روشن کو لیا اور تم نے فقط انجن کو لیا
کہتے ہو کہ وہ تھے باپ سے خوش اور تم ہو خالی بھاپ سے خوش

اس ایجاد نے سفر کے مہماتی طلسم، منزل کی جستجو، راستے کی تلاش، بھٹک جانے کے اندیشوں کے ساتھ صراطِ مستقیم پا جانے کی لذت کو قصۂ پارینہ بنا دیا ہے اس لیے کہ یہ مشین نا آشنائے راہ مسافر کو بھی اپنے آپ مقررہ راستے پر چلاتی ہوئی منزل تک گھسیٹ لے جاتی ہے، اور اب مسافر کو کسی رہنمائی کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اکبر نے انجن اور ریل کی خود تراشیدہ علامتوں کے ساتھ رہنما کی روایتی علامت خضر کو ملا کر اس موضوع کو خوب خوب برتا ہے، مثلاً:

کہتے ہیں راہِ ترقی میں ہمارے نوجواں　　خضر کی ہم کو نہیں حاجت جہاں تک ریل ہے

ہو مبارک جستجوے خضر انھیں　　ہم تو اب انجن کے پیچھے ہو لیے

پیچھے انجن کے بس اب ہولیں مسلمان بھائی　　اب انھیں خضر کی اور راہ کی حاجت کیا ہے

بلکہ اکبر اپنے وقت سے آگے بڑھ کر انجن کو مشینوں کی پیدا کردہ اس ماحولیاتی آلودگی کی علامت بنا دیتے ہیں جو اُن کے بعد آنے والے زمانے میں ساری دنیا کے لیے خطرہ بن گئی:

ابھی انجن گیا ہے اس طرف سے　　کہے دیتی ہے تاریکی ہوا کی

اور مشین فطرت کو کس طرح مسخ کر رہی ہے اسے بھی اکبر نے اسی علامت کے ذریعے بڑے پرسوز

Scanned with CamScanner

انداز میں بیان کیا ہے:

تنہائی و طاعت کا یہ دور ہے اب دشمن ـــــ پیڑوں پہ نہ وہ طائر، صحرا پہ نہ وہ جوبن
جنگل کے جو تھے سائیں وہ ریل کے ہیں پائیں ـــــ املی کی جگہ سگنل، قمری کی جگہ انجن

لیکن اکبر اس پر بھی اصرار کرتے ہیں کہ قضا و قدر کے بہت سے مسئلے اور سفرِ حیات کے بہت سے مرحلے ہیں جہاں مشینی وسائل بے اثر ہو جاتے ہیں۔ اس مفہوم کو بھی اکبر نے اسی علامت کے ذریعے ادا کیا ہے، مثلاً:

اے انجنوں کا خیال کیا جو ہو محو تاروں کی چال کا
وہ نظر زمین پہ کیوں جھکے کہ جو آسماں سے قریب ہے

برق و بخارات کا زور اے حکیم ـــــ کب ہے پئے روح خطِ مستقیم
تار پہ جاتے نہیں اہلِ نظر ـــــ ریل سے کھنچتا نہیں قلب سلیم

دنیا سے میل کی ضرورت ہی نہیں ـــــ مجھ کو اس کھیل کی ضرورت ہی نہیں
درپیش ہے منزلِ عدم اے اکبر ـــــ اس راہ میں ریل کی ضرورت ہی نہیں

دل کا ٹکڑا تو رہا باقی پئے نذرِ خدا ـــــ ریل میں کیا غم جو اکبر کھیت میرے تپ گئے

اس کو چکر ہی رہا اور یہ خدا تک پہنچا ـــــ دلِ پُرسوز جو ہاتھ آئے تو انجن کیسا

انجن کی علامت کے کچھ اور رُخ دیکھیے:

کمر بندھی نظر آتی ہے آب و آتش کی ـــــ اُدھر سے ٹل اِدھر انجن کی آمد آمد ہے

شیخ سے چھوٹے، الجھے انجن میں ـــــ اُس میں بک بک تھی اِس میں بھک بھک ہے

میں تو انجن کی گلے بازی کا قائل ہو گیا ـــــ رہ گئے نغمے حدی خوانوں کے ایسی تان لی

انجن کو یہ آگ ہو مبارک ـــــ انگریز کو بھاگ ہو مبارک

پڑے گنگناتے تھے لالہ زنجن ـــــ نہ آنکھوں میں انجن نہ دانتوں میں منجن

چھٹے ہم سے بالکل وہ اگلے طریقے ـــــ کہاں کھینچ لے جائے گا ہم کو انجن

نغمۂ مرغ سحر سے نہیں انجن کو غرض ـــــ پیٹ انگاروں سے بھر دیجیے بھک میں رہیں

زیرِ پا ہے ریلوے اور سر پہ ہے انجن کی بھاپ ـــــ اب یہ کہنا چاہیے نیچے بھی آپ اوپر بھی آپ

اُن کی خدمت میں بس اتنی عرض ہے واعظ صحیح ہے مذاق حضرت

اونٹ پر چڑھنا تو سنت ہے ضرور ریل پر چڑھنا مگر اب فرض ہے

ریلوے کو فائدہ جن سے ہے وہ لیڈر تو ہیں رعب میدانوں میں تھا جن سے وہ غازی اب کہاں

مشینوں نے کیا نیکوں کو رخصت کبوتر اُڑ گئے انجن کی پیں سے

مس کی علامت انگریز عورتوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ ان بے حجاب اور بے باک عورتوں نے حسن وعشق کے مشرقی معیار بدل دیے ہیں اور اہلِ ہند کی آنکھیں ان گوری چٹی بی بیوں کو دیکھ کر چکا چوند ہوئی جا رہی ہیں۔ اکبر کے یہاں اس علامت کے مختلف رُخ نمایاں ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ مسیں حسین ہونے کے باوجود مخصوص نسوانی کشش سے عاری اور خود فروش ہونے کے باوجود عشاق کے لیے بے فیض ہیں:

اس مس شوخ سے راحت نہ ملے گی مجھ کو عمر بھر خیر، وہ اک شب تو بھلا خوش رکھے

کچھ نہ ہاتھ آئے مگر عزت تو ہے ہاتھ اس مس سے ملانا چاہیے

مری تقریر کا اس مس پہ کچھ قابو نہیں چلتا جہاں بندوق چلتی ہے وہاں جادو نہیں چلتا

بوے وفا نہیں ہے مسوں کے صبول میں بس رنگ دیکھ لیجیے گملے کے پھول میں

ان اصنامِ جدید کی دوستی زر و مال بھی چاہتی ہے اور بے چارے عاشق کو یہ دوستی نباہنے کے لیے طرح طرح کی مدوں میں خرچ کرنا اور قسم قسم کے بلوں سے دو چار ہونا پڑتا ہے:

افعیِ زلفِ مس کا تو سودا بُرا نہیں پیچیدگی جو کچھ ہے فقط اس کے بل میں ہے

مِسانِ خود فروش آخر فرستادند ایں بل ہا طلب کردند چنداں زر کہ خوں افتاد در دلہا

نشاطِ طبع برہم شد شکست آں رنگ محفل ہا الا یا ایہا الساقی ادر کاساً وناولہا

کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکل ہا

اور اس نئے طرز عاشقی کی تان بالآخر اس پر ٹوٹتی ہے کہ عاشق اپنا روایتی کردار چھوڑ کر دنیاوی علائق کا اسیر ہو جاتا ہے:

Scanned with CamScanner

پریوں کے عاشقوں کو سودا ہوا مسوں کا — جو پھاڑتے تھے جامہ اب کوٹ سی رہے ہیں
جو حکمِ بت کی جگہ حکمِ مس ہوا قائم — تو عشق چھوڑ کے ہم نے بھی نوکری کر لی

اکبر کی دو بہت مشہور نظموں ''رات اس مس سے کلیسا میں ہوا میں دو چار'' اور ''اک مسِ سیمیں بدن سے کر لیا لندن میں عقد'' کے علاوہ بھی متعدد شعروں میں مس کی علامت کی مختلف معنویتیں سامنے آتی ہیں، مثلاً:

سر کش کو فکرِ حفظِ جاں اکبر کا شورِ الاماں — سائنس کا زور اک طرف حسنِ رُخِ مس اک طرف
حسنِ مس پر کر نظر، مذہب اگر جاتا ہے جائے — قدرداں کو نرخ کی کیا بحث اکبر مال دیکھ
حور مس کو مئے گلگوں کو پری کہتے ہیں — شیخ خوش ہوں کہ خفا ہم تو کھری کہتے ہیں
چٹھی اس مس کی ہے کہ یہ جادو ہے — دل جوشِ مفاخرت سے بے قابو ہے
ایسی پری اور مجھ کو پیارا لکھے — القاب میں دیکھیے ''ڈیر کلو'' ہے
محبت اپنی ہی پریوں سے رکھیں حضرتِ اِندر — مسِ مغرورِ لندن ان کی چیری ہو نہیں سکتی
آ گئی زلفِ مساں زلفِ بتاں پر غالب — پیچ ہوتے تھے بہم افعی و راسو کی طرح
نظارۂ مساں سے تر و تازہ رکھیے آنکھ — تفریح پارک میں سحر و شام کیجیے
مس کو دیکھا عاشقِ زلفِ چلیپا ہو گیا — مست تھا دل پھول کر دھسکی کا پیپا ہو گیا
قصۂ منصور سن کر بول اٹھی وہ شوخ مس — کیسا احمق لوگ تھا پاگل کو پھانسی کیوں دیا
ہیں لمپ عزیز، شمع بیگانہ ہے — جلتا ہے چراغ سے جو فرزانہ ہے
سب کی ہے مسوں کے روئے روشن پہ نگاہ — جو ہے نئی روشنی کا پروانہ ہے

کیا ذوقِ عبادت ان کو ہو جو مس کے لبوں کے شیدا ہیں
حلوائے بہشتی ایک طرف، ہوٹل کی مٹھائی ایک طرف

مری فغاں پہ مسِ ناشناس بول اٹھی — کہ بابوؤں میں تو عادت ہے غل مچانے کی

کہو یہ رندانِ ایشیا سے کہ بزمِ عشرت کی ٹھاٹھ بدلیں
اُڑن کھٹولا ہے اب مسوں کا گئی پری جان کی وہ ڈولی

وہ مس بولی میں کرتی آپ کا ذکر اپنے فادر سے — مگر آپ اللہ اللہ کرتا ہے، پاگل کا مافک ہے

Scanned with CamScanner

ہر چند کہ ہے مس کا لونڈر بھی بہت خوب بیگم کا مگر عطرِ حنا اور ہی کچھ ہے
شیخ صاحب دیکھ کر اس مس کو ساکت ہو گئے ماسٹر صاحب بہت کمزور تھے، چت ہو گئے

شیخ، جیسا کہ عرض کیا گیا، اکبر کی سب سے اہم، سب سے زیادہ مستعمل اور کثیر المفہوم علامت ہے۔ اکبر کی سب سے زیادہ متحرک علامت بھی یہی ہے اس لیے کہ شیخ طبقہ اپنا کردار بدلتا بھی رہتا ہے۔ بنیادی طور پر اکبر کا شیخ ہندوستان کے اس قدیم الخیال اور مذہب سے وابستہ مسلمان کی نمائندگی کرتا ہے جو اپنے فکری جمود اور بے عملی کی وجہ سے وقت کی دوڑ میں پچھڑا ہوا ہے۔ یہ اپنی ذات میں ایک ادارہ ضرور ہے لیکن تجدّد کے سیلاب میں یہ ادارہ اپنی وقعت اور اثر کھو کر فنا اور بقا کی کشمکش سے دوچار ہے اور اس صورت حال کی ذمہ داری بڑی حد تک خود اس پر بھی ہے۔ پہلے اس علامت کا بنیادی روپ دیکھ لیجیے:

سید اٹھے جو گزٹ لے کے تو لاکھوں لائے شیخ قران دکھاتے پھرے پیسا نہ ملا
ابھرے ہیں عیب اُن کے اور خوبیاں دبی ہیں بے دین اگر نہیں ہیں تو شیخ جی غبی ہیں
حالِ دنیا سے بے خبر ہیں آپ گو تقدس مآب بے شک ہیں
شیخ جی پر یہ قول صادق ہے چاہِ زمزم کے آپ مینڈک ہیں

شیخ کی اسی صفت کو اکبر نے تثلیث اور تین کے ضلعے کے ساتھ یوں ادا کیا ہے:

شیخ تثلیث کی تردید تو کرتے نہیں کچھ گھر میں بیٹھے ہوئے والتین پڑھا کرتے ہیں
دل ان کے ساتھ باقی ہے نہ حاضر کا نہ غائب کا خدا ہی ہے جو بیڑا پار ہو اب شیخ صاحب کا
پیارا ہے ہم کو شیخ ہمارا بُرا سہی چاقو ولایتی نہیں دیسی چھرا سہی

مرید اُن کے تو شہروں میں اُڑے پھرتے ہیں موٹر پر
نظر آتے ہیں لیکن شیخ جی اب تک میانے میں

شیخ پر گو کہ رشک آتا ہے اونٹ کے سو لغات جانتے ہیں
ہیں مگر اونٹ پر ہمیں قابض کام کی ہم یہ بات جانتے ہیں
ساتھ ان کے مرا شیخ تو چل ہی نہیں سکتا بندر کی طرح اونٹ اچھل ہی نہیں سکتا

Scanned with CamScanner

نکالا شیخ کو مجلس سے اس نے یہ کہہ کر یہ بے وقوف ہے مرنے کا ذکر کرتا ہے
چندے کی مجلس میں پڑھیے رو کے قران مجید مذہبی محفل میں لیکن مثلِ دشمن جایئے
شیخ صاحب ہے یہی قومی ترقی کی شناخت روٹھنے سے کچھ نہیں ہے فائدہ من جایئے
شیخ صاحب کو نہیں شاعروں کی بات سے کام حسن کی قید نہیں، بس ہے مسمات سے کام

اور وہ مشہور شعر:

شیخ جی گھر نہ نکلے اور یہ کہلا دیا آپ بی اے پاس ہیں تو بندہ بی بی پاس ہے

انجن اور شیخ کی علامتوں کا تصادم اکبر کے یہاں اس طرح ملتا ہے:

سنتے نہیں ہیں شیخ نئی روشنی کی بات انجن کی ان کے کان میں اب بھاپ دیجیے
دونوں کے سُر ملیں یہ قریباً محال ہے انجن رہے جہان میں یا شیخ جی رہیں

شیخ کی اسی حیثیت، بلکہ بے حیثیتی، کا اثر ان کی آئندہ نسلوں پر کیا پڑ رہا ہے، اس کا اظہار اکبر نے شیخ کے بیٹوں کی ذیلی علامت کے ذریعہ اس طرح کیا ہے:

کچہریوں میں ہے پُرسش گریجوئیٹوں کی سڑک پہ مانگ ہے قلیوں کی اور میٹوں کی
نہیں ہے قدر تو بس علم دین و تقویٰ کی خرابی ہے تو فقط شیخ جی کے بیٹوں کی
شیخ جی کے دونوں بیٹے باہنر پیدا ہوے ایک ہیں خفیہ پولیس میں، ایک پھانسی پا گئے

لیکن بالآخر شیخ کے طبقے تک کو نیا انقلاب اپنی لپیٹ میں لینے لگتا ہے اور اس کے بھی بعض افراد میں تبدیلی رونما ہوتی ہے، اسی کے ساتھ اس علامت کا تحرک اچانک بڑھ جاتا ہے۔ پہلے یہ تبدیلی خفیف سی نظر آتی ہے:

شیخ کی وہ دھج نہیں، وہ شیخ کی داڑھی نہیں دوستی تو سب سے ہے پر اس قدر گاڑھی نہیں
محلے میں نہ کی جب شیخ کی وقعت عزیزوں نے تو بے چارہ کمیٹی ہی میں جا کر کود اُچھل آیا
دَیر میں ہنستے ہیں اب، کعبے میں برسوں رو لیے شیخ جی کرتے ہی کیا، بابو کے پیچھے ہو لیے
مذہب چھڑایا عشوهٔ دنیا نے شیخ سے دیکھی جو ریل اونٹ سے آخر اُتر پڑے

پھر یہ حالت ہوتی ہے:

تہذیبِ مغربی کی بھی ہے وارنش غضب ہم کیا جنابِ شیخ بھی چکنے گھڑے ہوے

Scanned with CamScanner

شیخ دم ساز پیانو ہو کے بھولے اپنی لے گو سُریلے ہو گئے لیکن بُری گت ہو گئی

اور آخر نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے:

نہیں اب شیخ صاحب کی وہ عادت وضو کی اور مناجاتِ سحر کی
مگر ہاں چائے پی کر حسب دستور تلاوت کرتے ہیں وہ پانیر کی

اور اب شیخ اپنے اندر تبدیلی کا خود بھی اعتراف کرنے لگتا ہے:

شیطاں نے دیا ہے شیخ جی کو نوٹس بالکل ہی گیا ہے زور اب آپ کا ٹوٹ
آئندہ پڑھیں گے آپ لاحول اگر فوراً داغوں گا اک ڈیفیمیشن سوٹ
شیطاں کا سنا جو شیخ صاحب نے قول بولے کہ فضول تجھ کو آتا ہے یہ ہول
میں خود ہوں بدل گیا زمانے کے ساتھ پڑھتی ہے مجھی پہ اب یہ دنیا لاحول

شیخ کی اس تبدیلی کے مضمون کو سعدی کے قطعے "گِلے خوش بوے در حمام روزے / رسید از دستِ محبوبے بہ دستم" کے انداز میں باندھ کر اکبر نے پیروڈی کا یوں کمال دکھایا ہے:

یکے ذی علم در اسکول روزے فتاد از جانبِ پبلک بہ دستم
بدو گفتم کہ کفری یا بلائی کہ پیشِ اعتقاداتِ تو پستم
بگفتا مسلم مقبول بودم ولے یک عمر با ملحد نشستم
جمالِ نیچری در من اثر کرد وگرنہ من ہماں شیخم کہ ہستم

اور اب شیخ مس کے بھی اسیر ہو جاتے ہیں:

بولی وہ مس کہ شیخ جی پہلے مرے حریف تھے اب سمجھ اُن کو آ گئی دوست بھی ہیں غلام بھی

اور خلاصۂ کلام یہ کہ:

دنیا ہی اب درست ہے قائم نہ دین ہے زر کی طلب میں شیخ بھی کوڑی کا تین ہے

شیخ کی علامت اکبر کے یہاں ان مذہبی ظاہرداروں کی بھی نمائندگی کرتی ہے جو خریدۂ سرکار ہو چکے ہیں۔ ان کو اکبر نے "شیخ کمپ" کا نام دیا ہے اور ان کے ذکر میں طنز و ظرافت کے ساتھ تلخ نوائی کی بھی آمیزش کر دی ہے:

اب شیخ شہر رہ گئے مُردوں کے واسطے زندوں کو لے مریں گے ہمارے شیوخِ کمپ

Scanned with CamScanner

اسپیچ مذہبی میں بھی یکتا ہیں شیخ کمپ — لیکن یہ سب زبان پہ ہے، دل میں کچھ نہیں
ان کی کل کوششیں تھیں پولیٹکل — اس کو خالق کی جستجو نہ کہو
کمپ کے شیخ کو کہو مرحوم — قدس اللہ سرّہٗ نہ کہو

ہماری فہرست میں ابھی بہت سی علامتیں باقی ہیں مگر اُن کے بعد بھی اکبر کا خزانہ علامات خالی نہیں ہوتا۔ معمولی سی تلاش سے ان کے یہاں مزید متعدد علامتیں دستیاب ہو جائیں گی، لیکن اس تلاش کے بغیر بھی یہ بات بہ تکرار کہی جا سکتی ہے کہ اکبرالہ آبادی ہمارے سب سے بڑے علامت ساز شاعر ہیں۔

❁❁

Scanned with CamScanner

خوفناک دنیا

(سیاحت نامہ محمد علی شاہ)

1950 کے آس پاس لکھنؤ میں ایک ڈاکٹر محمود شاہ مشہور معالجِ دنداں تھے۔ ان کی اہلیہ رضیہ صاحبہ میرے بڑے بھائی ڈاکٹر اختر مسعود رضوی کے ساتھ لکھنؤ یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کر رہی تھیں، اسی سلسلے سے بھائی صاحب کا ڈاکٹر صاحب کے یہاں آنا جانا تھا۔

ایک بار وہ گئے تو ڈاکٹر صاحب اور ان کی بیگم گھر پر موجود نہیں تھے، البتہ ایک بزرگ برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سے اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ معلوم ہوا وہ ڈاکٹر صاحب کے بڑے بھائی ہیں۔ بھائی صاحب کو شکار کا بہت شوق تھا، اس کا ذکر آیا تو بزرگ نے فرمایا کہ وہ بھی شکار بہت کھیل چکے ہیں۔ سیر و سیاحت بھی بہت کر چکے ہیں اور اپنے شکاروں اور سیاحتوں کے بارے میں کتابیں بھی لکھ چکے ہیں۔ پھر وہ اٹھ کر مکان کے اندر گئے اور ایک کتاب لا کر ان کو دی۔ یہ ان کے سیاحت نامے کا دوسرا حصہ تھا۔ نام خوفناک دنیا، ذیلی عنوان ''جزیرہ بورنیو میں سفر اور جنگلوں میں شکار''، مصنف ڈاکٹر سید محمد علی شاہ سبزواری، ڈینٹل کالج، چوک آرہ (بہار)۔''

مجھے اس کتاب نے موہ لیا۔ بار بار پڑھتا اور ہر بار نیا لطف ملتا تھا۔ بہت دن تک یہ کتاب واشنگٹن اِرونگ کی الحمرا کے بعد میری سب سے پسندیدہ کتاب رہی۔ پھر یہ ہمارے یہاں سے غائب ہو گئی۔

پندرہ سولہ برس کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی کی ٹیگور لائبریری میں اس کی ایک جلد ملی۔ یہ بھی کتاب کا وہی دوسرا حصہ تھا۔ اتنی مدت کے بعد پڑھنے پر بھی کتاب اتنی ہی بلکہ اس سے بھی بہتر معلوم ہوئی۔

Scanned with CamScanner

مجھے اس کے پہلے حصے کی فکر ہوئی اور اس دوسرے حصے کے آخر میں خاتمے پر مصنف کی یہ عبارت نظر آئی:

اس کے بعد کے حالات، واقعات اور حادثات اور بھی زیادہ دلچسپ ہیں۔ وہ انشاء اللہ عنقریب اس کے تیسرے حصے میں آپ کے ملاحظے سے گذریں گے۔

اس تیسرے حصے کے بارے میں یہ بھی پتا نہیں چل سکا کہ چھپا بھی تھا یا نہیں۔ایک دو جگہ کتاب ملی مگر اس کا وہی دوسرا حصہ۔ 1995 کے قریب بہار کے مشہور شاعر جناب صابر آروی سے میری خط کتابت شروع ہوئی۔ وہ پٹنے میں مقیم تھے لیکن ان کے نام کے ساتھ آروی کا لاحقہ دیکھ کر مجھے محمد علی شاہ یاد آ گئے جن کا ڈینٹل کالج آرہ میں تھا۔ میں نے ان سے محمد علی شاہ اور کتاب خوفناک دنیا کے بارے میں دریافت کیا۔انھوں نے جواب میں لکھا:

آپ کا نامۂ خلوص مورخہ 20 جولائی 1996 کل وصول ہوا۔اتفاق سے میرے بڑے بھائی سید ذاکر حسین صاحب آرہ سے تشریف لائے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر سید محمد علی شاہ صاحب کا تذکرہ آیا۔موصوف کو میں نے بھی اپنے اسکول کے تعلیمی دور کے زمانے میں دیکھا تھا۔ وہ میرے محلے مہادیوا میں رہتے تھے اور آرہ مارکیٹ کے اوپر کے حصے میں ان کا ڈینٹل کلینک تھا۔ ہمیشہ سوٹ اور ٹائی میں رہا کیے اور بہت ہلکی ڈاڑھی ٹھوڑی پر اور گھری مونچھ رکھتے تھے۔نہایت پر وقار اور پر نور شکل وشباہت کے انسان تھے۔ آرہ میں جب تک رہے اُن کا پیشے اور ذوق وشوق کے اعتبار سے شہر میں ایک اچھا خاصا اثر تھا۔اُن کے صاحبزادے جعفر صاحب میرے بڑے بھائی ذاکر صاحب کے آرہ ٹاؤن اسکول میں ہم جماعت تھے۔ہم لوگ انھیں جعفر بھائی جعفر بھائی کہتے تھے۔ بعد میں جعفر بھائی کلکتے چلے گئے۔ ڈاکٹر محمد علی شاہ صاحب آرہ چھوڑ چکے تھے۔ 1949 میں آئی اے کا امتحان دینے اور رزلٹ آؤٹ ہونے کے درمیان دو ماہ کے لیے میں اپنے ایک دوست جو اسلامیہ کالج میں تھے اور بیکر ہوسٹل میں رہتے تھے، سے ملنے [کلکتے] چلا گیا۔شام کو ٹہلتے وقت چورنگی میں جعفر بھائی سے ملاقات ہوگئی۔ پھر انھوں نے مجھے اپنا کارڈ دیا۔ وہ کولوٹولا اسٹریٹ میں چمڑے کے کاروبار سے منسلک ہو گئے تھے۔ اکثر میں ان کے

Scanned with CamScanner

یہاں چلا جاتا تھا۔ پھر میں پٹنہ واپس آ گیا اور پھر جعفر بھائی سے کوئی رابطہ نہیں ہو سکا۔

بڑے بھائی صاحب نے ان کی کتاب دیکھی ہے۔ میں نے بھی وہ کتاب دلچسپی سے پڑھی تھی اور اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ پڑھنے والے کو اپنے میں منہمک رکھتی تھی۔ اب وہ کتاب دستیاب نہیں ہے۔ آرہ میں بھیا کے ذریعے تلاش و جستجو ہوگی۔ یہاں بھی گورنمنٹ اردو لائبریری اور خدا بخش لائبریری میں دریافت کروں گا۔ پھر جیسا ہوگا لکھوں گا۔ (از پٹنہ، مورخہ 31 جولائی 1996)

میرے ادبی کاموں میں بہار کے حضرات نے ہمیشہ میرے ساتھ بہت تعاون کیا ہے۔ جناب صابر آروی کے ساتھ بھی میرا یہی تجربہ رہا۔ لیکن انھوں نے اسی پر بس نہ کرتے ہوئے اپنی تلاش جاری رکھی۔ آخر ایک دن مجھے ان کا بھیجا ہوا ایک پارسل ملا جس میں خوفناک دنیا حصہ اول، حصہ دوم اور سوم کی عکسی نقلیں تھیں جو انھوں نے بڑی تگ و دو کے بعد گورنمنٹ اردو لائبریری پٹنہ سے حاصل کی تھیں۔ کم کتابوں کی دستیابی سے مجھے اتنی خوشی حاصل ہوئی تھی جتنی خوفناک دنیا کے ان تینوں حصوں کے ملنے سے ہوئی۔

ڈاکٹر محمد علی شاہ کے کچھ اور سرسری حالات جو خوفناک دنیا سے معلوم ہوتے ہیں، یہ ہیں کہ وہ پنجاب کے رہنے والے تھے اور ان کے اجداد سبزوار (ایران) کے باشندے تھے۔ بچپن میں جب وہ پرائمری اسکول میں پڑھتے تھے تو بہت شریر اور اپنی پارٹی کے سردار تھے۔ کرکٹ، کبڈی اور کشتی میں سب سے آگے رہتے تھے۔ درختوں پر چڑھنے کے ماہر تھے اور اسکول کے تالاب میں پیراکی کے مقابلوں میں اول آتے تھے۔ اس کے علاوہ گدھوں کی پیٹھ پر سواری خوب کرتے تھے۔ موخر الذکر تینوں تفریحات ان کی جنگلوں کی زندگی میں خوب کام آئیں۔ ان کو بارہا جان بچانے یا خطرناک جنگلوں میں رات بسر کرنے کے لیے درختوں پر چڑھنا اور سونا پڑا، راستے میں پڑنے والے دریاؤں کو تیر کر پار کرنا پڑا اور وحشی ریڈ انڈینوں سے بچنے کے لیے انھیں گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر بیٹھ کر بھاگنا پڑا۔

اپنے پہلے سفر 1899 سے پہلے وہ کچھ ڈاکٹری پڑھ چکے تھے اور چھوٹی موٹی تجارتیں کرتے رہتے تھے۔ اس سفر کا اصل مقصد بھی یہی تھا کہ مشرقی افریقہ میں رہ کر یہاں کی جنگلی قوموں میں گھومیں اور ہاتھی دانت، گینڈے کے سینگ اور کھال تقریباً مفت حاصل کریں۔ یہ چیزیں انھوں نے بہت جمع

Scanned with CamScanner

کیس اور بازاروں میں انھیں اچھی قیمت پر فروخت کیا۔ اس کے علاوہ وہ دریائی گھوڑوں کا بھی شکار کرتے تھے اور ان کے غالباً دانت بھی فروخت کرتے تھے۔ کولمبو کے نقلی نگینوں سے بھی ان سیاحتوں میں انھوں نے نفع کمایا۔ ان کے علاوہ لوہے اور تانبے کی چھڑیں بھی پاس رکھتے تھے جن سے جنگلی لوگ کڑے وغیرہ بنا کر پہنتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ گھڑیاں اور کچھ فینسی سامان، کمبل وغیرہ بھی فروخت کرتے تھے۔

انھیں شکار کا جنون تھا۔ ہر سفر میں شکار کھیلنا بھی ان کا ایک اہم مقصد ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ جب ڈینٹل کالج میں پڑھنے کے لیے سان فرانسسکو گئے تو وہاں کے کالج میں داخلے سے پہلے کے پانچ مہینے انھوں نے برازیل میں خوب شکار کھیلا اور کئی بار مرتے مرتے بچے۔ وہ جس شہر میں جاتے وہاں کے باشندوں اور مختصر تاریخ کا بغور مطالعہ کرتے تھے اور ان کے بارے میں بھی لکھتے تھے۔

پہلے سفر سے واپسی کے بعد وہ بیمار پڑ گئے تھے اور 1908 میں شملے سے کوئٹہ چلے گئے جہاں چھ ماہ کے قریب رہ کر صحت یاب ہو گئے۔ سیاحتوں کے زمانے میں ان کے ماں باپ زندہ تھے۔ دوسرے سفر سے پہلے وہ دو بچیوں کے باپ ہو چکے تھے۔ ان کے ایک بیٹے جعفر بھی تھے جن کا ذکر صابر آروی صاحب نے کیا ہے۔ وہ بعد میں کلکتے میں چمڑے کا کاروبار کرنے لگے تھے۔

ڈاکٹر محمد علی شاہ کے مراسم حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، سر سلطان احمد وغیرہ سے تھے۔ جب وہ امریکا میں تعلیم ختم کر کے واپس آئے تو ان کے خیر خواہوں نے مشورہ دیا کہ دہلی میں ڈینٹل پریکٹس کریں لیکن وہاں وہ اپنا شکار کا شوق پورا نہیں کر سکتے تھے اس لیے انھوں نے مسوری اور پٹنہ کا انتخاب کیا اور بعد میں آرہ میں ڈینٹل کالج قائم کر لیا۔ وہ غالباً پاکستان چلے گئے تھے۔ یہ نہیں معلوم کہ ان کی وفات کب اور کہاں ہوئی۔

❊

580 صفحوں پر مشتمل اس سفرنامے کی کیفیت یہ ہے:

حصہ اول: افریقہ 1899 تا 1901، برکات اکبر پریس [1]، الہ آباد، 1935، صفحات:

[1] برکات اکبر پریس: سبزی منڈی الہ آباد کی ایک گلی میں ڈاکٹر مسیح الزماں کے مکان کے سامنے میرا اکبر علی کا غالباً دستی پریس تھا۔ اس کی چھپائی اچھی ہوتی تھی۔

Scanned with CamScanner

168۔

حصہ دوم: بورنیو 1909 تا 1910، برکات اکبر پریس، الہ آباد، سنہ ندارد[2]، صفحات: 252۔

حصہ سوم: امریکا1910 تا1913، ناشراردواکیڈیمی لاہور، پاکستان ٹائمز پریس، لاہور، سنہ ندارد[3]، صفحات:160۔

کتاب باتصویر ہے۔ پہلے حصے کی کوئی تصویر عکسی نقل میں موجود نہیں ہے۔ دوسرے اور تیسرے حصوں کی تصویریں حسب ذیل ہیں:

جلد دوم: 1۔ بحری ڈاکوؤں کی موت، 2۔ جنگلی بیل کا شکار، 3۔ اورنگ اوٹن (بن مانس)، 4۔ جنگلی بھوت، 5۔ زخمی شیر۔

جلد سوم: 1۔ الپاکا، 2۔ جیمز اور جیگوار، 3۔ ویکونا، 4۔ عورت نما مچھلی، 5۔ آدم خور مکڑے، 6۔ مسلح جنگلی ریڈانڈین۔

2,3 عکسی نقلوں میں حصہ اول ودوم کے سنہ اشاعت کا پتا نہیں چلتا لیکن حصہ سوم کی اشاعت پاکستان میں یعنی اگست 1948 کے بعد ہوئی۔ کتاب کے حصہ اول پر مصنف کا نام پتا ''سید محمد علی شاہ سبزواری، ڈینئل کالج (چوک، آرہ) صوبہ بہار'' درج ہے لیکن دیباچہ سہرام میں 15 اگست 1935 کو لکھا گیا۔

حصہ دوم میں سرورق پر اور آخر میں بھی وہی ڈینئل کالج، آرہ کا پتا ہے، تاریخ درج نہیں ہے۔ یہ دوسرا سفر پہلے سفر کے کوئی آٹھ سال بعد شروع ہوا۔ اس میں دیباچہ نہیں ہے، لیکن اس کی طباعت کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حصہ بھی پہلے حصے کے کچھ ہی بعد چھپا۔

حصہ سوم: سرورق اور فہرست مضامین نہیں ہے۔ کتاب کے آخر میں مصنف کا پتا ''15 پہاڑ پور روڈ، گارڈن ریچ، کلکتہ'' درج ہے۔ یہ پاکستان ٹائمز پریس لاہور میں بابو نوازش علی ورکس منیجر کے اہتمام سے چھپا اور بابو محمد حنیف نے اردو اکیڈیمی، لاہوری گیٹ، لاہور سے شائع کیا۔ غالباً اسی وقت محمد علی شاہ پاکستان مہاجرت کر گئے تھے۔

سن 1950 کے قریب وہ لکھنؤ آئے ہوئے تھے جہاں میرے بھائی صاحب ڈاکٹر اختر مسعود سے ان کی ملاقات ہوئی اور انھوں نے اپنی کتاب کا دوسرا حصہ ان کو پیش کیا۔

Scanned with CamScanner

پہلے ان حصوں کی فہرست مضامین دیکھیے:

حصہ اول: عرضِ حالِ مصنف۔ باب 1۔ خوفناک دنیا، 2۔ شہر ممباسا اور اس کے مختصر حالات، 3۔ سفر نیروبی، 4۔ نیروبی میں قیام اور مشاغل، 5۔ بادشاہِ دشت اور اس کے خصائل، 6۔ مہیب مردم خور، 7۔ نئے انتظامات اور حادثات، 8۔ آدم خوروں کی ناکامی، 9۔ گڈس ویگن کا حادثہ، 10۔ پھر وہی حملہ، 11۔ دیگر حادثات اور بغاوت، 12۔ مسٹر واہٹ کی آمد اور ان کا مردم خوردوں سے بچنا، 13۔ آدم خور کی گرفتاری اور رہائی، 14۔ کامیابی، پہلے مردم خور کی موت، 15۔ مردم خور کے حملے، 16۔ دوسرے مردم خور کی موت، 17۔ ایک چیتے کی دست درازی، 18۔ ایک خاتون کی مصیبت، 19۔ ایک اور آدم خور، 20۔ مشرقی افریقہ کے اصلی باشندے، 21۔ ایک جنگلی ہاتھی کا اچانک حملہ، 22۔ افریقہ کے جنگلات میں میرا سفر، 23۔ لیمبو کے گاؤں میں قیام اور شکار، 24۔ ایک خوفناک غار، 25۔ دل فریب مناظر، 26۔ منزل مقصود اور کامیابی، 27۔ گینڈوں کا شکار، 28۔ ہاتھیوں کا حملہ، ہماری واپسی، 29۔ زنجبار اور وہاں کا قیام، 30۔ واپسی وطن۔

حصہ دوم: باب 1۔ میرا دوسرا سفر، راول، 2۔ جزیرہ بورنیو، 3۔ بحری چینی ڈاکو، شیا نگ ڈاکو، 4۔ ڈاکوؤں کی موت، 5۔ ریاست ساراواک، 6۔ ریاست برونی کے جنگلوں میں شکار، 7۔ شیر کا شکار، 8۔ جنگلی بیل کا حملہ، 9۔ کیلی جنگلیوں کا کیمپ پر حملہ، 10۔ قید تنہائی، 11۔ عبو کی سرگذشت، 12۔ فرار، 13۔ جنگلوں میں سفر، 14۔ حیرت انگیز انکشافات، 15۔ کیلی جنگلیوں کا قتل عام، 16۔ جزیرہ منڈناؤ (فلپائن)، پراسرار مکان، 17۔ اصلی باشندے، 18۔ خان کی تلاش۔

حصہ سوم: (اس کا سرورق اور فہرست مضامین نہیں ہے) باب 1۔ سفر امریکا، 2۔ جزائر ہوائیان، 3۔ سان فرانسسکو، 4۔ ملک پناما، 5۔ برازیل، 5۔ شکار، 7۔ امریکا کی دو قدیم قومیں، 8۔ تاریک گھنے جنگل، 9۔ ایک بوڑھے کی ملاقات، 10۔ جنگل کی زندگی، 11۔ آدم خور مکڑے، 12۔ جنگلیوں کا حملہ، 13۔ بچپن کی شرارتیں، 14۔ جاسوسی کے شبہے میں میری گرفتاری، 15۔ ڈینٹل کالج میں داخلہ، 16۔ واپسی وطن، 17۔ ڈینٹل پریکٹس، 18۔ ایک آدم خور چیتا، 19۔ شکاریوں کے لیے چند مفید مشورے۔

ڈاکٹر شاہ کے اس سفرنامے کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی، نہ مصنف کے حالات کی

Scanned with CamScanner

طرف۔ اردو کے سفرناموں پر جو مضامین اور کتابیں میری نظر سے گذریں ان میں اُن کا ذکر نہیں ملا۔ میں نے خصوصاً بہار کے حضرات سے بھی اس سلسلے میں مدد مانگی، لیکن صابر آروی صاحب کے سوا کسی اور سے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ البتہ آصف فرخی، جن کو میں نے سفرنامے کی نقل بھیجی تھی انھوں نے کتاب پر ایک مختصر نوٹ لکھا تھا جس میں سو برس پہلے کے اس سفرنامے کی اہمیت پر روشنی ڈالی تھی، مگر یہ نوٹ کہیں چھپا تھا یا نہیں، اس کا علم مجھے نہیں ہو سکا۔

خوفناک دنیا کے تیسرے حصے کی اشاعت پاکستان سے ہوئی۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ محمد علی شاہ پاکستان چلے گئے تھے لیکن وہاں کے رسائل وغیرہ میں بھی ان کا ذکر میری نظر سے نہیں گذرا۔ یہ مضمون اس امید کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے کہ اسے پڑھ کر کچھ لوگوں کو شاید محمد علی شاہ یاد آ جائیں اور وہ ان کے بارے میں لکھیں۔

محمد علی شاہ کی سیاحتوں کی مختصر روداد درج ذیل ہے:

❋

1 حصہ اول: افریقہ

1899 تا 1901

اپنے پہلے سفر پر میں پانی کے جہاز سے 22 دن میں 7 جولائی 1899 کو ممباسا پہنچا۔ بندرگاہ سے نئی آبادی کلنڈنی میں داخل ہوا جہاں اس وقت تک کوئی ہوٹل نہیں تھا۔ شام ہو گئی تھی لہٰذا ایک غیر آباد دکان میں لیٹ رہا۔ رات کو ایک زخمی آدمی آ کر برآمدے میں لیٹ گیا لیکن کچھ دیر بعد اسے کوئی آدم خور درندہ اٹھا لے گیا۔ اس زمانے میں کلنڈنی سے یوگنڈا تک ریلوے لائن بچھائی جا رہی تھی اور اس غرض سے جنگل کاٹے جا رہے تھے۔ مزدور جہازوں میں بھر کر لائے جا رہے تھے۔ ان میں بہت سے مزدور، جن میں ہندوستانی بھی تھے، جنگلی درندوں کے ہاتھوں مارے بھی جا رہے تھے۔

کلنڈنی میں قریب ایک ماہ قیام کرنے کے بعد میں نیروبی چلا گیا تاکہ آس پاس کی جنگلی قوموں سے ہاتھی دانت اور گینڈے کے سینگ حاصل کروں جو اِن جنگلیوں سے بہت سستے میں مل سکتے تھے لیکن بازار میں ان کی قیمت بہت تھی۔ میں نے ممباسا میں بڑی تعداد میں نقلی موتی، لوہے اور

Scanned with CamScanner

تانبے کے تاروں کے بنڈل اور کپڑے وغیرہ ان جنگلیوں کے لیے خرید لیے تھے۔ نیروبی پہنچ کر میں نے ڈاکٹری پریکٹس شروع کردی اور یہ کام اتنا چلا کہ کچھ دن تک میں اپنا مقصد بھولے رہا۔ نیروبی میں پنجابیوں وغیرہ کی کثرت کی وجہ سے وہ ہندوستان ہی کا شہر معلوم ہونے لگا تھا۔ کئی جسم فروش عورتیں بھی وہاں پہنچ گئیں اور ان کا کاروبار خوب چمکا۔

دریائے ساؤ (Tsavo) کے پل کی تعمیر کے زمانے میں وہاں دو آدم خور شیروں نے قیامت مچا رکھی تھی۔ پل کی تعمیر کے مہتمم لیفٹیننٹ کرنل جے ایچ پیٹرسن تھے۔ انھوں نے ان آدم خوروں کے خاتمے کا بیڑا اٹھایا اور کامیاب ہوئے۔ یہ واقعات میرے پہنچنے سے پہلے پیش آچکے تھے لیکن اب بھی ہر طرف ان کا چرچا تھا۔ پیٹرسن صاحب بھی ابھی افریقہ میں موجود اور نیروبی ہی میں مقیم تھے۔ میں ان سے ملا اور انھوں نے بہت تفصیل سے ان آدم خوروں کے واقعات بتائے اور کچھ لکھ کر بھی دیے۔[4]

ساؤ کے شیروں کے علاوہ بھی کچھ درندے مردم خور ہو گئے تھے اور انھوں نے کئی لوگوں کو مار ڈالا۔

مشرقی افریقہ کے اصلی باشندوں میں نیروبی کے اطراف کے جنگلی قبائل، واکیکوئیو، واناٹیکا، واٹانتا، واکمبا اور خوں خوار قبیلہ میسائی وغیرہ ہیں اور عیسائی مشنری ان کو مہذب بنانے میں سرگرم ہیں۔ واکیکوئیو قبیلے کا ایک جنگلی لینمبو جس کا گھر نیروبی سے 35 میل کے فاصلے پر تھا، مجھ سے مانوس ہو گیا تھا۔ وہ کئی بار مجھے اپنے علاقے میں بلا چکا تھا۔ وہاں جانے سے پہلے میں نیروبی کے آس پاس کئی جانوروں کو مار لیا کرتا تھا۔ ایک دن مجھ پر ایک جنگلی ہاتھی نے حملہ کر دیا لیکن میں ایک گہرے گڑھے میں گر جانے کی وجہ سے بچ گیا۔

کرنل پیٹرسن دسمبر 1899 میں واپس انگلستان چلے گئے۔

---

[4] خود پیٹرسن نے The Man-Eaters of Tsavo کے نام سے یہ سرگذشت 1907 میں شائع کی (تیسری چھاپ، فونٹنا بکس، برطانیہ)۔ محمد علی شاہ نے چون پچپن صفحوں میں ان آدم خوروں کے دہشت ناک واقعات لکھے ہیں۔ ان کا بیان معمولی اختلافات کے ساتھ پیٹرسن کی کتاب کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے لیکن انھوں نے غالباً یہ کتاب دیکھی نہیں تھی۔

Scanned with CamScanner

اس کے بعد میں نے جنگل کے سفر کی تیاری کی اور ضروری سامان، دوائیں، جنگلیوں کے مطلب کی چیزیں لے کر جنوری کے آخری ہفتے میں نیروبی روانہ ہوگیا۔

راستے میں رات بسر کرنے کے لیے درختوں پر انتظام کیا گیا۔ ہم دریاے اتھی کے کنارے پر تھے۔ سیکڑوں کی تعداد میں مگرمچھ دریا میں اچھل رہے تھے اور ان کے منھ سے کرچ کرچ کی آواز آ رہی تھی۔ صبح ہم نے دیکھا کہ بہت سے دریائی گھوڑے کچھ کنارے پر اور کچھ دریا کے اندر موجود ہیں۔ میں نے ایک بڑے نر پر فائر کیا۔ وہاں سے تھوڑے فاصلے پر جنگلیوں کی جھونپڑیاں تھیں۔ وہ فائر کی آواز سن کر گوشت کے لالچ میں آ پہنچے۔ میں نے نر پر دوسرا فائر کیا اور میرے ساتھیوں نے رسے پھینک کر اسے کنارے پر کھینچا اور برچھوں سے اس کا کام تمام کر دیا۔ اس کے بدن سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ جنگلیوں کے لیے یہ بڑی نعمت تھی۔ انھوں نے زخموں سے منھ لگا لگا کر اور چلوؤں میں بھر بھر کر خوب خون پیا۔ پھر شکار کے گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے کاٹ کر آپس میں بانٹ لیے۔ ہم نے اس کے دانت اکھاڑ کر رکھ لیے۔ راستے میں دس بارہ جنگلی کتوں نے ہم پر حملہ کر دیا۔ ہم نے پانچ کتوں کو مار دیا، باقی بھاگ گئے۔

چھ بجے شام کو ہم لیمبو کے گاؤں میں پہنچ گئے۔ وہاں ہمارے لیے گھاس بچھا کر اس پر بستر لگا دیے گئے تھے۔ جنگلیوں نے ہم کو، ہمارے لباس کو، ہمارے پکا کر کھانے کو حیرت سے دیکھا۔ یہ لوگ صرف بھیڑ بکریوں کا دودھ، جانوروں کا گوشت اور جنگل میں کہیں کہیں مل جانے والا کیلا اور شکر قند استعمال کرتے ہیں۔ کاشتکاری سے ناواقف ہیں۔ کھانا پکانے کا بھی ان کے یہاں رواج نہیں ہے۔ جب میں نے ان کے بچوں کو بسکٹ دیے تو انھوں نے سونگھ کر پھینک دیے۔

جنگلیوں کے سردار نے ہماری بڑی آؤ بھگت کی۔ ہمارے لیے اپنے انداز میں موسیقی کی محفل جمائی اور لڑائی کا ناٹک بھی دکھایا۔ انھیں ہماری بندوقیں چلتے دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ دو دن آرام کے بعد ہم شکار پر نکلے۔ جنگل کے وسط میں ایک پانی کا چشمہ نظر آیا۔ وہاں پر جنگل بہت گھنا اور تاریک تھا۔ چشمے کے کنارے پر بہت سی انسانی ہڈیاں، کھوپڑیاں، ہاتھ اور لوہے تانبے کے تار پڑے ہوے تھے، چشمے کے اوپر پہاڑی میں ایک غار تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ کسی آدم خور جانور کا مسکن ہے۔ میں نے غار کے دہانے پر بہت سی آگ جلوائی تو غار کے اندر سے ایک شیر باہر نکلا۔ بڑی مشکل سے

وہ پانچ گولیاں کھا کر گرا۔ لینمبو اور اس کے ساتھی میرے منع کرنے کے باوجود اس کے قریب چلے گئے اور وہ اچانک ان پر جھپٹ پڑا۔ لینمبو خفیف سا زخمی بھی ہوا، لیکن شیر کو ان لوگوں نے ختم کر دیا۔

ایک ہفتہ لینمبو کے گاؤں میں ٹھہر کر ہم آگے روانہ ہوئے۔ پانچ چھ میل بعد پہاڑی راستہ آ گیا۔ گہرے کھڈوں اور غاروں سے بچتے بچاتے بہت سنبھل سنبھل کر سست رفتار سے چلنا پڑا۔ یہاں سانپ اور اژدہے بہ کثرت تھے۔ کئی میل چلنے کے بعد ایک بلند پہاڑی سامنے آ گئی۔ اس کو طے کرنے کا ہم میں دم نہیں تھا۔ پہاڑی میں ایک سرنگ نظر آئی۔ جنگلیوں نے کہا کہ اس سرنگ کے ذریعے ہم آسانی سے پہاڑی کے پار پہنچ جائیں گے۔ ہم اندر داخل ہوئے، عجب وحشت ناک راستہ تھا۔ اندر گرمی بھی بہت تھی۔ اچانک ایک دھماکا ہوا اور ہم نے دیکھا کہ آگے والے جنگلی کو ایک بہت بڑے اژدہے نے اپنی دُم میں جکڑ لیا ہے۔ میں نے اس پر دو فائر کیے۔ اس کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی اور اس نے جنگلی کو چھوڑنا شروع کیا۔ دس منٹ بعد دور کے پتھروں کے ڈھیر سے اس کا سر برآمد ہوا، میں نے دو فائر اور کیے اور جنگلیوں نے اسے اپنے نیزوں سے چھید چھید کر ختم کر دیا۔ یہ قریب بیس گز لمبا اور بیس من وزنی ہوگا۔ اس کی گردن پر گھوڑے کی ایال کی طرح بال تھے اور غار کی فضا اس کی پھنکاروں سے گرم اور زہریلی ہو رہی تھی۔ آخر ہم سرنگ سے باہر نکل کر میدان میں پہنچ گئے۔ میں نے ایک ہرن شکار کیا اور درختوں پر سونے کا انتظام کیا گیا۔

اب ہم ایک پُر بہار راستے سے گزر رہے تھے۔ رنگ برنگے پھول، شفاف پانی کی نہریں اور آبشار دیکھ کر جی چاہتا تھا کہ یہیں رہ جاؤں۔ کافی دیر تک یہ بہشت نما منظر سامنے رہا۔ ہم سب آگے بڑھے، کچھ دور کے بعد لینمبو کے ہم قوم وانیکوئی جنگلیوں کے ایک گاؤں میڈوگو کے سامنے پہنچ گئے۔

یہاں پہنچ کر میں نے لینمبو پر اپنا اصلی مقصد ظاہر کیا، یعنی ہاتھی کے دانت اور گینڈے کے سینگ حاصل کرنا۔ لینمبو نے بتایا کہ میڈوگو کے سردار کے جھونپڑے میں یہ بہت ہیں، دوسرے گھروں میں بھی ہوں گے۔ یہاں والوں کے لیے یہ چیزیں بے کار ہیں۔ پھر ہم سردار کے پاس پہنچے۔ اس نے ہمارے خیر مقدم کے لیے بہت سے آدمی بھیجے تھے اور بھیڑیں اور دودھ وغیرہ بھی بھجوایا تھا۔ میں نے سردار سے ہاتھ ملایا اور ایک فینسی کمبل اسے اُڑھا دیا۔ مارکین کی چادریں، تاروں کے بنڈل اور نقلی موتی بھی تحفے میں دیے۔ سردار کی باچھیں کھل گئیں۔ پھر میں نے اسے ایک چیز دی۔ وہ اسے

آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا، پھر اس پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ پھر سب جنگلیوں نے اسے باری باری دیکھا اور ہنسی سے لوٹنے لگے۔ یہ دراصل ایک معمولی آئینہ تھا جو ان لوگوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سردار میرے بھی تحفوں سے خوش تھا مگر آئینے کو بڑی نعمت سمجھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ برآمدے میں لکڑی کی بلیوں کی جگہ بڑے بڑے ہاتھی دانت لگائے گئے ہیں۔ اب لینمبو نے اسے میری آمد کا مقصد بتایا اور سردار نے اُن کی فراہمی کا وعدہ کر لیا۔ پھر جو میں وہاں گیا تو دیکھا کہ سردار کے جھونپڑے کے سامنے ہاتھی دانت اور گینڈے کے سینگوں کا ٹال لگا ہوا ہے۔ یہ قیمتی مال مجھے مفت میں مل گیا۔ اب انگریزوں نے شکار پر پچاس پونڈ سے زیادہ ٹیکس لگا دیا ہے اور یہ چیزیں بہت گراں ہو گئی ہیں۔

سردار سے رخصت ہو کر ہم آگے بڑھے۔ ہم نے ہاتھیوں اور گینڈوں کا خوب شکار کیا جن کی وہاں کثرت تھی۔ ہم پر ہاتھیوں نے حملہ بھی کیا اور ایک جنگلی کو مار بھی ڈالا۔ پھر ہم میڈوگو واپس پہنچے۔ سردار کے پاس جو ہاتھی دانت اور سینگ چھوڑ گیا تھا، وہ لیے، جنگلیوں کو موٹے تار، موتی اور مارکین کی چادریں تقسیم کیں۔

اب میرا حلیہ بھی جنگلیوں کا سا ہو گیا تھا۔ لباس کی جگہ بدن پر چیتھڑے تھے اور سر اور داڑھی کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے۔ تاریخوں کا حساب بھول چکا تھا۔ میں 27 جنوری 1900 کو نیروبی سے روانہ ہوا تھا۔ اس حساب سے یہ غالباً مارچ کا مہینہ تھا۔

میڈوگو سے رخصت ہو کر شکار کھیلتے ہوئے ہم نیروبی میں داخل ہوئے۔ معلوم ہوا آج 3 اپریل ہے۔ لینمبو کو میں نے اپنے پاس ایک مہینے کے لیے روک لیا۔ رفتہ رفتہ وہ کپڑے پہننے کا عادی ہو گیا اور روٹی بھی تھوڑی تھوڑی کھانے لگا۔ جلیبی بے حد پسند کرتا۔ بلا ناغہ آدھا سیر جلیبی کھاتا تھا۔ مہینے بھر بعد میں نے اس کو رخصت کیا اور دوسرے بہت سے سامان کے ساتھ پانچ سیر جلیبی بھی دی۔ ہاتھی دانت اور گینڈے کے سینگ میں نے ممباسا بھیج دیے۔ گینڈے کی کھالیں نیروبی ہی میں فروخت ہو گئیں۔

اگست 1900 تک میں نیروبی میں رہا۔ مال ممباسا میں تھا۔ اس کی بڑی منڈی زنجبار میں تھی، چنانچہ میں نے ممباسا سے مال اٹھایا اور جہاز کے ذریعے زنجبار پہنچا۔ زنجبار میں خوجے، بوہرے، میمن اور گجراتی بہت ہیں۔ عرب سلطان کے زیر حکومت زنجبار مشرقی افریقہ کا سب سے بڑا

Scanned with CamScanner

شہر اور بندرگاہ ہے۔ میں اپنا تھوڑا تھوڑا مال فروخت کرتا رہا اور شغل بے کاری کے طور پر تین پنجابیوں کو عطر، صابن، مونگا وغیرہ خرید کر دے دیا۔ وہ پھیری لگا کر مال بیچتے اور شام کو ہم منافع آدھا آدھا بانٹ لیتے تھے۔

ایک سال تک زنجبار میں رہنے کے بعد میں وہاں سے روانہ ہوگیا۔ مولوی سید تفضل حسین صاحب، جو پنجاب میں میرے ہم وطن اور والد صاحب کے دوست تھے اور اس زمانے میں بھنگانی میں خوجوں کے امامِ جماعت تھے، انھوں نے میری بڑی خاطر تواضع کی۔ قریب پندرہ روز تک میں ان کا مہمان رہا۔ میرا ارادہ تھا کہ بھنگانی سے جہاز پر ٹھانگا جاؤں گا، وہاں سے 6 ستمبر کو بمبئی جانے والا جہاز مل جائے گا۔ مگر 3 ستمبر 1901 کو ایک جرمن کا جہاز ٹھانگا جارہا تھا۔ میں نے اپنے ملازم قاسم کو مع سامان جہاز پر بھیج دیا اور خود دوسرے دن جب بندرگاہ پر پہنچا تو جہاز چھوٹ چکا تھا اور میرا سارا سامان اسی میں تھا۔ ناچار ایک تیز رفتار گدھا کرائے پر لیا، اس پر خطرناک راستہ طے کرتا ہوا 4 ستمبر کو ٹھانگا پہنچ گیا۔ دوسرے دن ہمارا جہاز بھی ٹھانگا پہنچ گیا۔ قاسم مجھے وہاں موجود پا کر بہت حیران ہوا۔ ٹھانگا میں مولوی تفضل حسین صاحب کے ایک خوجے مرید کے مکان پر بہت آرام سے رہا۔ بمبئی کا ٹکٹ میں نے لے لیا تھا۔ جہاز ٹھانگا سے چل کر ممباسا، عدن، گوآ ہوتا ہوا 21 ستمبر 1901 کو بمبئی پہنچ گیا اور میرا سفر ختم ہوا۔

2 حصہ دوم: بورنیو وغیرہ

دسمبر 1908 تا دسمبر 1909

مئی 1908 میں جب میں بیمار تھا تو شملہ سے کوئٹے چلا گیا اور کچھ دن میں تندرست ہوگیا۔ مجھے ڈینٹسٹری سیکھنے کا شوق بہت دن سے تھا۔ ایک امریکی ڈاکٹر اسمتھ نے مجھے مشورہ دیا کہ امریکا جا کر وہاں کے کسی ڈینٹل کالج میں باقاعدہ تعلیم حاصل کروں۔ امریکا کے سفر کے لیے کم از کم پانچ ہزار روپے کی ضرورت تھی۔ گھر والے اس سفر کی مخالفت کر رہے تھے کیونکہ اب میں دو بچیوں کا باپ ہو چکا تھا۔ سب کی رائے تھی کہ میں ہندوستان ہی میں رہ کر کاروبار کروں، لیکن مجھ پر ڈینٹسٹری کا بھوت

سوار ہو چکا تھا۔ پاس صرف چار پانچ سو روپے تھے۔ میں نے سنگاپور کا پاسپورٹ لیا، اپنے گاؤں کے ایک مسلمان راجپوت لڑکے عنایت کو ساتھ لیا اور بہ غرضِ تجارت گھڑیاں، چشمے اور فینسی سامان خرید کر 24 دسمبر 1908 کو گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

ہمارا جہاز تیسرے دن رنگون پہنچا۔ ہم رنگون سے پینانگ اور پھر سنگاپور پہنچ گئے۔ سنگاپور میں میرے ہم وطن راول لوگ مل گئے۔ یہ غالباً راجپوت سے مسلمان ہوے ہیں اور مختلف پیشے کرتے ہیں۔ فریب وہی سے بھی روپیا کماتے ہیں اور اسے عیب نہیں سمجھتے۔ انھوں نے اپنا ایک قصہ بیان کیا کہ کس طرح جعل سے ایک راجا کو ان لوگوں نے ٹھگا۔

سنگاپور میں ایک ہفتہ رہنے کے بعد میں نے طے کیا کہ کسی طرح ہانگ کانگ کے راستے فلپائن چلا جاؤں جو امریکی گورنمنٹ کے ماتحت ہے۔ فلپائن سے امریکا جانے کے لیے پاسپورٹ کی ضرورت نہیں پڑے گی اور وہاں تجارت کے ذریعے زادِراہ بھی مہیا ہو سکتا ہے۔ میں امریکی قونصل سے ملا اور ان سے فلپائن میں داخلے کی اجازت طلب کی لیکن انھوں نے صاف انکار کر دیا کہ اب ایشیا والوں کے لیے فلپائن اور امریکا میں داخلے کے قانون بہت سخت ہو گئے ہیں۔ میں نے انگریزی قونصل سے مدد کی درخواست کی، وہاں بھی ناکامی ہوئی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کروں۔

اسی عالم میں ایک دن اپنے ہوٹل میں بیٹھا دنیا کا نقشہ دیکھ رہا تھا۔ دیکھا کہ سنگاپور سے بورنیو قریب ہے اور بورنیو سے فلپائن کا جنوبی حصہ ملا ہوا ہے۔ معاً میرے دل میں خیال آیا کہ بورنیو چلا جاؤں، وہاں سے فلپائن میں داخلے کی کوشش کروں۔ سنگاپور سے میں نے کچھ اور مالِ تجارت خریدا۔ کولمبو کے بنے انگوٹھیوں کے نگ زمرد، پکھراج، نیلم، یاقوت وغیرہ مجھے بہت سستے مل گئے۔ یہ بالکل اصلی نگوں کے مانند تھے اور اتنے نفیس تھے کہ میں نے دوسرے ملکوں میں ان کے ذریعے بہت روپیا کمایا۔ خرچ کے لیے کچھ روپیا رکھ کر باقی سب کا میں نے مال خرید لیا، اور عنایت کے ساتھ ایک جرمن کمپنی کے جہاز پر، جو برٹش نارتھ بورنیو جا رہا تھا سوار ہو گیا۔ ہمارے ٹکٹ سنڈیکن تک کے تھے۔

میرا خیال تھا کہ بورنیو کے سے گمنام جزیرے میں ہندوستانی کم آتے ہوں گے لیکن اس کے پہلے ہی بندرگاہ لابون میں سرحدی پنجابیوں کی کثرت نظر آئی۔ لابون سے چلنے کے تیسرے روز ہمارا

جہاز جیسلطان پہنچا۔ یہ بڑی بندرگاہ ہے۔ چینیوں کی دکانیں یہاں بہت ہیں۔ یہاں سے کڈت ہوتا ہوا میں اپنی منزل مقصود سنڈیکن پہنچ گیا۔ یہاں بھی بہت سے پنجابیوں اور ہندوستانیوں کو دیکھا۔ وہاں کوئی ہوٹل نہیں تھا لیکن چند پنجابیوں کی مدد سے ہم کو ایک اچھا مکان مل گیا۔

بورنیو دنیا کا تیسرا بڑا جزیرہ ہے جس کی آبادی تین لاکھ کے قریب ہے۔ یہاں کے اصلی باشندے، ڈیکر، مسلمان ہیں۔ ان کے مکان عجیب وغریب ہوتے ہیں۔ دریا اور سمندر میں لکڑیاں گاڑ کر ان پر بانس کا فرش، پھر گھاس کی چھت والا مکان بناتے ہیں۔ آمدورفت کے لیے چھوٹا سا پل بناتے ہیں یا کشتیاں استعمال کرتے ہیں۔ خشکی پر بھی اسی طریقے سے مکان بناتے ہیں۔ ڈیکر مہذب لوگ ہیں۔ ان کے علاوہ یہاں پہاڑوں اور جنگلوں میں وحشی قومیں بھی بستی ہیں جن کا کوئی مذہب نہیں۔

بورنیو کے جنگلوں میں ایک قسم کا جانور گینڈے کی طرح کا لیکن اس سے چھوٹا ہوتا ہے۔ رنگ کالا لیکن کمر کا حصہ سفید، لمبی ناک، چھوٹے کان۔ اس کو ٹمپر کہتے ہیں۔

سنڈیکن اہم شہر ہے لیکن اس کی آبادی صرف دس ہزار کے قریب ہے۔ سنگاپور، آسٹریلیا اور چین سے جہازوں کی آمدورفت نے اس کی رونق بڑھا رکھی ہے۔ میں نے یہاں اپنا کاروبار شروع کر دیا تھا جس میں خاصا نفع ہوا۔ خصوصاً کولمبو کے نقلی نگینے بہت نفعے پر فروخت ہوئے اور مجھے سنگاپور جا کر اور مال لانا پڑا۔ ایک روز میرا تعارف سیگاماں کے تمبا کو فارم کے منیجر سے کرایا گیا۔ انھوں نے بتایا کہ سیگاماں میں اور بھی یورپین لوگوں کے فارم ہیں۔ وہاں آپ کو تجارت میں بھی کامیابی ہوگی اور شکار بھی خوب ملے گا۔ انھوں نے مجھ کو اپنے ہی بنگلے میں ٹھہرنے کی دعوت دی۔

میں سیگاماں پہنچ گیا۔ منیجر صاحب کے بنگلے پر آنے والے انگریزوں کے ہاتھ میں نے اپنا کافی مال فروخت کیا۔ لیکن مجھے شکار، خصوصاً ٹمپر کے شکار کی دھن لگی ہوئی تھی چنانچہ عنایت اور دو قلیوں کے ساتھ میں شکار پر نکل کھڑا ہوا۔ راستے میں ایک ہاتھی نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں ایک درخت پر چڑھ گیا۔ میری رائفل عنایت کے پاس تھی جو کسی اور درخت پر چڑھ گیا تھا۔ وہ ضدی ہاتھی میرے درخت کے نیچے بیٹھ کر سوتا بن گیا۔ کئی گھنٹے یوں ہی گذر گئے۔ آخر مجھے نجات کی تدبیر سوجھی۔ میں نے کچھ سوکھی لکڑیاں توڑ کر ان کا بنڈل بنایا اور رومال میں باندھ کر اس میں ماچس سے آگ لگا دی۔

Scanned with CamScanner

پھر اس کو درخت سے نیچے لٹکا کر ہاتھی کی کمر پر چھوڑ دیا۔ وہ اٹھ کر بھاگا اور میں نیچے اتر کر منیجر صاحب کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ انھوں نے بتایا کہ ہاتھی یہاں بہت پریشان کرتے ہیں اور ریلوے لائن پر آ کر بیٹھ جاتے ہیں اور ان کی وجہ سے ٹرین کئی کئی دن رکی رہتی ہے۔

شام کو ایک آسٹریلین ڈاکٹر جونز شکار کے سامان کے ساتھ میرے میزبان کے یہاں اترے۔ انھوں نے دوسرے دن شکار کی دعوت دی اور ہم پورے ساز وسامان کے ساتھ جنگل کو روانہ ہوے۔ شکار بھی ملا، سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہوئی کہ میں نے ایک ٹیپر کا شکار کرلیا۔ ڈاکٹر جونز کے ساتھ واحد ڈاٹو، وہاں سے ٹیولنا، وہاں سے کڈت گئے۔ پھر ایک بڑی کشتی پر سینا ؤ تمبا کو اسٹیٹ پہنچے۔ یہاں انگریزوں کی بڑی تعداد ہے۔ وہاں ایک ہفتے تک رہ کر میں نے اچھا خاصا مال فروخت کیا۔ شکار بھی ہوتا رہا۔ اس کے بعد ہم کڈت آ گئے اور اسٹیمر کے ذریعے جیسلطان ہوتے ہوے لابون پہنچ گئے۔

میں نے لابون سے عنایت کو تھوڑا مالِ تجارت دے کر سنڈیکن واپس بھیج دیا تا کہ میری واپسی تک وہ بے کار نہ رہے۔ اپنا شکار کا سامان بھی اس کے ساتھ بھیج دیا۔ میرا ارادہ تھا کہ لابون سے میسیری جاؤں اور وہاں بقیہ مال فروخت کر کے لابون ہوتا ہوا سنگاپور جاؤں اور نیا مال لے کر سنڈیکن واپس آؤں۔

میسیری میں میرا کاروبار اچھا رہا اور میرے پاس پندرہ سو روپے ہو گئے۔ میں میسیری سے جہاز پر روانہ ہوا۔ اس جہاز پر امریکی مسافر اور ملائی قلی تھے۔ سب اپنے اپنے وطن واپس جا رہے تھے اور سب کے پاس نقد روپیا وغیرہ تھا۔ ان دنوں ان سمندروں میں ایک بحری ڈاکو شیا تنگ نے دہشت پھیلا رکھی تھی۔ ہمارا جہاز بھی اس کے نشانے پر آ گیا۔ خوں خوار ڈاکوؤں کا گروہ شیا تنگ کے ساتھ ہمارے جہاز پر چڑھ آیا۔ انھوں نے بندوقوں کے کندوں سے ہم سب کو مارنا شروع کیا۔ میرے کندھے، سر اور ہاتھوں پر سخت چوٹیں آئیں۔ ہم سب نے ہاتھ اوپر اٹھا دیے اور وہ ہمارا سامان لوٹنے لگے۔ میرے پندرہ سو روپے گئے اور دوسرا سامان بھی اس طرح چھینا گیا کہ میں صرف قمیص شلوار، وہ بھی خون میں لت پت، پہنے رہ گیا۔ اس لٹے ہوے قافلے کے ساتھ ہمارا جہاز لابون پہنچا۔ وہاں پنجابی سپاہیوں نے میری دیکھ بھال کی۔

Scanned with CamScanner

کچھ دن بعد معلوم ہوا کہ ریاست ساراواک اور ریاست برونی کی مشترکہ فوجوں نے شیا تنگ ڈاکو کو گرفتار کر لیا ہے۔ اس کی بڑی بڑی خبریں چھپیں۔ ہمارے جہاز پر ڈاکے کا بھی ذکر تھا اور لکھا تھا کہ زخمی ہونے والوں میں ایک ہندوستانی مسافر بھی تھا۔ وہ میں ہی تھا۔ میں ڈاکوؤں کا انجام دیکھنے برونی پہنچا۔ سلطان برونی نے میری بڑی آؤ بھگت کی اور میرا بہت سا مال خرید ااور مجھے اپنا مہمان کیا۔ ڈاکوؤں کے لیے سزائے موت تجویز ہوئی اور وہاں کے قاعدے کے مطابق ان کو دریا میں گھڑیالوں کے آگے پھینک دیا گیا اور گھڑیالوں نے دم کے دم میں ان کو چٹ کر لیا۔ اس بھیانک انجام کا مجھ پر بہت دن تک اثر رہا۔

میں پھر میسیری واپس آ گیا۔ وہاں میرا مال بہت جلد فروخت ہو گیا اور میں ریاست ساراواک پہنچا جہاں کا انگریز حکمراں راجا کہلاتا ہے۔ یہاں انگریز، چینی اور ڈچ لوگ بہت ہیں اور سارے کاروبار انھیں کے ہاتھ میں ہیں۔ ہندوستانی بدنصیبوں کی حالت یہاں بھی اچھی نہیں ہے۔ یہ لوگ زیادہ تر سپاہی یا چوکیدار ہیں۔ ساراواک کے صدر مقام کوچنگ میں کاٹھیاواڑ کے دو بھائیوں سلیمان اور عثمان سے ملاقات ہوگئی۔ وہ شکار کے شوقین تھے۔ ایک دن میں ان کے ساتھ شکار پر گیا۔ وہ معمولی شکار پر بھی اس اہتمام سے روانہ ہوئے جیسے کسی فوجی مہم پر جا رہے ہوں۔ سلیمان نے نیچے جنگلوں میں ہرن وغیرہ مار لیے لیکن اصلی بڑا جنگل جو خطرناک جانوروں سے بھرا ہوا تھا وہ مجھے کوئی رہبر ساتھ نہ ہونے کی وجہ سے دیکھنے کو نہیں ملا۔

میں نے سلطان برونی سے ریاست کے جنگلوں میں شکار کھیلنے کا وعدہ کر رکھا تھا، اس لیے پھر برونی پہنچا۔ سلطان نے میرے لیے ایک بڑی شکار پارٹی مہیا کر دی۔ اس میں برونی کے تین آزمودہ کار شکاری احمد، اسلام اور جالو تھے۔ انھوں نے بتایا کہ یہاں کا سب سے خطرناک جانور اورنگ اوٹن ہے جو بڑی قسم کا گوریلا ہوتا ہے۔

کئی دن کے سفر کے بعد ہم گھنے جنگلوں میں پہنچ گئے۔ پانچ دن یہاں قیام کرنے کے بعد ہم کوہ مولو کے جنوبی پہاڑ کی بلندی پر پہنچ گئے۔ ڈچ علاقے کی سرحد یہاں سے قریب ہی ہے۔ ہم نے ایک شیر کا شکار کر لیا، پھر ایک جنگلی بیل پر گولی چلائی۔ وہ زخمی ہو گیا لیکن اس نے مجھے اپنے سینگوں پر اچھال دیا۔ مجھے سخت چوٹیں آئیں اور میں بے ہوش ہو گیا۔ کئی دن تک بے کار رہا۔ وہاں مجھ سے

کائن قبیلے کے لوگ ملنے آئے۔ یہ بھی برائے نام کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ہم امن پسند لوگ ہیں، لیکن اگر دوسرے ہم پر حملہ کرتے ہیں تو ہم بھی جواب دیتے ہیں۔ یہاں سے دس کوس کے فاصلے پر کیلی قوم کے جنگلی ایک رات ہمارے گاؤں میں گھس آئے اور دو لڑکیوں کو اٹھالے گئے۔ تب ہم نے ان پر حملہ کیا اور سخت لڑائی کے بعد لڑکیوں کو چھڑا لائے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ کیلی لوگ سخت کمینے اور بدمعاش ہیں۔

اب میں سخت پریشان تھا۔ ابھی تک امریکا جانے کی سبیل نہیں نکلی تھی اور میں بورنیو ہی میں پڑا ہوا تھا۔ میں نے ارادہ کرلیا کہ جلد سے جلد سنڈیکن واپس چلا جاؤں۔ اسی فکر میں جاگ رہا تھا کہ میرے ساتھی جنگل سے واپس آ گئے۔ احمد اور جالو کے ساتھ سخت زخمی حالت میں اسلام تھا۔ احمد نے بتایا کہ ہم لوگوں نے تین شیر مارے تھے کہ دو کیلی جنگلی آ گئے اور بگڑنے لگے کہ تم نے ہمارے جنگل کے شیر کیوں مارے۔ ایک جنگلی ہماری رائفل لے کر بھاگا۔ میں نے اس پر فائر کر دیا اور وہ گر کر ٹھنڈا ہو گیا، لیکن دوسرا بچ کر بھاگ گیا۔ یہ مصیبت تو تھی ہی، اس پر سے ایک اورنگ اوٹن نے ہم پر حملہ کر دیا اور اسلام کا سر، گردن اور کمر وغیرہ چبا ڈالے۔ دوسرے دن صبح کے قریب اسلام مر گیا۔ مجھے فکر ہوئی کہ سلطان برونی کو کیا جواب دوں گا۔ اس سے بڑی پریشانی یہ تھی کہ کہیں کیلی جنگلی اپنے ساتھی کا انتقام لینے کے لیے ہم پر حملہ نہ کر دیں، اور یہ پریشانی صحیح نکلی۔ پانچ بجے شام کے قریب چار پانچ سو کیلیوں نے ہم پر حملہ کر دیا۔ کیمپ کے کئی لوگوں کو مار ڈالا اور مجھے پکڑ کر اپنے گاؤں لے گئے۔ مجھ کو ایک کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ صبح کوٹھری میں ایک گورے رنگ کا نوجوان داخل ہوا۔ وہ قاعدے کے کپڑے پہنے ہوئے تھا اور عربی بول رہا تھا۔ اس نے پوچھا، کیا تم ہندوستانی ہو؟ میں نے کہا، میں ہندوستانی شرفا میں ہوں۔ پھر وہ چلا گیا۔ اس کے بعد مجھے سردار کے پاس لے جایا گیا۔ وہاں مجھے ایک عمر رسیدہ عورت بھی نظر آئی جو عرب معلوم ہوتی تھی۔ لڑکا میری طرف سے ترجمانی کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ سردار کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہندوستان کون سا ملک ہے۔ اس نے پوچھا، ''السب السب؟'' پھر ''زاوا، زاوا؟'' اسے عرب اور جاوا کے سوا کسی اور مقام کا علم نہیں تھا۔

آخر مجھے قید تنہائی کی سزا دی گئی۔ بستی سے کچھ فاصلے پر ایک بہت بڑی جھیل تھی، اس میں ایک ٹاپو تھا۔ جنگلیوں نے مجھے کشتی میں اس ٹاپو پر پہنچایا اور واپس چلے گئے۔ میں نے ٹاپو میں اپنے رہنے کا

Scanned with CamScanner

سامان درست کیا۔ اس عرصے میں وہ لڑکا عبو کبھی کبھی موقع نکال کر میرے پاس آ جاتا تھا۔ وہ اور اس کی دادی کئی برس سے کیلیوں کی قید میں تھے۔ میں نے عبو کی مدد سے فرار کا منصوبہ بنایا اور دھیرے دھیرے فرار کا سامان ٹاپو پر منگوانا شروع کیا۔ آخر وہ دن آ گیا جب کیلی لوگ کائن قبیلے سے جنگ کے لیے نکل گئے اور پورا گاؤں خالی ہو گیا۔ عبو کی کشتی اور میری رائفل جو گاؤں سے عبو لے آیا تھا، میرا بڑا سہارا تھی۔ دشوار گذار جنگلوں سے ہوتے اور درندوں کا شکار کرتے ہوئے، ہم میسیری پہنچے۔ وہاں سے عبو اور اس کی دادی کو ان کے وطن بنٹالو پہنچایا۔ بنٹالو پہنچ کر انکشاف ہوا کہ عبو دراصل اس لڑکے کے بھیس میں لڑکی تھی جسے اس کے والد بچپن ہی سے لڑکوں کا لباس پہناتے تھے۔

ان لوگوں کو پہنچا کر میں جہاز سے برونی روانہ ہو گیا۔ طرح طرح کے خیالات پریشان کیے ہوئے تھے۔ عنایت کی کوئی خبر نہیں تھی۔ اس کے بغیر میں امریکا نہیں جا سکتا تھا۔ سلطان برونی کی طرف سے بھی خطرہ تھا کیونکہ میری وجہ سے ان کا بہت نقصان ہوا تھا لیکن سلطان بہت اچھی طرح پیش آئے اور مجھے زندہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے بتایا کہ کیلیوں کے حملے میں ہمارے آٹھ آدمی زخمی ہوئے اور چار جان سے مارے گئے۔ بچے ہوئے لوگوں کو کائن لوگ اپنے گاؤں لے گئے اور ان کی مرہم پٹی وغیرہ کی۔ لیکن ایک دن اچانک کیلیوں نے ان کے گاؤں پر حملہ کر دیا۔ کائن کو شکست کھانا پڑی۔ کیلیوں نے ان کے گاؤں میں داخل ہو کر خوب لوٹ مار کی، پھر احمد اور عنایت سمیت کئی لوگوں کو گرفتار کر کے اپنی بستی میں لے گئے۔

اب میرے دل میں انتقام کی آگ لگی ہوئی تھی۔ میں نے سلطان کی امداد سے کچھ سپاہیوں اور ایک مشین گن کا انتظام کیا، پھر کائنوں کی مدد سے ایسا ظاہر کیا کہ وہ لوگ کیلیوں سے جنگ کرنے آ رہے ہیں۔ سارے کیلی مسلح ہو کر میدان میں آ گئے اور ہمارے سپاہیوں نے ان پر رائفلوں اور مشین گن سے گولیوں کی بارش کر دی۔ کیلیوں کا سردار اور اس کے بہت سے لوگ مارے گئے، باقی بھاگ کر اسی جزیرے میں چھپ گئے جہاں میں نے ایک مہینے کی قید کاٹی تھی۔ پھر ہم لوگ ان کی بستی میں داخل ہوئے جہاں ہمارے سب آدمی صحیح سلامت موجود تھے۔ عنایت وغیرہ کو لے کر میں سلطان برونی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تین دن ان کا مہمان رہا۔ چوتھے دن ایک چھوٹے جہاز پر عنایت کے ساتھ لابون اور وہاں سے اسٹیمر پر سنڈیکن آ گیا۔

Scanned with CamScanner

بورنیو میں مجھے دس مہینے ہو گئے تھے۔ اب میں نے پھر امریکا کا ارادہ کیا۔ فلپائن کا جنوبی جزیرہ منڈ ناؤ سنڈ یکن سے قریب تھا۔ میں امریکن قونصل سے ملا اور منڈ ناؤ پہنچنے کی ساری دقتیں دور ہو گئیں۔ میں جہاز سے روانہ ہو کر فلپائن کے پہلے بندرگاہ زیبونگا میں داخل ہو گیا۔ کسٹم کے مراحل طے کر کے ہم باہر نکلے۔ اب ہم فلپائن میں تھے۔ ایک یہودی نے رات بسر کرنے کے لیے ہمیں اپنے ایک مکان کا پتا بتایا۔ عجیب دہشت ناک مکان تھا۔ یہاں میرا سابقہ جناتوں سے پڑا۔ عنایت تو ڈر کے مارے بے ہوش ہو گیا۔ میں نے جناتوں کے قصے بہت سن رکھے تھے لیکن ان پر یقین نہیں کرتا تھا۔ آج رات کو مجھے جناتوں کے دربار میں پہنچایا گیا۔ ان کے بادشاہ سے بھی ملاقات ہوئی۔ دربار بالکل سادہ تھا۔ بہت سے جن کھلے میں پتھروں پر بیٹھے تھے۔ سب لمبے کرتے پہنے، ننگے سر اور عام انسانوں کی طرح تھے۔ صرف ان کی آنکھیں زرد اور بہت چمکیلی تھیں۔ بادشاہ نے مجھ سے بہت مہربانی کے ساتھ بات کی، پھر مجھے واپس بھجوا دیا۔ عنایت ابھی تک بے ہوش تھا اور اسے تیز بخار تھا۔ سویرے ہم ایک مسلمان قادر خان کے ہوٹل میں اٹھ گئے۔ قادر خان مسلمان راجپوت اور عنایت ہی کی برادری کا تھا۔

منڈ ناؤ فلپائن کا بڑا جزیرہ ہے جس کا صدر مقام زنبونگا ہے۔ باشندوں میں مسلمان بہت ہیں۔ پابندِ مذہب ہیں لیکن ہندوستانیوں کی طرح پسماندہ۔ پان اور تمباکو بہت کھاتے ہیں جس کی وجہ سے مردوں عورتوں کے دانت سیاہ رہتے ہیں۔

میں منیلا جانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ ایک دن عنایت نے بتایا کہ اس کا ایک خالہ زاد بھائی رحمت خان فلپائن آیا تھا، تین برس پہلے وہ کاٹوباٹا کی تانبے کی کان میں ملازم تھا لیکن اب اس کا کوئی پتا نہیں چلتا۔ آپ اجازت دیں تو میں کاٹوباٹا چلا جاؤں، دولت کو تلاش کروں۔ آپ منیلا چلے جائیں، میں وہیں آپ کے پاس آ جاؤں گا۔

میں ان واقعات سے بہت متاثر ہوا اور خود بھی رحمت خان کی تلاش میں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ہم ایک بادبانی جہاز پر کاٹوباٹا پہنچے۔ وہاں سے چالیس پچاس میل کے فاصلے پر کوہ النیو کے قریب تانبے کی کانیں ہیں۔ راستے ہی میں ایک وحشی سا آدمی ملا، جو ابھی ابھی ایک آدمی کا آدھا کان چبا کر دریا میں کود پڑا اور تیرتا ہوا غائب ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ بہت سے لوگوں کے کان چبا چکا ہے اور سب

Scanned with CamScanner

اسے جنگلی بھوت کہتے ہیں۔ ادھر رحمت خان کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ تانبے کی کان میں کام کرتا تھا کہ اس کے چیچک نکل آئی جس کی گرمی اس کے دماغ پر چڑھ گئی اور وہ پاگل ہوگیا۔ اسی پاگل پن میں اس نے اپنے ایک ساتھی کا کان چبالیا اور جنگلوں میں غائب ہوگیا۔ اب تین سال سے اس کی کوئی خبر نہیں۔ میں سارا معاملہ سمجھ گیا کہ جنگلی بھوت کوئی اور نہیں رحمت خان ہی ہے۔ میں نے بڑی ترکیبوں سے اسے پکڑ کر جیل ہسپتال میں بھرتی کرادیا۔ عنایت خان ابھی اس کے پاس رہنا چاہتا تھا۔ ناچار میں تنہا امریکا روانہ ہوگیا۔

3 حصہ سوم: امریکا

جنوری 1910 تا ستمبر 1913

اوائل جنوری 1910 میں فلپائن کے صدر مقام منیلا سے امریکا روانہ ہوا۔ منیلا میں بھی ہندوستانی بڑی تعداد میں ہیں لیکن زیادہ تر چھوٹے کاروبار یا معمولی ملازمت کرتے ہیں۔ فلپائن کے عام باشندے ان کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے اور یہ لوگ ''بمبئی'' کہلاتے ہیں۔

تیسرے دن ہمارا جہاز ہانگ کانگ پہنچا۔ یہاں بھی ہندوستانی بہت ہیں۔ کولمبو کے بھی کچھ لوگ ہیں جو ہاتھی دانت، آبنوس اور نگینوں کی تجارت کرتے ہیں۔ میں نے ان سے ایک ہزار روپے کا مال خرید کر اسے امریکا بھیجنے کا آرڈر دے دیا۔ جاپانی بندرگاہ یوکوہاما میں رُکتے ہوئے ہم جزائر ہوائی کے صدر مقام ہونولولو پہنچے۔ یہ جزائر پہلے آزاد تھے اب 1898 سے یہاں امریکی حکومت ہوگئی ہے۔ آخر کار ہم سان فرانسسکو پہنچ گئے۔ یہ بالکل نئی دنیا تھی۔ میں نے چائنا ٹاؤن کے ایک سستے چینی ہوٹل میں قیام کیا۔

میرے پاس امریکا کے کئی ڈینٹل کالجوں کے پتے تھے۔ میرا ارادہ شکاگو کے کالج میں داخلہ لینے کا تھا، لیکن معلوم ہوا کہ سان فرانسسکو کی کیلیفورنیا یونیورسٹی کا ڈینٹل کالج بہت اچھا ہے۔ میں نے وہیں داخلے کا فارم بھر دیا۔ چونکہ وہاں نئے داخلے جولائی میں ہوتے ہیں اس لیے میرے پاس پانچ مہینے کا وقت فاضل تھا۔ ہانگ کانگ سے نگینوں کا پارسل میرے پاس پہنچ گیا تھا۔ کچھ نگینے بورنیو سے

Scanned with CamScanner

میرے پاس بچے ہوے تھے۔ یہ بہت آسانی سے اور اچھی قیمت پر فروخت ہو گئے۔ امریکی لوگ نگینوں کے بہت شوقین ہوتے ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ امریکا میں سال کے بارہ مہینوں کے الگ الگ نگ ہوتے ہیں، جس کی جس مہینے کی پیدائش ہوتی ہے وہ اسی مہینے کا نگ پہنتا ہے۔

جہاز میں دو فلپائنیوں مسٹر انتونی اور مسٹر سلوڈور سے میری دوستی ہو گئی جو پناما میں رہتے تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ ہانگ کانگ سے آیا ہوا مال لے کر جنوبی امریکا چلا جاؤں اور وہاں سیر و شکار میں اپنی پانچ مہینے کی چھٹی گذاروں۔ میں نے پناما اور برازیل کے پاسپورٹ بنوائے اور ان دونوں کو اپنے آنے کی اطلاع کر دی۔ جب میں پناما پہنچا تو دونوں نے میری بڑی خاطر مدارت کی لیکن پناما میں میرا دل نہیں لگا اور چار پانچ دن بعد وہاں سے روانہ ہو گیا۔

سفر میں ایک آسٹریلین مسٹر بورڈو کے ساتھ میرا وقت بہت اچھا گذرا تھا۔ برازیل کے شہر باہیا میں ان کی سکونت تھی۔ انھیں شکار کا بہت شوق تھا۔ انھوں نے مجھ کو باہیا بلایا اور میں وہاں پہنچ گیا۔ اب میں برازیل میں تھا۔ یہاں شمالی امریکا کے شہروں کی طرح دولت کی فراوانی تو نہیں تھی پھر بھی بہت خوش حالی ہے۔ باشندے بہت محنتی ہیں۔ مسٹر بورڈو مویشیوں کے علاوہ دودھ، مکھن، پنیر کی تجارت کرتے تھے۔ ان کے ماموں کا جواہرات اور گھڑیوں کا کاروبار تھا۔ انھوں نے میرے نگینے بہت پسند کیے اور اصل سے تین گنی قیمت پر خریدے۔

مسٹر بورڈو کے فارم میلوں تک پھیلے ہوے تھے۔ ان کے آگے جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ مسٹر بورڈو کاروباری مصروفیات کے باوجود مہینے میں دس دن شکار کھیلتے تھے۔ ان کی اہلیہ بھی بہت عمدہ شکاری تھیں۔ مسٹر بورڈو نے شکار کا انتظام کیا۔ ہم نے ٹرین اور پھر گھوڑوں پر سفر کیا۔ راستے میں ایک گاؤں سے گذرتے ہوے میری نظر کچھ سرحدی پٹھانوں پر پڑی۔ رسمی گفتگو کے بعد انھوں نے ہمیں یہاں مدعو کیا۔ وہاں کئی اور پٹھان موجود تھے۔ یہ خوش حال لوگ تھے اور انھوں نے امریکا میں بھی اپنی وضع قطع اور طرز بود و باش میں تبدیلی نہیں کی تھی۔ اپنے وطن کے حقے ساتھ رکھتے ہیں۔ روٹی کے لیے تندور ہیں اور نماز کے لیے مسجد بھی ہے۔ تھوڑی دیر میں دسترخوان بچھایا گیا، بڑی بڑی تندوری روٹیاں، مسلم مرغ اور بھنا ہوا گوشت وغیرہ۔ مسٹر اور مسز بورڈو نے بھی بڑے شوق سے کھایا۔ اس کے بعد ڈھول، نفیری وغیرہ کے ساتھ پشتو زبان میں گیت اور پٹھانی رقص کی محفل ہوئی۔

Scanned with CamScanner

وہاں سے ہم آگے بڑھے اور ایک خوشنما وادی میں داخل ہوئے۔ یہاں بھی مسٹر بورڈو کے فارم تھے۔ ایک عدد بنگلے میں ہم نے رات گذاری۔ دوسرے دن سویرے سویرے جنگل میں داخل ہوئے۔ یہاں ایک جیگوار نے مسٹر بورڈو پر حملہ کیا لیکن مسز بورڈو نے، جن کا نشانہ غضب کا تھا، رائفل سے اس کا خاتمہ کر دیا۔ آگے بڑھ کر ایک ٹیپر نظر آیا۔ میں نے پھر فائر کیا اور اس کا پیچھا کرتا ہوا دور نکل گیا۔ راستے میں ایک جیگوار مجھ پر بھی جھپٹا، میں نے اسے ختم کر دیا۔

میں بہت دور نکل آیا تھا اور میرے ساتھیوں کا کہیں پتا نہ تھا۔ جنگل کا اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ مجھے سمتوں کا بھی احساس نہیں رہا تھا اور اب ان کا سراغ لگانا ممکن نہیں تھا۔ ناچار میں نے آگ جلا کر جنگل ہی میں رات بسر کی۔ دوسرے دن صبح میں نے ایک ہوائی فائر کیا۔ قریب ہی سے جوابی فائر کی آواز آئی۔ میں اس طرف چل پڑا اور میرے ساتھی مجھے مل گئے۔ برازیل کے جنگلوں میں یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔

امریکا میں دو قومیں قدیم سے آباد ہیں۔ ایک تو حبشی جو نیگرو کہلاتے ہیں، دوسرے ریڈ انڈین جن کے متعلق معلوم نہیں کہ یہ لوگ کب یہاں آ کر آباد ہوئے۔ شکل صورت سے یہ عرب معلوم ہوتے ہیں اور ان کی زبان بھی عربی سے ملتی جلتی ہے۔ جب کولمبس نے امریکا دریافت کیا ہے تو یہ لوگ پہلے سے یہاں موجود تھے۔ بستیوں کے نزدیک رہنے والے بہت کچھ مہذب ہو گئے ہیں لیکن جو جنگلوں میں رہتے ہیں وہ سخت وحشی اور خطرناک ہیں۔

جنگل سے پہلے سابقے کے بعد میری ہمت ٹوٹ چلی تھی لیکن پھر شکار کا ولولہ اٹھا اور ہم مسٹر بورڈو کے ساتھ شکار پر روانہ ہوئے۔ آج میں نے برازیل کے جانور الپاکا کو دیکھا۔ یہ ہرن کی قسم کا خوبصورت جانور ہوتا ہے۔ میں نے ایک کا شکار بھی کیا۔ ہم نے ریڈ انڈینوں کی ایک بستی کے قریب اپنا کیمپ بنایا اور دوسرے دن پھر شکار پر نکلے۔ اب جنگل گھنا اور تاریک ہوتا جا رہا تھا۔ یہاں ایک پوتا شیر نے ہم پر حملہ کیا۔ مسٹر بورڈو کے حبشی ملازم نے اپنے خنجر سے اس کا کام تمام کیا اور خود بھی زخمی ہوا۔ دور پر ویکونا گھاس چر رہے تھے۔ یہ نہایت خوبصورت جانور تھے۔ معمولی ہرن سے قد میں بڑے، جسم شتر مرغ کا سا، گردن، منھ اور کان اونٹ کے سے، رنگ کالا اور ٹانگیں ہرن کی سی۔ میں نے ایک نر کو مارا اور ذبح کر لیا۔

Scanned with CamScanner

یہاں میں اور جیمز راستہ بھول کر کیمپ سے دور نکل آئے۔ اسی وقت ایک جیگوار نے ہم پر حملہ کیا۔ مجھ پر اس کا تھپڑ پڑا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ رائفل بھی میرے ہاتھ سے نکل گئی۔ ہوش میں آیا تو ایک سوکھے نالے میں اکیلا پڑا تھا۔ جنگل سیاہ تھا، رات ہو چکی تھی اور بجلی، گرج اور ہوا کا طوفان غضب کا تھا۔ جیگوار کا زخم بڑی تکلیف دے رہا تھا۔ بارش سے کپڑے بھیگ گئے تھے، رائفل بھی پاس نہیں تھی۔ کسی طرح جنگل کی وہ رات کٹی۔ حسنِ اتفاق سے ایک درخت کے نیچے میری کھوئی ہوئی رائفل مل گئی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کدھر جاؤں۔ میں نے ریوالور سے دو ہوائی فائر کیے لیکن کسی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا، پھر آگے بڑھا۔ راستے میں ایک ندی ملی جس کو میں نے تیر کر عبور کیا۔ شام ہو رہی تھی، جنگلی درندوں کا شور بڑھ گیا۔ میں نے ایک درخت پر چڑھ کر رات کاٹی۔ میرا رخ ایک پہاڑ کی طرف تھا۔ وہ آتش فشاں نکلا۔ گرمی شدت کی تھی۔ مجھے نیند بھی آ رہی تھی۔ کئی قسم کے جانور نظر آئے مگر میں نے کسی پر گولی نہیں چلائی اور وہیں پڑ کر سو گیا۔ قریب ایک ہفتے تک میں اسی جگہ رہا اور کڑوے کسیلے پھل کھا کر پیٹ بھرتا رہا۔

ایک صبح آنکھ کھلی تو دور پر ایک بارہ سنگھا نظر آیا۔ اس پر فائر کیا، وہ زخمی ہو کر بھاگا، میں خون کے نشان پر چلتا گیا اور اس بھاگ دوڑ میں بہت دور نکل آیا۔ اب میں ایک خوشنما وادی میں تھا۔ دور ندی کے کنارے پر میں نے دیکھا کہ قریب ستر سال کی عمر کا ایک بوڑھا مچھلی کا شکار کر رہا ہے۔ یہ ڈبلن کا رہنے والا جان آگسٹن تھا جو پانچ سال سے یہیں رہ رہا تھا۔ اس کے ساتھ بہت سے حادثے آئے۔ آخری حادثہ یہ تھا کہ اس کا جرائم پیشہ بیٹا بھاگ گیا تھا۔ وہ اس کو جنگلوں میں تلاش کرتا پھرا۔ یہاں تک پہنچ کر اس کی ہمت ٹوٹ گئی اور وہ یہیں رہ پڑا۔ میں بھی اس کے ساتھ رہنے لگا۔ وہاں ایک عجیب قسم کی مچھلی دیکھی، جس کا سر عورت کا سا تھا۔

مجھے وہاں رہتے چار ہفتے ہو گئے تھے۔ ایک دن آتش فشاں نے آگ اگلنا شروع کر دی اور زلزلے کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ میں بوڑھے کا ہاتھ پکڑ کر بھاگا۔ جنگل میں بھی آگ لگ گئی تھی۔ ہم نے کسی طرح ایک ناؤ بنائی اور ندی میں سفر شروع کیا۔ راستے میں ہم کو آدم خور مکڑے ملے جو ہر انسان اور جانور کو کھا جاتے تھے۔ ان سے بچ کر نکلے اور مختلف درندوں سے بچتے بچاتے ایک بلند جگہ پر آرام کرنے کے لیے ٹھہر گئے۔ اب ایک جنگلی بھینسا ہمارے پیچھے پڑ گیا۔ کئی دن تک جہاں بھی ہم جاتے

Scanned with CamScanner

اس کو موجود پاتے۔ بڑی مشکل سے کئی بار اسے زخمی کرنے کے بعد میں نے اسے مار کر نجات پائی۔

آگے بڑھے تو بہت سے ریڈ انڈین جنگلیوں کے نرغے میں آ گئے۔ انھوں نے رسے پھینک کر ہم کو گرفتار کر لیا اور اپنے گاؤں میں لے جا کر ہمیں الگ الگ بند کر دیا۔ اتفاق سے ہوا کا طوفان آ گیا اور جنگلیوں کی جھونپڑیوں میں آگ لگ گئی۔ ہمارے پہریدار بھی اس طرف بھاگے اور مجھے بچ نکلنے کا موقع مل گیا۔ معلوم نہیں بوڑھے آگسٹن کا کیا حشر ہوا۔ میں بھاگتا ہوا ان کی حد سے دور نکل گیا لیکن جنگلی میرا تعاقب کر رہے تھے۔ میں ایک درخت پر چڑھ گیا۔ جنگلی آ پہنچے۔ میں نے ایک کو ریوالور سے ہلاک کر دیا اور اسی کے گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر بیٹھ کر بھاگا۔ ایک دریا آیا۔ اسے تیر کر پار کیا، راستے میں بہت مشکلیں پیش آئیں اور مجھے اندازہ نہیں رہ گیا کہ برازیل کے جنگلوں میں کس مقام پر ہوں۔ رات کو ریوالور سے فائر کر کے سوکھی پتیوں میں آگ لگا لیتا۔ اس طرح درندوں سے نجات رہتی تھی۔

آخر ایک پر فضا مقام پر پہنچ گیا۔ یہاں جنگل چھدرے تھے۔ مجھے درختوں پر نمبر پڑے ہوئے دکھائی دیے اور انسانی آبادی نظر آئی۔ اس بستی کے لوگ مہذب تھے لیکن ہم ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھتے تھے، البتہ اتنا معلوم ہو گیا کہ یہ گویاز کے علاقے کا حصہ ہے۔ باہیا یہاں سے بہت دور نہیں تھا۔ ان لوگوں کی مدد میں گویاز پہنچ گیا۔ میری ہیئت بگڑ گئی تھی۔ لیکن میری جیب میں کچھ نقدی تھی جو جنگل کی مصیبتوں میں بھی محفوظ رہی تھی۔ میں نے حجامت بنوائی، نئے کپڑے خریدے اور شہر گھومنے نکلا۔ واپس اپنے ہوٹل میں آیا تو کچھ جرمن افسر میرا انتظار کر رہے تھے۔ انھوں نے میرا پاسپورٹ طلب کیا۔ انھیں مجھ پر جاسوس ہونے کا شبہ تھا۔ میں نے اپنا حال بتایا اور کہا کہ میرا پاسپورٹ وغیرہ باہیا میں مسٹر بورڈو کے یہاں ہے۔ ان لوگوں نے مجھے جیل میں بند کر دیا اور باہیا میں میرے متعلق دریافت کیا۔ وہاں سے میرا سامان آ گیا اور مجھے چھوڑ دیا گیا۔ میں جہاز میں بیٹھ کر باہیا پہنچا۔ مسٹر بورڈو وغیرہ کو یقین تھا کہ اس تین مہینے کی مدت میں مجھے کوئی حادثہ پیش آ گیا ہوگا۔ کچھ دن بعد میں پناما ہوتا ہوا 10 جون 1910 کو سان فرانسسکو پہنچ گیا۔ ڈینٹل کالج میں میرا داخلہ ہو گیا اور یکم جولائی سے میں نے کالج میں پڑھنا شروع کر دیا۔ کچھ تجارتی سلسلہ بھی چلتا رہا جس کی وجہ سے مجھے پیسے کی تنگی نہیں ہوئی اور میں نے دھیرے دھیرے کر کے ڈینٹسٹری کا سامان بھی جمع کر لیا۔

Scanned with CamScanner

یہاں میری ملاقات عنایت خان سے ہوئی۔ وہ بھی سان فرانسسکو آ گیا تھا۔ میں تو تعلیم ختم کر کے واپس آ گیا تھا مگر عنایت وہیں رہا۔ واپسی کے راستے میں مجھے فاطمہ کا ایک رشتہ دار ملا جس نے بتایا کہ فاطمہ مر گئی۔

13 ستمبر 1913 کو میں کلکتے پہنچ گیا۔ اس طرح تقریباً پانچ سال کے بعد میرا یہ سفر ختم ہوا۔

❋❋

Scanned with CamScanner

خواہش زدہ تحقیق

(بہ نام رشید حسن خاں)

برادرم خان صاحب، آداب

خدا کرے آپ کی صحت بہ حال ہو۔ یہ خط کچھ بادلِ ناخواستہ لکھ رہا ہوں۔ قصہ یہ ہے کہ اِدھر آپ کے ایک مضمون ''مثنویاتِ شوق، لکھنوی معاشرت کے آئینے'' (ایوانِ اردو، اپریل 1998) کے حوالے سے مجھ پر طعنے پڑ رہے ہیں کہ ''آپ کے دوست'' اور ''آپ کے محققِ اعظم'' نے یہ مضمون جو لکھا ہے اس کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں۔ اتفاق سے ایوانِ اردو کا یہ شمارہ میرے پاس نہیں آیا، لیکن ایک صاحب نے مجھے اس کی نقل بھجوادی۔ بھائی، آپ نے تو حد کردی۔ میں آپ کو اب بھی اپنے عہد کے سب سے بڑے محققوں میں شمار کرتا ہوں، لیکن یہ مضمون ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے تحقیقی اصولوں کی جملہ خلاف ورزیوں، غیر محققوں کی تحقیقی خرمستیوں اور ''ناتحقیقی'' ستم ظریفیوں کی مثال میں نمونے کے طور پر لکھا ہے۔ اب میں طعنوں کا جواب تو کیا دے پاتا، مناسب یہی معلوم ہوا کہ اس مضمون کی سب نہیں، کچھ قباحتوں کو آپ کے گوش گزار کر کے دریافت کروں کہ یہ معاملہ کیا ہے اور آپ کے سے محقق کو بیٹھے بٹھائے یہ کیا ہوگیا۔

یہ مضمون اگر اپنے عنوان کی حدوں کے اندر رہتا تو میں اس کے دفاع میں یہ کہہ سکتا تھا کہ خان صاحب نے صرف یہ دکھایا ہے کہ شوق کی مثنویاں لکھنوی معاشرے کے کن پہلوؤں کا آئینہ نظر آتی ہیں، اور مضمون کی بنیادی خامی یہ ہے کہ مضمون نگار نے ان مثنویوں کو سوچ سمجھ کر نہیں پڑھا اور اس ناقص مطالعے کی وجہ سے ان آئینوں کی بعض مثالیں انھوں نے نہیں دیکھیں (مثلاً زہرِ عشق کا دو تہائی حصہ جو ہیروئن کی خودکشی سے تعلق رکھتا ہے، اور جو اس مثنوی کی مقبولیت کا اصل سبب رہا ہے،

Scanned with CamScanner

مضمون نگار نے اس کو نظر انداز کر دیا اور اس بحث سے سروکار نہیں رکھا کہ وہ کون سے معاشرتی دباؤ تھے جن کی وجہ سے ایک لڑکی کو اپنی محبت کا راز کھل جانے پر اس شہر لکھنؤ میں خودکشی کرنا پڑ گئی جہاں مضمون نگار کی رائے میں عورتوں مردوں کے ناجائز جنسی تعلقات عام تھے)۔ مگر آپ نے غضب یہ کیا کہ لکھنوی معاشرت کے موضوع پر اپنے برائے نام اور یک رُخے مطالعے کو کافی جان کر خود طبع آزمائی شروع کر دی۔ بھائی، کسی تہذیب اور معاشرے کے تجزیاتی اور تحقیقی مطالعے کے کیا آداب اور طریق کار ہوتے ہیں اس کی ابجد سے ناواقفیت کے باوجود اگر آپ کو قلم اٹھانا ضرور تھا تو کم از کم اس موضوع پر کچھ غیر مربوط سا مطالعہ ہی کر لیتے۔ آپ کا عالم یہ ہے کہ گذشتہ لکھنؤ بھی آپ نے پوری طرح نہیں پڑھی، کمال الدین حیدر کی تاریخ تک (باوجودے کہ وہ انگریزوں کے لیے ان کے ایک وفادار نے لکھی تھی) آپ کی رسائی نہیں، نول کشور کی تواریخ نادر العصر، جو ایک انگریز کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے تحریر ہوئی تھی (اس کا نام ہی تحفۂ کرنل ایبٹ ہے)، وہ بھی آپ کے لیے مجہول رہی۔ لکھنؤ کی گھریلو معاشرت کا آپ کو پتا نہیں اس لیے کہ عباس حسین ہوش کی مثنوی تفسیرِ عفت، افسانۂ نادر جہاں، لکھنؤ کی عورتوں کے بارے میں خواجہ عبدالرؤف عشرت کے مجموعے (ہم جولی حصہ اول و دوم) قسم کے ضروری ماخذوں سے آپ کی شناسائی نہیں۔ لکھنؤ میں طوائفوں کی حیثیت پر آپ فیصلہ کن گفتگو کرتے ہیں اور امراؤ جان ادا تک کو اٹھا کر نہیں دیکھتے کہ وہ آپ کی تائید کر رہی ہے یا نہیں۔ قدیم ہنر و ہنر مندان اودھ، وضع داران لکھنؤ، عظیم آبادی سیاح نجات حسین خاں کے سفرنامے سوانح لکھنؤ اور دوسرے سفرناموں، لکھنؤ والوں کی سوانح عمریوں، خودنوشتوں، خطوں کے مجموعوں، روزنامچوں وغیرہ کا تو ذکر ہی کیا، خود اپنی مرتب کی ہوئی فسانۂ عجائب کا مشہور و معروف ''بیانِ لکھنؤ'' اور اپنے تحقیقی ایمان کے مرکز شرر کا ناول طاہرہ، حتیٰ کہ ماہنامہ نیا دور کے دونوں حالیہ اودھ نمبر بھی آپ کو دکھائی نہیں دے رہے ہیں۔ پیشگی فیصلہ کر لینے کے بعد جذبات اور تاثرات کی تابع تحقیق کو غیر جانبداری کے انداز میں پیش کرنا اور اپنے پیشگی جذباتی فیصلے اور قلبی خواہش کے برخلاف شواہد کو دیکھنے سے کنھیا لال کپور کے ''مسٹر ڈالر'' کی طرح بالارادہ معذور ہو جانا آپ کی تحقیق کی کمزوری رہی ہے لیکن اس مضمون میں یہ کمزوری ناقابلِ یقین حد تک بڑھ کر ''خواہش زدہ'' تحقیق کی مکمل مثال بن جاتی ہے۔

Scanned with CamScanner

لکھنؤ کی تہذیب اور معاشرے میں کچھ لکھنے کے لیے کس قسم کے اور کتنے ماخذوں سے استفادے کی ضرورت ہے، اس کا اندازہ آپ کو نہ سہی، پھر بھی ذرا اپنے مضمون کے ماخذوں کی فہرست پر ایک نظر ڈال لیجیے:

1۔ نجم الغنی	تاریخ اودھ	(صرف منفی شواہد)
2۔ شرر	گذشتہ لکھنؤ	(صرف منفی شواہد)
3۔ شوق	مثنویاں	(صرف منفی شواہد)
4۔ پروفیسر آل احمد سرور	(لکھنؤ کی طوائفیں)	
5۔ پروفیسر خورشید الاسلام	(لکھنؤ کی طوائفوں کی سوز خوانی)	

یہ لکھنؤ کی پیچیدہ اور کثیر الابعاد تہذیب و معاشرت پر آپ کے ماخذوں کی کل بساط ہے۔ اس کا دوسروں کو تو کیا، خود آپ کو بھی یقین نہ آنا چاہیے۔ اور اس بساط پر جس تیقن اور خود اعتمادی کے ساتھ قول فیصل کے انداز میں آپ نے گفتگو کی ہے اور تحقیق کے معروضی، منطقی اور غیر جذباتی انداز کو جس طرح نظر انداز کیا ہے اس کو بے علمی کی جسارت کے سوا اور کیا کہا جائے۔

آپ کا یہ قول مجھے پسند ہے کہ تحقیق کی بنیاد شک پر ہوتی ہے، لیکن آپ کے اس مضمون میں تحقیق کی بنیاد شک پر نہیں، ایمان، بلکہ ایمان بالغیب پر، اور شواہد پر نہیں، مفروضوں، بلکہ افواہوں پر ہے۔ ایمان کا ایسا مظاہرہ بھی کم دیکھنے میں آتا ہے کہ لکھنوی معاشرے کا محقق پروفیسر خورشید الاسلام اور میرے شفیق محترم سرور صاحب سے استناد کرے، اور وہ محقق رشید حسن خان کے پائے کا ہو۔ خورشید صاحب اور سرور صاحب بہر حال دیانتدار نقاد ہیں، وہ خود اس پر راضی نہ ہوں گے کہ انھیں اس موضوع پر سند بنا دیا جائے۔

مذکورۂ بالا پانچ، اور سچ پوچھیے تو صرف تین، وہ بھی نامکمل، ماخذوں کے بل بوتے پر آپ نے جو کچھ لکھا ہے اور اس لکھے ہوے سے جو منطقی نتیجہ برآمد ہوتا ہے اس کے تھوڑے سے نمونے دیکھ لیجیے:

1۔ لکھنؤ کے علمائے فرنگی محل ہوں یا خاندانِ اجتہاد کے مراجع دین، یا صوفیائے کرام کے حلقے، یا انیس و دبیر اور محسن کاکوروی اور امیر مینائی قسم کے شاعر، یا پابندی شرع میں حد سے بڑھ کر لطیفوں کا موضوع بن جانے والے ثقات اور دوسرے اشرافیہ طبقات، عیش طلبی نے ان میں سے "کسی کو کسی اور

کام کارکھا ہی نہیں تھا۔ عیش، تفریح اور لذت اندوزی کو زندگی کا واحد مقصد بنا دیا تھا۔" (ص 6)

"کسی کو کسی اور کام کارکھا ہی نہیں تھا" کا مطلب یہ ہوا کہ لکھنؤ میں بلا استثنا ہر طبقے کا صرف "عیش، تفریح اور لذت اندوزی میں منہمک تھا اس لیے کہ یہی اس کی "زندگی کا واحد مقصد" رہ گیا تھا۔

2۔ لکھنؤ کے مختلف افراد کی جو تصویریں کثیر تعداد میں ملتی ہیں اور یہاں کے لوگوں کی وضع قطع اور لباس وغیرہ کے بارے میں جو چشم دید بیانات فراوانی کے ساتھ دست یاب ہیں وہ آپ کی نظر میں معتبر نہیں ہیں اس لیے کہ:

"لکھنؤ میں یہ عام وضع ہوگئی [تھی] کہ سر پر مانگ، اس پر مسالے کی کام دار ٹوپی... ماتھے پر دونوں طرف پٹیاں..." وغیرہ وغیرہ۔ (ص 7) (آپ کا ماخذ: شرر)

مگر ان تصویروں اور بیانوں میں عام طور پر یہ "عام وضع" نظر نہیں آتی۔ مثلاً میر انیس کے سر پر سفید سوتی پنچ گوشیہ ٹوپی، نواب والا جاہ کے سر پر عمامہ نظر آتا ہے اور چکن کی دو پلی ٹوپی تو لکھنؤ میں رواج عام رکھتی تھی، لیکن آپ کا تائید یافتہ بیان ان شواہد کو جھٹلا رہا ہے۔ البتہ یہاں صرف ایک سوال کرنا ہے کہ کیا آپ کی نظر سے لکھنؤ والوں کی قلمی، عکسی، تحریری تصویریں نہیں گذریں؟ یا شرر کی زبان پر آپ اپنی آنکھوں سے زیادہ ایمان رکھتے ہیں؟

3۔ لکھنؤ کی تہذیب کے بارے میں وہ سارے معاصر، چشم دید بیان اور وہ تمام راست ماخذ جو طوائفوں کے ذکر سے خالی ہیں، جھوٹے اور گمراہ کن ہیں۔ لکھنؤ کی تہذیب کا اصل مظہر طوائفیں تھیں اس لیے کہ آپ کے بہ قول "طوائف کو معاشرے میں تہذیبی نمائندگی کا شرف مل گیا تھا۔" (ص 8) یعنی جو لوگ لکھنؤ میں کسی نہ کسی طوائف سے شرف ملاقات حاصل نہ کر سکے انھوں نے لکھنؤ کی تہذیب اور معاشرے کو دیکھا ہی نہیں۔

4۔ آپ لکھتے ہیں:

"اس معاشرے میں طوائف کی اہمیت اور حیثیت کا اس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عزاداری جیسی مذہبی چیز بھی ان کی دسترس سے باہر نہیں رہی تھی۔" (ص 8)

لکھنؤ کے شہدوں اور فقیروں کی عزاداری بھی مشہور تھی، بلکہ عزاداری کسی کی بھی "دسترس سے باہر نہیں

رہی تھی''۔ کیا آپ ''اس معاشرے میں'' شہدوں، فقیروں بلکہ عزاداری کی دست گاہ رکھنے والے ہر کس و ناکس کی ''اہمیت اور حیثیت کا اس سے بخوبی اندازہ'' کر سکتے ہیں؟

5۔ فرنگی محل، خاندانِ اجتہاد اور دوسرے دینی مراکز کا پھر ذکر کرنا پڑ رہا ہے، حالانکہ آپ کا مضمون اس ذکر سے خالی رکھا گیا ہے۔ کیا اس لیے کہ آپ کے حسبِ تحقیق لکھنؤ کے ''معاشرے میں تہذیبی نمائندگی کا شرف'' ان مرکزوں کو نہیں، طوائفوں کو حاصل تھا، تہذیب کے میدان میں یہ مراکز کوئی حیثیت اور اہمیت نہیں رکھتے تھے؟ لیکن مذہب بھی تہذیب اور معاشرے کا ایک اہم جز ہوا کرتا ہے۔ آپ نے لکھنؤ میں ''مذہبیت کی طاقت و روایت'' اور تہذیب پر اس کے ''دیرپا اثرات'' کو تسلیم بھی کیا ہے (ص 6)۔ سوال یہ ہے کہ کیا مذہب کے میدان میں بھی یہ دینی مراکز ہیچ اور بے حیثیت تھے؟ آپ کا مضمون اس سوال کا جواب اثبات میں دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ عزاداری میں بھی:

''طوائفوں نے سوز خوانی کے کمال سے فائدہ اٹھا کر دخل حاصل کر لیا تھا اور اس طرح دنیا ہی نہیں، آخرت بھی اُن کے ہاتھ میں چلی گئی تھی۔'' (ص 8) (آپ کا ماخذ: خورشید الاسلام)

اس بیان کی تائید میں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ علمائے فرنگی محل میں کسی ایسے بزرگ کا سراغ مجھے نہیں ملا جنھوں نے سوز خوانی کے فن میں طوائفوں کے برابر کمال حاصل کیا ہو۔ اور خاندانِ اجتہاد کے علما تو سوز خوانی کے وقت (آخرت کو طوائفوں کے ہاتھ میں چھوڑ کر؟) مجلس سے اٹھ جاتے تھے۔ بھائی، یہ سب کیا ہے؟ ذہن کو زحمت دیے بغیر لکھنا اور لکھنے کے بعد ذہن کو زحمت نہ دینا آپ کو زیب نہیں دیتا۔ لکھنؤ میں باکمال سوز خوانوں کو آخرت پر قبضہ دے دیا جاتا تھا، مندرجۂ بالا انشاپردازانہ فقرے کا اگر اس کے سوا کچھ اور مطلب نکلتا ہو تو براہ کرم مجھ کو (خود یا اپنے ماخذ سے پوچھ کر) بتائیں۔

6۔ آپ کا تائید یافتہ ایک اور انکشاف: لکھنؤ کی بیگموں میں کوئی ایسی نہیں تھی جو ''چھنال'' نہ ہو۔ (ص 9) (آپ کا ماخذ: شوق کی ایک خیالی داستان کا ایک خیالی نسوانی کردار)۔ آپ سے یہ پوچھنے کی ہمت نہیں پڑ رہی ہے کہ خود آپ کا کیا خیال ہے؟

7۔ ہمارے آپ کے محترم بزرگ سرور صاحب طوائف شناسی میں وہ مرتبہ رکھتے ہیں کہ آپ کا سا باعمل محقق طوائفوں کی اداؤں کی پہچان کے لیے ان کی سند پیش کرتا ہے اور شوق کی ہیروئنوں کے

بارے میں سرور صاحب کے اس جملے کو "نہایت بلیغ بات" کہہ کر نقل کرتا ہے:

"مہ جبین میں کم اور مہ لقا میں زیادہ ہمیں طوائف کی جھلک نظر آتی ہے۔" (ص 8)

یہ عجیب بات ہے۔ ایک طرف آپ لکھنؤ میں ہر طرف طوائفوں کی تصویریں دکھا دکھا کر اپنی تحقیقی کمائی بڑھانے میں سرگرم ہیں، دوسری طرف طوائفوں کی گویا اتنی بھی پہچان نہیں رکھتے جتنی سرور صاحب کے سے نستعلیق بزرگ رکھتے ہیں۔ کیا خود آپ شریف عورتوں اور طوائفوں میں تمیز نہیں کر سکتے؟

عجیب تر بات یہ کہ ایک طرف تو آپ معلومات کی فراہمی اور "تمتع زہر گوشہ ای" کی سعی میں یہاں تک سرگرداں ہیں کہ طوائفوں کے معاملے میں بھی سرور صاحب کے سے غیر متوقع ماخذ تک پہنچ جاتے ہیں، اور دوسری طرف آپ کے ماخذوں کی تعداد پانچ سے آگے نہیں بڑھ پاتی اور ابتدا میں جن چند اہم اور آسانی کے ساتھ دکھائی دیے جانے والے ماخذوں کا بھی میں نے ذکر کیا ہے، وہ بھی آپ کو نظر نہیں آتے (وہی "مسٹر ڈالر" والا کمال)۔

8۔ ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں۔ آپ کے اس مضمون کا موضوع دہلوی معاشرہ نہیں تھا لیکن آپ نے اسے بھی لپیٹ میں لے کر لکھنوی معاشرے سے بھی گیا گذرا کر دکھایا۔ لکھنؤ میں جو "لذت اندوزی اور عیش کوشی معاشرے کے نمائندہ طبقے پر چھائی ہوئی تھی" (ص 9)، اس کا تذکرہ کرتے کرتے آپ بیان کے ابتذال پر آتے ہیں اور شوق کی بیمارِ عشق کے کچھ شعروں کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "ان میں ابتذال ہے، کھلا ہوا ابتذال ہے۔ لیکن ایسے شعروں کی تعداد بہت سے بہت چوبیس یا پچیس ہوگی، اس سے زیادہ نہیں۔ ایسی دوسری مثنویوں کے ایسے ہی اشعار کو اگر یکجا کیا جائے، مثلاً اردو ہی میں میر اثر اور مومن کی مثنویوں کے ایسے اشعار کو، تو پھر شوق کا نام اس سلسلے میں سر فہرست نہیں لکھا جا سکے گا، کئی سطر نیچے لکھا جائے گا۔" (ص 10)

اور اس کے بعد یہ بھی لکھتے ہیں:

> "اسی طرح [یعنی اثر اور مومن کی طرح] شوق کی مثنویوں کو بھی ادب کا حصہ اور شوق کو [اثر اور مومن کی طرح] اپنے معاشرے کا ترجمان مانا جائے گا۔ معاشرہ جیسا تھا ترجمانی بھی ویسی ہی ہوگی اور تصویر بھی ویسی ہی بنے گی۔" (ص 10)

Scanned with CamScanner

اور یہ معاشرتی تصویر ان مبتذل شعروں کے آئینے میں بنے گی جن کے مصنف شوق لکھنوی کا نام ابتذال یعنی اپنے معاشرے کی سچی تصویر کشی کرنے کے لحاظ سے اثر دہلوی اور مومن دہلوی کے ناموں سے ''کئی سطر نیچے لکھا جائے گا''، اور اپنے مبتذل کلام کے ذریعے اپنے معاشرے کی تصویر دکھانے والوں میں اثر اور مومن کے نام شوق سے ''کئی سطر اوپر'' لکھے جائیں گے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ لکھنؤ کے معاشرے کو پست اور مبتذل ٹھہرا لینے کے بعد آپ نے دہلی کے معاشرے کو اس سے بھی بدتر ظاہر کرنا کیوں ضروری سمجھا اور اپنی تہذیبی روایات کی ان دو بڑی (اور دونوں مرحوم) علامتوں کے خلاف کون سی در پردہ نفسیاتی گتھی آپ کو ان کا دشمن بنائے ہوئے ہے۔ کیا ذاتی طور پر آپ کو دہلی اور لکھنؤ میں کچھ تلخ تجربے ہوئے ہیں؟ دہلی اور لکھنؤ کی پرانی آویزش میں ملوث لکھنوی جماعت آپ کے اس فیصلے سے خوش ہو کر آپ کو دہلوی معاشرت کا نباض مان سکتی تھی، لیکن میں لکھنؤ کو دہلی کی ضمنی پیداوار مانتا ہوں (یہ تو آپ کے بھی علم میں ہونا چاہیے کہ لکھنؤ کے بیشتر ممتاز گھرانے اصلاً دہلی کے تھے) اور دہلی کا زوال مجھ کو لکھنؤ کی تباہی سے بڑا المیہ معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے اس احساس میں اپنی تہذیبی روایت سے میرے تعلق خاطر (آپ کی رائے میں قدامت پسندی) کو دخل ہو۔ بہر حال میں آپ کی اس نتیجہ گیری سے اتفاق نہیں کر سکتا کہ اثر، مومن اور شوق کی مثنویوں پر ''معاشرہ جیسا، ترجمانی بھی ویسی ہی'' اور ''تصویر بھی ویسی ہی'' کا اطلاق ہوتا ہے اور ''ابتذال، کھلا ہوا ابتذال'' لکھنؤ سے زیادہ دہلی کے معاشرے کی ترجمانی کرتا ہے۔ دہلی اور لکھنؤ کی بہت سی ادبی بضاعت میں سنجیدہ اخلاقی معاشرتی قدروں کی عکاسی ہوئی ہے، لیکن وہ تصویریں آپ کو نظر نہیں آتیں، انھی ''مسٹر ڈالر'' کی طرح۔

9۔ تضاد تحقیق کے لیے زہر قاتل ہے جو محقق کے حافظے اور قوتِ تمیز سے لے کر اس کی محنت اور دیانت تک کو مشکوک کر سکتا ہے۔ آپ کی تحقیقی تحریروں میں یہ تضاد گاہ گاہ نظر آتا ہے، لیکن اس مضمون میں آپ نے تضاد کو صنعت کی حد تک پہنچا دیا ہے۔ کچھ نمونے دیکھیے:

(الف) لکھنؤ کی تہذیب کے بارے میں آپ لکھتے ہیں:

''کم سے کم مدت میں اس کو فروغ حاصل ہو گیا۔'' (ص 6)

''کم سے کم مدت'' کا مطلب ہوا تقریباً اچانک (میں آپ کی اس رائے سے متفق ہوں اور سرور پر اپنی

کتاب میں لکھنوی تہذیب کے ''یک لخت عروج'' کا ذکر کر چکا ہوں۔ص 44) لیکن آپ اسی تقریباً اچانک فروغ پا جانے والی تہذیب کے تشکیلی عناصر کی بحث میں یہ بھی لکھ دیتے ہیں:

''یہ ایسی بات نہیں تھی جو اچانک واقع ہوئی ہو۔'' (ص 9)

(ب) آپ لکھتے ہیں کہ لکھنؤ کی تہذیب اور معاشرے میں:

''ظاہر کب کچھ تھا، باطن خالی تھا۔'' (ص 6)

اپنے مادہ پرستانہ عقائد کے ساتھ آپ کو ظاہر اور باطن کی بحث سے دور رہنا چاہیے تھا۔ اس درخواست پر آپ کان نہیں دھریں گے کہ باطن کے خالی ہونے اور خالی نہ ہونے کی دو ایک مثالیں عنایت کیجیے۔ اس حقیقت پر بھی غور کرنے میں آپ کی طبیعت گھبرائے گی کہ باطن کا خالی ہونا انسان کی حد تک محالات سے ہے، اس لیے اس کی فکر چھوڑیے اور اپنے بیان کا تضاد دیکھیے کہ لکھنوی تہذیب میں باطن کو خالی کر دینے کے ڈیڑھ سطر بعد آپ لکھتے ہیں:

''ہاں، ایک چیز ضرور ایسی ہے جس نے دیرپا اثرات پیدا کیے، اور وہ ہے مذہبیت کی طاقت اور روایت، جس کا تعلق حقیقی طور پر باطن سے ہوتا ہے۔ مذہب کے اثرات افراد کے احساس کا جز ہوتے ہیں اور پورے گروہ کی زندگی پر حاوی رہتے ہیں۔ عمل کتنا ہی کم ہو، عقیدہ ذہن کی تہوں میں پیوست رہا کرتا ہے۔'' (ص 6)

''دیرپا اثرات''، ''مذہبیت کی طاقتور روایت''، ''حقیقی طور پر باطن'' سے تعلق، ''احساس کا جز''، ''عقیدہ'' جو ''ذہن کی تہوں میں پیوست رہا کرتا ہے'' وغیرہ کے معنی تو میری سمجھ میں آتے ہیں، لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سب کے ہوتے ہوئے ''ظاہر سب کچھ تھا، باطن خالی تھا'' کا کیا مطلب ہوا۔

(ج) ''خواہش زدہ تحقیق'' کا پیدا کیا ہوا ایک اور تضاد۔ آپ لکھتے ہیں:

''یہ عجیب بات تھی کہ [لکھنؤ میں] ایک طرف تو عیش طلبی اور لذت کوشی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی، اور دوسری طرف عزاداری کا عروج تھا، اور اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس سے معاشرے کا حسن کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ ان عناصر نے بھی تضاد اور ثنویت، یعنی ڈہرے پن، کو معاشرت کا نہایت حسین جز بنا دینے میں بہت کامیابی حاصل کی۔'' (ص 7)

Scanned with CamScanner

آپ کے مضمون کے سیاق و سباق میں جتنا جتنا غور کرتا ہوں اتنی اتنی ان جملوں اور مضمون کی معمائیت باری باری بڑھتی جاتی ہے۔ آپ بھی غور کر کے دیکھیے۔ لیکن اس سے قطع نظر، یہاں گفتگو تضاد کی ہے۔ پڑھنے والوں کی سہولت کی خاطر آپ نے ''ثنویت'' کا ترجمہ بھی کر دیا ہے (''یعنی دُہرے پن کو'')، لیکن اگلے صفحے پر یہ فیصلہ بھی سنایا ہے:

''معاشرے میں نفاست اور صلابت کے عدم توازن نے یک رُخا پن پیدا کر دیا تھا۔'' (ص 8)

کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ منشائے مصنف کیا ہے۔ کیا آپ نے دُہرے پن اور یک رُخے پن سے ایک ہی معنی مراد لیے ہیں؟

(د) تضاد کو صنعت بنا دینے کی بات میں نے یوں ہی نہیں کہہ دی تھی۔ آپ لکھتے ہیں:

''حیدری بیگم نے واجد علی شاہ سے جب یہ کہا تھا کہ [کچھ دوسری عورتوں کے بھی مردوں سے ناجائز تعلقات ہیں] تو ایک ایسی حقیقت کا اظہار کیا تھا جس سے بہت سے لوگ باخبر تھے۔ اسی طرح جب نواب مرزا شوق اپنی مثنوی فریب عشق میں یہ کہتے ہیں [کہ بیگموں میں کون ہے جو چھنال نہیں] تو [انھوں نے] معاشرے کی ایک ایسی تلخ حقیقت کو بیان کیا تھا جس سے لوگ بے خبر نہیں تھے، لیکن اس کو بیان کرنے کی یا تو جرأت باقی نہیں رہی تھی یا پھر وہ معاشرے کا ایسا حصہ بن چکی تھی کہ اجنبیت اور اعتراض کی گنجائشیں گویا ختم ہو چکی تھیں۔'' (ص 9-8)

آپ کو بیان کا تضاد نظر آیا؟ آپ کا کہنا ہے کہ اس معاشرے میں عورتوں کا غیر مردوں سے تعلقات رکھنا:

(i) اتنا بڑا عیب سمجھا جاتا تھا کہ لوگ اس کو زبان پر لانے کی جرأت نہیں رکھتے تھے۔ یا

(ii) کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا تھا کہ اس کا ذکر یا اس پر اعتراض کیا جائے۔

عام تضاد کے لیے ''یک بام و دو ہوا'' کی ضرب المثل استعمال ہوتی ہے لیکن آپ کا یہ بیان ''دو بام و یک ہوا'' کی عمدہ مثال ہے اور یہ تضاد کو صنعت بنا دینے کی بھی عمدہ مثال ہے۔

10۔ مذہب کی گفتگو میں آپ نے کئی جگہ اپنے علم اور فکر کے دائرے سے باہر قدم رکھا ہے۔

Scanned with CamScanner

مثلاً آپ لکھنؤ میں ایسی بہت سی رسمیں ''پیدا'' ہو جانے کا ذکر چھیڑتے ہیں جن کا حقیقتاً مذہب سے لازمی تعلق نہیں تھا، اور اس کو صرف لکھنؤ سے مخصوص قرار دیتے ہیں۔ مذہب کے حوالے سے ایسی رسموں کا رواج پا جانا جن کا ''حقیقتاً'' مذہب سے ''لازمی'' تعلق نہ ہو مذہبیات، عمرانیات کا (اور شاید کچھ اور علوم کا بھی) ایسا موضوع ہے جس پر آپ کو اظہار خیال نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس عالم گیر مظہر کو لکھنؤ سے مخصوص کر دینا تو ایسی بات ہے کہ اس معاملے میں آپ اپنی بے علمی کا حلفیہ اعتراف کریں تو بھی اسے آپ کی کسرِ نفسی پر محمول کیا جائے گا۔ کیا آپ کو واقعی زیادہ نہ سہی، صرف ہندوستان کے مختلف خطوں، فرقوں اور مسلکوں کی ان رسموں کا پتا نہیں جن کا ''حقیقتاً'' مذہب سے ''لازمی'' تعلق نہیں ہے، یا یہ بھی وہی ''مسٹر ڈالر'' کی معجز نمائی ہے؟

11۔ آپ لکھنؤ کی مذہبیت کے تمام مظاہر کو بلا استثنا ''خارجی زندگی سے قریب تر'' بتاتے ہیں۔ اس سے کیا مراد ہے؟ اور ان ''قریب تر'' مظاہر کے مقابل ''دور تر'' مظاہر کون سے ہوں گے اور ان کی اچھائی برائی کی پہچان اور معیار کیا ہوں گے؟ اس کی وضاحت کی درخواست پر بھی آپ ''باطن خالی'' کی وضاحت کی درخواست کی طرح کان نہیں دھریں گے، لیکن اس پر غور کیجیے کہ لکھنؤ میں مختلف مذہبی مسالک کی دینی تصنیفوں، مذہبی سرگرمیوں، صوفیاے کرام کے افادوں کا صحیح شمار تک ممکن نہیں۔ صوفیوں کو تو خصوصیت کے ساتھ ''اہل باطن'' اور ''اہل عرفان'' کہا جاتا ہے۔ آپ نے ان سارے مظاہر کے بارے میں فیصلہ کر دیا کہ ''عرفان سے زیادہ اظہار ان کا اہم جز تھا'' (ص 7)، اور اس طرح ان مظاہر کو کھوکھلا، نمائشی اور گویا زبانی جمع خرچ ٹھہرا دیا۔

12۔ مخاصمانہ جذبات اور پیش حکمی کے تحت کی جانے والی خواہش زدہ تحقیق کیا کیا کرشمے دکھا سکتی ہے، اس کے کچھ نمونے آپ کے سامنے پیش ہوے۔ لیکن ایک کرشمہ آپ کے مضمون میں ایسا ہے جو بہتوں کی، اور اگر غور کیجیے تو خود آپ کی بھی، سخت دل آزاری کا باعث ہو سکتا ہے۔ پرانے زمانے کے ایک شہر کی عورتوں کو بدکار ثابت کرنے کی خواہش سے مغلوب ہو کر آپ نے اس زمان و مکان سے آگے قدم بڑھا دیے اور خود اپنے زمان و مکان تک چلے آئے، اور شرر کا یہ قولِ فیصل کسی اختلافی نوٹ یا مستثنیات کے امکان کو نظر انداز کرتے ہوے نقل کر گذرے:

''رہے عورتوں کے اخلاق و عادات، اس بارے میں ہمارا عام دعویٰ ہے کہ جن لوگوں کو

زنا کاری کا شوق ہو، اُن کی عورتیں پارسا نہیں ہو سکتیں۔"
اور یہ دعویٰ کسی مخصوص جگہ اور زمانے کے لیے نہیں، بلکہ "عام" ہے۔ آپ نے کمال بے قیدی کے ساتھ اس کو بھی اپنے مضمون کے استناد اور استشہاد میں استعمال کر لیا اور شرر کے ساتھ "اقتدیت بھذا الامام" والا رویہ یہاں بھی ترک نہیں کیا۔ کاش اس اقتباس کو اپنے مطلب کے لیے استعمال کرنے سے پہلے آپ اپنے ہم راز دوستوں میں بیٹھ کر اس کے غوامض اور اس کی دور رس رکاکت پر غور کر لیتے۔

آپ نے گذشتہ زمانے کے، ایک شہر میں محدود، معاشرے سے تجاوز کر کے اور جغرافیائی حدوں کو توڑ کر خود اپنے عہد کے معاشرے تک کو لے ڈالا۔ بھائی، خدا کے لیے مردوں کی بدکاریوں کی سزا (یا دفاع؟) میں خانہ دار عورتوں کے دامن کو اس طرح آلودہ نہ کیجیے۔

اب اس کے آگے آپ کے مضمون کی کرشمہ کاریوں کی نشاندہی کیا کروں۔ از راہ کرم میرے معروضات کا جلد از جلد جواب دے کر میری تشفی کیجیے، اور یہ بھی بتائیے کہ کیا یہ مضمون آپ کی مرتبہ مثنویاتِ شوق میں شامل ہوگا؟ اور اسی صورت میں؟

•

آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ آج کل امریکا اور دوسرے مغربی ملکوں میں اودھ اور لکھنؤ پر تحقیق کا بازار گرم ہے اور لکھنوی معاشرے کے الگ الگ مظاہر (طوائفوں سے لے کر علمائے مذہب تک) پر انگریزی میں کتابوں کی خاصی تعداد چھپ چکی ہے۔ اس موضوع پر کام کرنے والے اہل تحقیق لکھنؤ بھی آتے رہتے ہیں اور ان میں بعض بعض سے میری بھی ملاقات ہو جاتی ہے اور میں اُن سے یہ ضرور پوچھتا ہوں کہ آپ لوگوں کو لکھنؤ کی تہذیب و ثقافت اور معاشرے سے اتنی دلچسپی کیوں پیدا ہو گئی ہے؟ قریب قریب سب کا جواب یہی ہوتا ہے کہ یہ دنیا کی آخری "compact" تہذیب تھی، اور قریب العہد ہونے کی وجہ سے اس کے آثار اور عناصر (جن کو آپ ریت پر بننے والے نقش بتاتے ہیں، ص 6) اب بھی کسی حد تک موجود ہیں، اور یہ بھی کہ انگریزوں کے ہندوستانی وفاداروں نے اپنے سفید آقاؤں کو خوش کرنے کی خواہش سے مغلوب ہو کر اپنی ہی تہذیبی، معاشرتی اور تاریخی تصویروں کو جی بھر کر مسخ کیا ہے، درحالے کہ خود انگریزوں نے ان موضوعات پر اپنی تصنیفوں میں قدرے محتاط، اور

Scanned with CamScanner

بعض نے تو منصفانہ رویہ رکھا ہے۔ پھر معافی مانگ کر کبھی کبھی یہ بھی کہہ گذرتے ہیں کہ ایسے "wretch" (اس لفظ کے معنی نہ پوچھیے) آپ ہی لوگوں میں پائے جاتے ہیں جو انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہونے کے بعد بھی اپنی تہذیبی روایت کی مفروضہ گھناؤنی تصویریں پیش کرتے ہیں، اس لیے ہم مجبور ہوئے کہ اپنے طور پر لکھنؤ کی تہذیبی روایات کا مطالعہ کریں۔

اپنے موضوع سے متعلق مواد تک ان مغربیوں کی حیرت خیز رسائی کا آپ کو علم نہیں، مجھے کچھ اندازہ ہے، اس لیے کہ میری نظر سے کبھی کبھار ان کی انگریزی کتابیں گذر جاتی ہیں۔ لکھنوی معاشرے پر آپ کے سے نامور محقق کا یہ مضمون وہ بڑی امیدوں کے ساتھ پڑھیں گے۔ آپ نے کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر یہ سب کیا اور کیوں لکھ دیا، میری سمجھ میں نہیں آتا۔ سفید آقا رہے نہیں جن کی خوشنودی آپ کو مطلوب ہو۔ کچھ کالے آقا ضرور خوش ہوں گے، لیکن میں آپ کے مزاج سے واقف ہوں اور آپ کی طرف سے دعویٰ کر سکتا ہوں کہ ان کی خوشنودی حاصل کرنا آپ کا بنیادی مقصد نہیں، اگرچہ وہ آپ کو حاصل ہو جائے گی۔ لیکن اس سوال کا میرے پاس جواب نہیں ہے کہ اپنی تحقیق کے دامن کو اپنی غیر تحقیقی جذباتیت اور خواہش زدگی کی سزا (یا دفاع؟) میں اس طرح آلودہ کرنے کے پیچھے آپ کا کیا مقصد تھا۔ ظاہر ہے یہ مقصد تو قطعی نہیں تھا کہ اپنے موضوع کا قدرے وسعت، گہرائی اور دیانت داری سے مطالعہ کیا جائے، جیسا کہ آپ کے کل ماخذوں کی اس فہرست سے ظاہر ہوتا ہے جو شروع میں درج کر چکا ہوں اور آپ کے حافظے پر بھروسا نہ کرتے ہوئے آخر میں پھر درج کرتا ہوں:

1۔ نجم الغنی — تاریخ اودھ
2۔ شرر — گذشتہ لکھنؤ
3۔ شوق — مثنویاں
4۔ پروفیسر آل احمد سرور
5۔ پروفیسر خورشید الاسلام

آپ کا
نیر مسعود

(جمعہ یکم مئی 1998ء کو بذریعۂ رجسٹری شاہجہاں پور بھیجا گیا۔)

❁

ضمیمہ

[مندرجۂ بالا مضمون خط کی صورت میں رسالہ ایوانِ اردو، دہلی (جولائی 1998) میں شائع ہوا تھا۔ اس کا عنوان ''بہ نام رشید حسن خاں'' (بہ حوالۂ مضمون ''مثنویاتِ شوق، لکھنوی معاشرت کے آئینے'') تھا۔

اب اس کو بدل کر ''خواہش زدہ تحقیق'' (بہ نام رشید حسن خاں) کر دیا گیا ہے۔

رشید حسن خاں کا مندرجۂ ذیل خط میرے مضمون کے چھپنے سے پہلے لکھا گیا تھا (میں نے انھیں اپنے مضمون کی نقل بھیج دی تھی)۔ اگرچہ انھوں نے اپنے خط کی عام اشاعت کی اجازت نہیں دی تھی، لیکن زہرِ عشق پر ان کا مضمون خلافِ وعدہ ان کی کتاب میں من وعن شامل ہوا ہے، اس لیے میں نے اس خط کو بھی اپنے نام ان کے خطوں (سہ ماہی اردو ادب، نئی دہلی، جنوری-مارچ 2007) میں شامل کر لیا، تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ خاں صاحب نے اس مضمون کو از سرِ نو لکھنے کا وعدہ کیا تھا۔

اس وقت تک مجھ کو صحیح اندازہ نہیں تھا کہ رشید حسن خاں اپنے اوپر اعتراضوں کو برداشت نہیں کر سکتے۔ میرے نام اس خط میں ان کا لہجہ بہت لجاجت آمیز ہے اور انھوں نے میرے کسی اعتراض کا جواب نہیں دیا لیکن اپنے حلقۂ احباب میں کچھ ایسی باتیں کہیں جن سے مجھے سخت تکلیف پہنچی، لیکن اس وقت تک وہ انتقال کر چکے تھے اس لیے میں ان سے شکایت بھی نہیں کر سکا۔ اب ان کا خط اس ضمیمے کے طور پر شامل کر رہا ہوں تاکہ اصل صورتِ حال واضح ہو جائے۔ (نیّر مسعود)]

شاہ جہان پور

2 مئی 1998

برادرم!

ابھی آپ کے دو خط ملے۔ شکریہ۔

ضروری باتیں: (1) نوری نام کے شعرا سے تو واقفیت تھی، یہ معلوم کرنا تھا کہ صاحبِ دیوان کون ہے؟ میر حسن نے نوری کے دیوان کا ذکر کیا ہے۔ اردو کے دونوں شاعر بس دو ایک شعروں کے مالک ہیں، ان کے صاحبِ دیوان ہونے کا کسی کو علم نہیں۔ فارسی میں کوئی صاحبِ دیوان ہے؟ (ویسے میر صاحب کی مراد اردو والوں ہی سے ہوگی۔)

(2) نور باغ کے لیے بس یہی لکھا جاتا ہے کہ ہوگا ضرور مگر احوال معلوم نہیں۔ (3) رہے کالے پیادے، تو حبشی دستے والی بات لگتی ہوئی ہے۔ کیا یہ بات آپ کے حوالے سے لکھی جا سکتی ہے؟ بر لاس مرزا کا حوالہ میں نہیں دینا چاہتا۔ انھوں نے تو بہت کچھ لکھا ہے۔ کراچی میں ان کی ایک کتاب دیکھی تھی۔ اب اس کے محتویات سب ذہن میں بھی نہیں۔

ایک نئی بات: بے نظیر کی شادی دھوم سے ہوئی، اُس نے پھر ویسی ہی دھوم دھام سے وزیرزادی کی شادی کی:

دقیقہ نہ چھوڑا کسی بات میں — برابر رکھی چُہل دن رات میں

کیا لکھنؤ میں ''چُہل برابر رکھنا'' کبھی مستعمل رہا ہے؟ میں نے کہیں نہیں دیکھا۔ چہل کے ایک معنی چہل پہل بھی لکھے گئے ہیں ایک لغت میں حوالے کے بغیر۔ میری غرض یہاں اس کے محاورہ ہونے یا نہ ہونے سے ہے۔

یہ باتیں یہاں ختم ہوئیں۔

دیکھیے بھائی! میرا مقصد کسی کی دل آزاری نہیں تھا، ہو بھی نہیں سکتا۔ مجھے بے حد افسوس ہے کہ آپ کے دل کو تکلیف پہنچی۔ مجھے اگر اس کا ذرا بھی احتمال ہوتا تو یہ تحریر ہی وجود میں نہ آتی۔ میں اپنے مخلصین کے دل کو تکلیف پہنچانا گناہ سمجھتا ہوں۔ میں یہ مانتا ہوں کہ مجھے احتیاط سے کام لینا چاہیے تھا۔ میں نہیں چاہتا کہ اب مزید غیر مناسب باتیں ہوں اور بحث بڑھے۔ یہ کسی طرح مناسب نہیں ہوگا۔ میں نے دہلی خط ابھی لکھا ہے۔ میں جون میں وہاں جاؤں گا اور اس حصے کو از سرِ نو لکھوں گا، تا کہ شکایت کا کوئی پہلو نہ رہے اور احتیاط کے تقاضوں کی پاسداری بھی ہو جائے۔ آپ کے خط سے یہ بڑا فائدہ ہوا ہے۔ اور اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ بروقت بات سامنے آ گئی اور یہ

Scanned with CamScanner

آسانی اسے بنایا جاسکتا ہے۔ میں غیر ضروری بحثوں میں پڑنا ہی نہیں چاہتا کہ یہ علمی کاموں کے لیے ناسازگار ہوا کرتا ہے۔ آپ اپنے احباب سے اس خط کے حوالے سے یہ سب باتیں کہہ سکتے ہیں؛ البتہ خط یہ صرف آپ کے لیے ہے۔ اب آپ اس پر غور کر لیجیے کہ جب اُسی تحریر کو از سرِ نو لکھا جانا ہے تو کیا یہ مناسب ہوگا کہ خواہ مخواہ بات بڑھے اور یار لوگ لطف لیں اور فضول باتوں سے ان کی آرائش کی جائے۔ ایسی باتیں، بہت جلد ضمنیات کا شکار ہو جایا کرتی ہیں۔ اس بنا پر کیا مناسب نہیں ہوگا کہ اب وہ خط نہ چھپے۔ اس کا لہجہ بھی خاصا غیر مناسب ہے۔ آپ نے مجھے کالے آقاؤں کا طعنہ دیا ہے جب کہ آپ جانتے ہیں کہ مجھے کسی سے کچھ لینا دینا نہیں۔ خیر، حسابِ دوستاں در دل۔ اس پر پھر کبھی بات ہوگی تنہائی میں بیٹھ کر۔ میں نہیں چاہتا کہ اغیار اس بحث میں شریک ہوں یا لطف لیں۔ آپ اس پہلو پر غور کر لیجیے۔ مخمور کو بہ آسانی دوسرا خط لکھ کر آپ منع کر سکتے ہیں۔ وہ بھی نہیں چاہیں گے کہ خواہ مخواہ کی اختلافی بحث کا وہ نشانہ بنیں۔ تحریر بہ ہر طور انھی نے چھاپی ہے۔ اگر اب تک آپ کا غصہ کچھ کم ہو گیا ہو تو خوب ہو۔ میری تجویز آپ مان ہی لیجیے۔ ہاں بھائی، یہ خط میرے آپ کے درمیان ہے اور قطعی طور پر ذاتی ہے۔ اس کے بس ضروری اجزا کا آپ بلا تکلف حوالہ دے سکتے ہیں، مگر خط آپ کی نظروں کے لیے ہے۔

آپ کے خط کا انتظار کروں گا۔

ہاں، جون تو مجھے بھی راس نہیں آئے گا، بمبئی جانا ہے۔ اس لیے جو ہونا ہے وہاں مئی ہی میں ہو جائے تو اچھا ہے۔ ورنہ پھر بمبئی سے آنا پڑے گا اور اس میں بہت دقت ہوگی۔ صائمہ بٹیا سے کہیے کہ کھانا بمبئی سے واپسی پر کھاؤں گا، پھر زیادہ بھی کھا سکوں گا اور بد پرہیزی بھی کر لوں گا۔ اس بار تو بس صبح آ کر شام ہو واپسی ہوگی، رکوں گا نہیں۔ یہاں بھی بعض معاملات ہیں۔ آپ سے جلسے میں تو ملاقات ہوگی ہی، میں اسٹیشن سے سیدھا جلسے میں آؤں گا اور وہاں سے بس اڈے پر تا کہ جلد تر گھر پہنچ جاؤں۔ مثنوی کی مطبوعہ اشاعتیں بھی پھر دیکھوں گا، اس بار نہیں، غالباً بمبئی سے واپسی پر۔

خط فوراً لکھیے، اگر چہ عشرے کا زمانہ ہے، پھر بھی۔

رشید حسن خاں

❊❊

فسانۂ عجائب مرتبہ رشید حسن خاں

آخر فسانۂ عجائب مرتبہ رشید حسن خاں منظرِ عام پر آ گئی۔ اس ایڈیشن کی تکمیل اور اشاعت کے درمیان کئی برس کا فاصلہ ہے۔ کچھ یہی صورت اصل کتاب فسانۂ عجائب کے ساتھ بھی پیش آئی تھی جس کا ذکر رجب علی بیگ سرور اس کے پہلے ایڈیشن (1259ھ) کی نثرِ خاتمہ میں اس طرح شروع کرتے ہیں:

''برسوں یہ فسانہ کساد بازاری زمانہ سے تہ رہا، مشہور نہ ہوا''۔

رشید حسن خاں کا یہ ایڈیشن بھی برسوں تہ رہا، لیکن اس کی شہرت کا آغاز اس کی ترتیب کے آغاز کے ساتھ ہی ہو گیا تھا۔ اردو تحقیق کی عام روش سے رشید حسن خاں کو سخت شکایتیں ہیں اور انھوں نے بعض محققوں کے مرتب کیے ہوئے کلاسیکی متون کی بے دردی سے چیر پھاڑ بھی کی ہے، اس لیے یہ خبر خاصی دلچسپی کے ساتھ سنی گئی تھی کہ اب رشید حسن خاں خود ایک کلاسیکی متن اور وہ بھی فسانۂ عجائب کا سا خطرناک متن مرتب کر رہے ہیں۔ یہ تجسس پیدا ہونا فطری تھا کہ رشید حسن خاں متن کی تحقیقی تدوین کے جس معیار کا دوسروں سے مطالبہ کرتے ہیں اسے خود کہاں تک قائم رکھ پاتے ہیں۔ اس ایڈیشن کی اشاعت کے بعد یہ بات بلا تامل کہی جا سکتی ہے کہ انھوں نے اپنی تنقیدی اور احتسابی تحریروں میں تدوینِ متن کے جس مثالی نمونے کا تصور پیش کیا تھا، عملاً اس سے بھی کچھ بہتر نمونہ پیش کر دیا ہے اور اس بات کا اعتراف کرنے میں بھی تامل نہ ہونا چاہیے کہ ابھی تک اردو نثر کا کوئی متن اس شان کے ساتھ مرتب نہیں ہوا تھا۔

تدوین کا یہ کام رشید حسن خان نے 1978 کے قریب شروع کیا تھا۔ اس میں سب سے سخت مرحلہ فسانۂ عجائب کے متن کی صحیح قرأت کا تھا۔ ایک بار انھوں نے مجھے لکھا تھا:

"سچی بات تو یہ ہے کہ اس متن نے مجھے تھکا مارا ہے۔ اس قدر صبر آزما کام سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ معلوم نہیں یار لوگوں نے کس طرح اب تک اسے نپٹایا ہے اور اساتذہ نے پڑھایا ہے"۔

اور یہ بھی اطلاع دی:

"پرسوں دو گھنٹے ایک جملے کی نذر ہوگئے۔ جی چاہتا ہے کہ آپ کو بھی اس مسرت میں شریک کروں جو حل کرنے کے بعد مجھے حاصل ہوئی تھی"۔

اعراب اور رموزِ اوقاف کا التزام جو پڑھنے والے کے لیے سہولت مہیا کرتا ہے، مرتب کے لیے مشکلوں اور ذمہ داریوں کے پہاڑ کھڑے کر دیتا ہے۔ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک مرتب کے ذہن میں متن کے ہر لفظ کا تلفظ مع معنی اور ہر جملے کی ساخت مع مفہوم آئینہ نہ ہو۔ اس کے لیے اس کو مصنف کے ذاتی اسلوب اور اس کے عہد اور علاقے کی زبان کی عمومی خصوصیات سے اچھی طرح واقف ہونا چاہیے۔ رشید حسن خاں نے اس سلسلے میں جو کوشش کی ہے اس کا اندازہ ان کے تیار کیے ہوئے متن کے کسی بھی صفحے کو توجہ سے پڑھ کر کیا جا سکتا ہے۔ اب یہ متن اعراب و اوقاف سے مزین ہو کر اپنی شرح آپ کرتا ہوا چلتا ہے اور بجائے خود ایک مکمل تحقیقی کام ہے۔ لیکن اسی کے برابر کا یا شاید اس سے بھی بڑا کارنامہ وہ ملحقات (مقدمے، ضمیمے، فرہنگ) ہیں جن کا مجموعی حجم فسانۂ عجائب کے متن سے زیادہ ہے۔ مقدمہ کئی مباحث پر مشتمل ہے اور اس کے احاطے کا اندازہ ان مباحث کے عنوانات سے ہو سکتا ہے جو حسب ذیل ہیں:

(سرور کی) ولادت، وفات، مدفن، تعلیم اور مختلف فنون سے واقفیت۔

(فسانۂ عجائب کی) وجہِ تصنیف اور زمانۂ تصنیف، نوازش اور اصلاح۔ "بیانِ لکھنؤ" کے اختلافات، آسان کہنے کی فرمائش۔ میر امن، باغ و بہار۔ ضمنی داستانیں۔ بندر کی تقریر۔ زبان و بیان۔ خطی نسخے۔ مطبوعہ نسخے۔ بنیادی متن۔

(مرتب کا) طریقِ کار۔ علامات، رموزِ اوقاف...

فسانۂ عجائب کا سببِ تالیف، زمانۂ تالیف، اس کے مختلف ایڈیشنوں کی صورتِ حال، یہ سب تحقیق کے بہت الجھے ہوئے مسائل تھے۔ رجب علی بیگ سرور نے فسانۂ عجائب کے حصے

Scanned with CamScanner

مختلف زمانوں میں لکھے اور کتاب مکمل کرنے کے بعد بھی اس میں ردوبدل اور حذف واضافہ کرتے رہے۔ ان کے ایک حریف سخن دہلوی نے طنزاً لکھا تھا کہ "سرور لکھنوی نے اٹھارہ مرتبہ فسانۂ عجائب کو درست کیا" اور یہ سلسلہ 1240ھ سے 1280ھ تک چلتا رہا۔ اس طرح چالیس سال تک سرور کتاب میں مداخلت کرتے رہے۔ رشید حسن خاں نے فسانۂ عجائب کے سب اہم ایڈیشنوں کو بار بار پڑھ کر اور ان کا باہم لفظ بہ لفظ مقابلہ کر کے ان مداخلتوں کی روداد مرتب کی ہے۔ یہ محال کی حد تک مشکل کام تھا اور رشید حسن خاں کے سوا شاید کوئی اور اس کا بیڑا اٹھانے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔

مصنف کے حالاتِ زندگی کی تحقیق اور اس کی سوانح نگاری متن کتاب کے مرتب کی ذمہ داری نہیں ہوتی، لیکن مصنف کے جن حالات کا ربط اس کی تصنیف سے ہوتا ہے ان پر نظر کرنا ضروری ہے۔ رشید حسن خاں نے اس اصول کا لحاظ رکھا ہے۔ انھوں نے سرور کے عام حالات زندگی کا مختصر بیان کیا ہے لیکن فسانۂ عجائب کے محرکِ اول کی شخصیت، سرور اور نوازش کی جلاوطنی کی علت اور اس سلسلے میں لکھنؤ کے محلّہ منصور نگر کی اہمیت پر بعض قرائن کی روشنی میں کچھ اہم امکانات کی نشان دہی کی ہے۔ یہ امکانات جن عجیب انکشافات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں ان کا کوئی حتمی ثبوت دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے رشید حسن خاں نے اپنے اخذ کیے ہوئے نتائج کو قیاس آرائی کی حد میں رکھا ہے، لیکن اگر سرور اور نوازش کے حالات کی مزید تحقیق کی جائے تو عجب نہیں کہ یہ قیاسات حقیقت بن کر سامنے آ جائیں۔

متن کتاب کے بعد ضمیمے آتے ہیں۔ پہلے ضمیمے "نثر ہائے خاتمۂ کتاب" میں وہ سب عبارتیں درج کر دی گئی ہیں جو سرور نے فسانۂ عجائب کے مختلف ایڈیشنوں کے آخر میں لکھی ہیں۔ ان عبارتوں سے فسانۂ عجائب کی تصنیف اور اشاعت کی تاریخ مرتب ہوتی ہے۔

دوسرا ضمیمہ "تشریحات" کا ہے۔ فسانۂ عجائب کے بہت سے لفظوں اور فقروں کو کئی طرح پڑھا جا سکتا ہے۔ رشید حسن خاں نے ان مختلف قرأتوں کی وضاحت کے ساتھ اپنی ترجیحی قرأت کا جواز پیش کیا ہے۔ بہت سے لفظوں اور فقروں کے مفاہیم تشریح طلب ہیں، اس ضمیمے میں وہ تشریحیں بھی ہیں۔ بہت سے لفظوں کے تلفظ و املا اور تذکیر و تانیث کے تعین میں بحث طلب امور پر

روشنی ڈالی گئی ہے۔

تیسرے ضمیمے ''انتسابِ اشعار'' میں ان شعروں کی تحقیق ہے جو سرور نے فسانۂ عجائب میں جا بجا درج کیے ہیں۔ ان شعروں کے اندراج کے ساتھ سرور نے شاعر کا حوالہ کہیں دیا ہے، کہیں نہیں دیا ہے، کہیں غلط دیا ہے، بعض شعروں میں ضرورتاً اور بعض میں سہواً کچھ تبدیلی کر دی ہے۔ رشید حسن خاں نے ان شعروں کی صحیح قرأت اور ان کے مصنفوں کا تعین کیا ہے۔ یہ کتنا جاں کاہ کام تھا اس کا اندازہ رشید حسن خاں کے سوا شاید کسی اور کو نہیں ہو سکتا۔

چوتھا ضمیمہ: ''اشخاص، مقامات، عمارتیں''۔ سرور کے دیباچہ کتاب میں جو اسمائے خاص آئے ہیں ان کے متعلق معلومات فراہم کرنا بہت ضروری مگر بہت مشکل کام تھا۔ رشید حسن خاں نے حسبِ توقع یہ کام بھی بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔

پانچویں ضمیمے ''تلفظ اور املا'' اور چھٹے ضمیمے ''الفاظ اور طریق استعمال'' کا تعلق رشید حسن خاں کے خاص اور پسندیدہ میدان سے ہے۔ ان ضمیموں کے تحت انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کے متعلق وہ بجا طور پر ''مستند ہے میرا فرمایا ہوا'' کہہ سکتے ہیں اور اگرچہ ان ضمیموں کا تعلق اصلاً فسانۂ عجائب کے متن سے ہے لیکن ان کا فائدہ کلاسیکی اردو نثر کے بہت سے دوسرے متون کو بھی پہنچے گا۔

ساتواں ضمیمہ ''اختلافِ نسخ'' کا ہے۔ یہ پچاسی (85) صفحوں پر مشتمل مکمل کام تھا مگر کتاب کی بڑھتی ہوئی ضخامت کے پیش نظر اس میں صرف وہ چودہ صفحے شامل ہیں جن میں دیباچہ کتاب کے اختلافاتِ نسخ دیے گئے ہیں اور متنِ کتاب کے اختلافات روک لیے گئے ہیں۔ تدوینِ متن کے ایک بہت ضروری عنصر سے کتاب کا عاری رہ جانا جتنا افسوسناک ہے اس سے زیادہ افسوسناک یہ بات ہے کہ اس نقصان کو محض کتاب کی ضخامت ذرا کم رکھنے کے لیے گوارا کرنا پڑتا ہے۔ امید ہے کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں، جس کی نوبت خدا کرے جلد آئے، یہ کمی پوری کر دی جائے گی۔

فرہنگ کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصے میں عام الفاظ ہیں، دوسرے میں عربی عبارتوں اور تیسرے میں فارسی شعروں اور فقروں کے معنی دیے گئے ہیں۔

کتاب کے مشتملات کا یہ تعارف اس لیے پیش کیا گیا کہ پڑھنے والوں کو رشید حسن خاں کے طریق کار اور تدوینِ متن کے اصول و آداب کا علم ہو جائے۔ اس علم کی عملی تربیت کے لیے فسانۂ

Scanned with CamScanner

عجائب مرتبۂ رشید حسن خاں کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس ایڈیشن کا مقصد پڑھنے والوں، خصوصاً طالب علموں کے لیے فسانۂ عجائب کے مطالعے کو خوشگوار اور آسان بنانا ہے، لیکن یہ طالب علموں سے بھی زیادہ اردو کے محققوں، استادوں اور نقادوں کے لیے مفید ہے۔ محققوں کو اُسے تحقیق کی درسی کتاب کی طرح پڑھنا چاہیے، اساتذہ کو یہ ایڈیشن ذہین اور متجسس طالب علموں کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچا سکتا ہے اور نقاد اس ایڈیشن کو پیش نظر رکھ کر صحیح معنوں میں فسانۂ عجائب کا تنقیدی مطالعہ کر سکتے ہیں۔

اس ایڈیشن کے انتساب کا بھی ذکر ضروری ہے۔ رشید حسن خاں سے اس کی امید تو خیر کوئی بھی نہیں کر سکتا کہ وہ اپنی کسی کتاب کو کسی صاحبِ اقتدار شخصیت کے نام معنون کریں گے، البتہ اس مہتم بالشان تحقیقی کارنامے کا انتساب کسی بڑے محقق کے نام ضرور متوقع تھا، لیکن اس کے انتساب کی عبارت یہ ہے:

"لکھنؤ کے ایک فدائی جناب صباح الدین عمر کی نذر"۔

صباح الدین عمر صاحب ماہنامہ نیا دور، لکھنؤ، کے سابق مدیر، اتر پردیش اردو اکادمی کے بنیاد گزار اور سابق سکریٹری اور لکھنؤ کی معروف شخصیت ہیں، لیکن تحقیق کی دنیا سے الگ ہیں۔ رشید حسن خاں کی کتاب موصول ہونے کے بعد انھوں نے خاصی پریشانی کے عالم میں مجھ کو فون کیا کہ "خاں صاحب نے یہ کیا کیا، اب لوگ پوچھتے پھریں گے کہ یہ صباح الدین عمر کون صاحب ہیں جن کو ایسی زبردست تحقیقی کتاب پیش کی گئی ہے"۔ لیکن صباح الدین صاحب واقعی لکھنؤ کے فدائی اور خاموش خدمت گار ہیں۔ فسانۂ عجائب کا یہ انتساب ان کی شخصیت کے اعتراف کی بہت ہی عمدہ صورت ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ خود رشید حسن خاں کی اس ادبی خدمت کا اعتراف کس صورت میں کیا جاتا ہے۔

❁❁

Scanned with CamScanner

ناول کی روایتی تنقید

اردو ناول کی ابتدائی تنقید کے نمونے زیادہ تر ان ناولوں کے دیباچوں، تعریفوں، اشتہارات، سرورق اور خاتمۃ الطبع کی عبارتوں اور خال خال تبصروں کی صورت میں ملتے ہیں۔ یہ تحریریں کسی حد تک ان ناولوں کی امتیازی خصوصیتوں کے حوالے سے اُس عہد کی اس نئی صنفِ ادب کی معیار بندی کرتی ہیں۔ مثلاً نذیر احمد مرآۃ العروس کے دیباچے بھی بتاتے ہیں کہ ان کی یہ تصنیف ایک ایسی کتاب کی ضرورت کو پورا کرتی ہے جو

> اخلاق و نصائح سے بھری ہوئی ہو اور ان معاملات میں جو عورتوں کو زندگی میں پیش آتے ہیں اور عورتیں اپنے توہمات اور کج رائی کی وجہ سے ہمیشہ مبتلائے رنج و مصیبت رہا کرتی ہیں، ان کے خیالات کی اصلاح اور ان کی عادات کو تہذیب کرے، اور کسی دلچسپ پیرائے میں ہو جس سے اُن کا دل نہ اُکتائے، طبیعت نہ گھبرائے۔

نذیر احمد یہ بھی بتاتے ہیں کہ

> جو کچھ وقت اس کتاب کی تصنیف میں صرف ہوا اس کے علاوہ مدتوں یہ کتاب اس غرض سے پیش نظر رہی کہ بولی بامحاورہ ہو اور خیالات پاکیزہ، اور کسی بات میں آورد اور بناوٹ کا دخل نہ ہو۔

مرآۃ العروس پر ایم کیمپسن (ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن، ممالک شمال و مغرب) کے تبصرے کے کچھ فقرے یہ ہیں:

> نذیر احمد کی یہ تصنیف روزمرہ کے پڑھنے کے لائق اور عام فہم ہے۔ . . اس میں مضامین عاشقانہ اور نازک خیالات، جن کو اس ملک کے مصنف اپنی شہرت کا ذریعہ سمجھتے ہیں، نہیں

Scanned with CamScanner

ہیں... کل قصہ شرفا کی روزمرہ زبان میں بیان کیا گیا ہے کہ وہی اس ملک کی اصل اردو ہے، نہ وہ جس میں بڑے بڑے الفاظ اور مضامین رنگین بھر دیے جائیں۔ [مصنف نے] زنان خانے کے وہ طور طریق بیان کیے ہیں کہ جو اہل یورپ اس کو پڑھے گا، اس ملک کی عورتوں کے روزمرہ کے حالات کی کسی قدر واقفیت اول اسی کتاب سے حاصل کرے گا... قصے کی نصیحت نفس قصہ سے نکلتی ہے اور جن اشخاص کا مذکور اس قصے میں ہے وہ پڑھنے والے کو ایسے نظر آتے ہیں کہ گویا ان کی نقل ہو رہی ہے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں کسی ہندوستانی مصنف نے اس سے پہلے بجائے لفاظی اور مداحی کے بات چیت اور گفت و شنید سے اصل حقیقت کو ایسا ادا نہیں کیا۔

سر ولیم میور (لیفٹیننٹ گورنر، ممالک شمال و مغرب) بھی کیمپسن کی رائے سے اتفاق کرتے ہیں اور لکھتے ہیں:

اس ملک کے عام مروجہ حکایاتِ بے لطف کے مقابل میں، کہ وہ اکثر قابل اعتراض بھی ہیں، اس کتاب کے نہایت عمدہ مضامین سے پڑھنے والوں کو نہ صرف یہ فائدہ حاصل ہوگا کہ سلیس و فصیح زبانِ روزمرہ سے واقفیت حاصل ہو، بلکہ امور خانہ داری میں بھی بہت واقفیت پیدا ہوگی، اور ممکن نہیں کہ جن لوگوں کو بہ وجہ اپنے مناصب کے لوگوں سے کام پڑتا ہے ان کے لیے فہمیدِ معاملات میں بہ کار آمد نہ ہو۔

مرآۃ العروس کے اٹھارہ سال بعد لکھنؤ میں ایک ناول افسانۂ نادر جہاں سامنے آیا۔ بڑی قطع کے پانچ سو صفحے کا یہ ناول مرآۃ العروس کے سانچے کا ہے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ یہ ایک عورت کی آپ بیتی کی صورت میں ہے اور کرداروں اور واقعات کے لحاظ سے اس کا پھیلاؤ بہت ہے۔ مصنفہ طاہرہ بیگم الملقب بہ نواب فخر النسا نادر جہاں بیگم بھی ناول کے دیباچے میں اسی بات پر زور دیتی ہیں کہ انھوں نے براہ راست اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجائے ''قصے کے پردے میں نصیحت'' کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ اپنی پڑھنے والیوں کو بتاتی ہیں:

نہ میں نے تمھیں مخاطب بنایا ہے اور نہ خطاب کر کے سمجھایا ہے کہ بہن خبردار، تم وہ کام نہ

Scanned with CamScanner

کرنا اور میری بہن میں قربان، یہ بات ضرور کرنا۔ ہاں، راہیں نیکی بدی، عذاب ثواب، خیر شر، اونچ نیچ کی بہ خوبی دکھلا دی ہیں۔

یعنی نذیر احمد کی طرح نادر جہاں کی بھی یہی کوشش ہے کہ ''قصے کی نصیحت نفس قصہ'' میں رکھی جائے، الگ سے نہ بیان ہو۔ اس طرح اردو ناول کی ابتدائی معیار بندی ہی میں یہ نکتہ ہمارے سامنے آتا ہے کہ راوی کو اپنے مافی الضمیر کا اظہار براہ راست اپنی طرف سے نہیں بلکہ قصے کے واسطے سے کرنا چاہیے۔

افسانۂ نادر جہاں کے آخر میں اس پر ایک اور خاتون ناول نگار امجدی بیگم کا انشاپردازانہ تبصرہ شامل ہے۔ جس میں بیانیے کے ربط و تسلسل کے بارے میں ایک اہم بات یہ کہی گئی ہے کہ نادر جہاں نے

مقاموں کے پیدا کرنے میں کمال دکھایا ہے، بات میں بات کا پیوند لگایا ہے۔

یہاں ''مقام'' سے صورت حال اور ناول کے وقوعے مراد ہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ افسانۂ نادر جہاں میں بڑی مہارت کے ساتھ ایک صورت حال سے دوسری صورت حال اور ایک وقوعے سے دوسرا وقوعہ پیدا کیا گیا ہے۔

ان تنقیدی تحریروں سے ایک عمدہ ناول کی مندرجۂ ذیل خصوصیتیں قرار پاتی ہیں:

1۔ ناول کو بامقصد، نصیحت آموز اور اصلاحی ہونا چاہیے۔

2۔ نصیحت مصنف/راوی کی طرف سے براہ راست نہ کی گئی ہو بلکہ کرداروں کے طرز عمل اور مکالموں کی صورت میں قصے کے اندر سے نکلتی ہو۔

3۔ کردار اور مکالمے مصنوعی نہیں، حقیقت سے قریب تر ہوں۔

4۔ ناول میں ایسی سماجی حقیقت نگاری ہونا چاہیے کہ پڑھنے والوں کو کرداروں کی معاشرت کا علم حاصل ہو سکے۔

5۔ قصہ ایک دوسرے سے مربوط واقعات کے فطری تسلسل کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیے۔

6۔ نفس قصہ کے ساتھ ناول کی زبان بھی ایسی ہونا چاہیے جس سے اس کے معاشرے کی سلیس روزمرہ کی زبان کا اندازہ ہو سکے۔

Scanned with CamScanner

انیسویں صدی کا اختتام آتے آتے اردو میں انگریزی ناولوں کے ترجموں کا دور شروع ہو گیا جس نے ایک سیلاب کی سی صورت اختیار کر لی۔ رینالڈس وغیرہ کے ناولوں کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی اور اردو مصنفوں نے ان کے چربے بھی اتارنا شروع کر دیے۔ یہ سستے ذوق کی تسکین والے ناول تھے اور ان کے بڑھتے ہوے چلن کو سنجیدہ ادبی مذاق رکھنے والوں نے ناپسند کیا۔ اس ناپسندیدگی کے اظہار نے ناول کی روایتی تنقید میں نواہی کے باب کا اضافہ کیا، اور مقبولِ عام ناولوں کے معائب کی نشان دہی نے یہ بتایا کہ ناول کو کیسا نہیں ہونا چاہیے۔ مرزا رسوا شکایت کرتے ہیں:

اکثر ناول جو اس زمانے میں لکھے گئے ہیں ان سب میں ایک ہی طرح کے منظر ہوتے ہیں اور وہی ہر پھر کے آتے ہیں، جیسے اس شہر میں ایک غریب تھیٹر تھا جسے لوگ مذاق سے ''چیتھڑا کمپنی'' کہتے تھے۔ اس میں چند پردے تھے۔ خواہ مخواہ تماشے میں وہی پردے بار بار دکھائے جاتے تھے خواہ اُن کا محل ہو یا نہ ہو۔

اکثر تقلید پیشہ ناول نویسوں نے رینالڈ کے ناول انگریزی میں پڑھے ہیں۔ اسی کے مضامین جس قدر یاد رہ گئے ہیں ان کو اپنے ناولوں میں صرف کرتے ہیں۔ قصے میں بھی کوئی جدت نہیں ہوتی۔ میں نے کسی انگریزی کتاب میں انگلستان کے ناول نویسوں کے پلاٹ کی ایک عام صورت پڑھی تھی۔ اس کا ذکر اس موقعے پر لطف سے خالی نہیں۔ واقعی ناولوں میں اس کے سوا ہوتا ہی کیا ہے [پلاٹ کا بیان]۔ ممکن ہے کہ ہمارے ناول نویسوں کے لیے ایسا ہی ایک ڈھانچہ بنا دیا جائے۔ اس پر ہزاروں ناول نام بدل بدل کر لکھ لیے جائیں۔

ایک اور خرابی ہمارے ملک کے ناولوں میں پردے کے اصول کی وجہ سے ہے، کیونکہ عوام عشق اور عاشقی کو ہر قصے کی جان سمجھتے ہیں، لذتِ فراق اور انتظار سب سے عمدہ مضمون خیال کیا جاتا ہے، پھر اگر کسی پردہ نشین سے سامنا ہو بھی گیا تو بغیر اس کے کہ اس کی عصمت پر دھبا لگے، پیام سلام، وعدے وعید، فراق، انتظار، یہ کچھ بھی نہیں ہو سکتا اور جب تک یہ نہ ہو قصے کا مزہ کیا۔ لہٰذا لازم ہوا کہ ہر ایک قصے میں ناجائز محبتوں کا تذکرہ ہو

اور یہ موجب خرابیِ اخلاق کا ہے۔

اس سب کا سبب کلی یہ ہے کہ فطرت کے ملاحظے کا ہمارے ملک میں بہت ہی کم شوق ہے۔ جمال اور عظمت کے تصورات سے اذہان قاصر ہیں۔ نئے مضمون کیونکر نکالیں۔

مرزا رسوا کو اس کا بھی گلہ ہے کہ

نہ ہم خارج سے مضامین اخذ کرتے ہیں، نہ ذہن سے۔ ہم کو اس کی قدرت ہی نہیں کہ کسی منظر کو دیکھ کے زبانِ قلم سے اس کی تصویر کھینچ سکیں۔

اسی سلسلے میں رسوا زبان کی قوت اور لفظوں کی اہمیت کا ذکر کرتے ہیں:

اگرچہ ادیب مصور کی طرح کسی چیز کی رنگت اور شکل آنکھ سے نہیں دکھا سکتا، نہ خوش آئند سُر کانوں تک پہنچا سکتا ہے، لیکن وہ الفاظ کے ذریعے سے ہر چیز کی صورت صفحۂ تخیل پر کھینچ سکتا ہے، نہ صرف ایک رُخ سے بلکہ مختلف رُخوں سے۔ اور یہ ذہنی تصویر بہ نسبت جسمانی تصویر کے زیادہ پائیدار [ہوتی] ہے۔ الفاظ کے انتخاب اور تالیف سے نہ صرف نظم بلکہ نثر میں بھی اصولِ موسیقی کا مزہ پیدا ہو سکتا ہے۔

زبان کا ذکر رسوا نے اپنے ایک ناول افشائے راز کے ذیل میں بھی کیا ہے اور اس طرح لکھنے پر زور دیا ہے ''جس طرح ہم آپ باتیں کرتے ہیں، نہ کہ اُس عبارت میں جو کسی انگریزی کتاب کا لفظی ترجمہ معلوم ہو۔'' رسوا ''عام فہم اردو'' اور ''عبارت کی سادگی'' کو اپنے ناول کی امتیازی خصوصیت بتانے کے ساتھ مکالمہ نگاری کے سلسلے میں ایک پتے کی بات کہتے ہیں:

اگرچہ اس ناول میں اعلیٰ درجے سے لے کر ادنیٰ درجے تک کے بولنے والوں کے مکالموں کی نقل کی گئی ہے لیکن ہم نے حتی الوسع اردو زبان کی سلاست کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

زبان کی سلاست کو قائم رکھتے ہوئے مختلف کرداروں کے مکالمے اس طرح پیش کرنا کہ وہ بولنے والے کی شخصیت سے ہم آہنگ ہو جائیں، خواہ وہ سلیس زبان بولنے والی شخصیت نہ ہو، بہت مشکل کام ہے۔ مکالمہ نگاری کی سب سے کڑی شرط یہی ہے کہ نقل مطابق اصل نہ ہونے کے باوجود مطابق

Scanned with CamScanner

اصل معلوم ہو، اور اس کی پابندی کا آج تک ہمارے یہاں صحیح تصور نہیں ملتا۔ یہ شرط رسوا ہی کا سا اعلیٰ فنکار عائد کر سکتا تھا۔

1891 میں ہمارے سامنے مقدمے کی صورت میں ایک ناول کا عمدہ تنقیدی تجزیہ آتا ہے۔ ناول سوانح عمریِ مولانا آزاد ایک فرضی کردار کی خیالی آپ بیتی ہے۔ یہ سماجی طنز نگاری کا ابتدائی نمونہ ہے جس کا مرکزی کردار دنیاوی ترقی اور معاشرے میں اعتبار حاصل کرنے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتا اور نت نئے بہروپ بھرتا ہے اور آخر جیل پہنچ جاتا ہے۔ یہ ناول اودھ پنچ میں قسط وار شائع ہوتا تھا۔ 1891 میں سید محمد عبدالغفور شہباز کے ''حسن تصحیح'' اور مقدمے کے ساتھ اس کی اشاعت ہوئی۔ کتاب اور مقدمے میں مصنف کے نام کی صراحت نہیں ہے لیکن مقدمہ ناول کا تفصیلی تعارف کراتا ہے۔ مرکزی کردار اور ناول کے دائرۂ کار کے بارے میں شہباز لکھتے ہیں:

> [مولانا آزاد] ... نئی روشنی کے جدید تربیت یافتہ حضرات کا ... ایک فرمائشی نمونہ ہیں۔ اُن کی تاریخ زندگی واقعی میں نئی روشنی کی تاریخ ہے کہ پچھلے چالیس برس میں علی العموم اس نئے تربیت یافتہ حضرات کے عقائد اور خیالات پر کیا اثر ڈالا۔ ان کے طریقۂ کسبِ معاش میں کیا کیا انقلاب پیدا کیے۔ سوسائٹی کے فریم کو کس طرح بدلا۔ طریقۂ زندگی اور اوضاع لباس و پوشاک میں کیا ترمیم کی۔ دیانت اور ایمان داری، شرافت اور انسانیت کے مفاہیم اور معانی میں کیا کیا باتیں بڑھائیں ... خود غرضی، نفس پرستی، غرور، تن آسانی، خودنمائی، خود بینی اور اسی قسم کے اور بیہودہ اخلاق کے مہذب طور سے برتنے اور ان پر نوتراشیدہ مہذب الفاظ کی آڑ میں فخر کرنے کے کیا کیا ڈھنگ ایجاد کیے۔ نئی روشنی کی تاریخ اس شرح وبسط کے ساتھ ... شاید کہیں قلم بند نہیں ہے۔

شہباز اس بات کی خاص طور پر تعریف کرتے ہیں کہ مصنف نے اپنے مشاہدے کی قوت اور ''تجربۂ دنیا'' کی مدد سے بڑی خوبی کے ساتھ ''مختلف پیشوں اور مشغلوں کے اسٹیج پر ایک فرضی اور خیالی شخص سے ... مختلف مشکل پارٹ کامیاب طور پر ایکٹ'' کرائے ہیں۔

Scanned with CamScanner

ناول میں کرداروں کی کثرت اور رنگارنگی کا ذکر شہباز اس طرح کرتے ہیں:

سوانح عمری مولانا آزاد حقیقت میں ایک ہزار غُرفہ قصرِ رفیع الشان ہے جس کے ہر غرفے سے ایک نئی خصلت اور نئے خیال کا آدمی آزادانہ جھانک رہا ہے۔ کج طینت مارواڑی، وسیع الاخلاق کسبی، سریع الاستحالہ اسکولی لونڈے، سرگرم اور پر جوش برہمو مذہب کے کنورٹ، روشن خیال ماسٹر، تربیت یافتہ حکام رس، نفس پرست واعظ، دنیا ساز وکیل، شکم پرور میونسپل کمشنر، بداصول آنریری مجسٹریٹ، ناعاقبت اندیش سیاہ فام حکام، استحصال بالجبری ایڈیٹر، بگڑے ہوئے رفارمر، مہذب شرابی، عالی ظرف تاڑی باز... کون صاحب ہیں کہ جو یہاں تشریف نہیں رکھتے۔

ناول کے موضوع اور اسلوب کے رشتے پر بھی شہباز کی نظر پڑی ہے۔ مصنف کے استعاراتی اور تشبیہی پیرایۂ اظہار کی تعریف کرنے کے ساتھ لکھتے ہیں:

سوانح عمری کے مضامین کو اس خاص طرزِ ادائے مطلب کے ساتھ عجب متناسب طلسماتی تعلق ہے۔ شاید مولانا آزاد کی سوانح عمری کے لیے مطالب کے لحاظ سے اس... طریقۂ انشا سے بہتر کوئی طریقہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ طرزِ عبارت اور حالات میں ایک عجب طرح کا مفہومی لین دین قائم ہے کہ حالات کو طرزِ عبارت چمکا رہی ہے اور طرزِ عبارت کو حالات۔ پھر وہ معاملہ اس اعتدال کے زینے پر ہے کہ نہ تو مطالب عبارت کو گھسیٹ لے گئے ہیں نہ عبارت مطالب کو۔ گویا وہ متساوی القوۃ اشخاص ایک دوسرے کو اپنی طرف برابر قوت کے ساتھ گھسیٹ رہے ہیں۔

عمدہ مزاحیہ تحریر کی صفت یہ ہے کہ اس کا لکھنے والا پڑھنے والوں کو ہنسانے کی کوشش کرتا نہ معلوم ہو، نہ یہ ظاہر کرتا معلوم ہو کہ وہ کوئی مزاحیہ بات کر رہا ہے۔ شہباز ناول میں اس صفت کی موجودگی کا اس طرح ذکر کرتے ہیں:

خوش سلیقہ ظریف کا کمال یہ ہے کہ ہر چند کیسی ہی ہنسی کی بات کیوں نہ ہو مگر اس کے بشرے سے یہ نہ پایا جائے کہ وہ کوئی ہنسی کی بات کر رہا ہے... آزاد کے سوانح عمری میں اس پہلو پر عجب متعلق طور پر نظر رہی ہے۔ جہاں جہاں غایت درجے کی ظرافت ہے،

Scanned with CamScanner

طرزِ بیان اس قدر متین اور سنجیدہ ہے کہ معلوم ہوتا ہے قائل کو اس کے مضحک ہونے کا مطلق احساس نہیں۔ اس قسم کی مصنوعی متانت مضمون کو عجیب معتدل اور مہذب عنوان سے شوخ کرتی ہے۔

سوانح عمری مولانا آزاد کا مرکزی کردار طرح طرح کے روپ بدلتا اور مختلف بلکہ متضاد کرداروں میں ڈھلتا رہتا ہے، اس کے باوجود اس کی ذاتی شناخت قائم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ شہباز ناول کی اس خصوصیت پر بھی نظر ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

مولانا آزاد کی تصویر ایک کامل الفن معنوی نقاش کی استادی اور کمال کا حیرت انگیز نتیجہ ہے۔ عالمِ فطرت میں شاید مشکل سے کوئی فرد ایسا نکلے جس میں تمام صفات و کمالات صوری و معنوی مولانا آزاد کے جمع ہوں، گو فرداً فرداً ہر صفت اور کمال کا وجود عالمِ ظاہر میں متحقق ہو۔ استادی فقط ان صفات اور کمالات کے خاص انتظام میں ہے اور اس انتظام کا کمال یہ ہے کہ فطرت کو صنعت کا دھوکا ہوتا ہے اور صنعت کو فطرت کا۔

عبدالغفور شہباز کا یہ مقدمہ اردو ناول کی روایتی تنقید میں خاص توجہ کا مستحق ہے۔ اگرچہ یہ سراسر ستائشی تنقید ہے لیکن ہمارے علم میں اس سے پہلے کسی ایک ناول کا اتنے پہلوؤں اور اتنی تفصیل سے جائزہ نہیں لیا گیا تھا۔

آخر میں جس کتاب کا ذکر کرنا ہے وہ ناول پر غالباً پہلی مستقل تنقیدی تصنیف ہے اور اس لحاظ سے ناول کی تنقید میں تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب تنقید القصص ہے۔ اس کی تصنیف اور اشاعت کا سنہ درج نہیں ہے لیکن اندرونی شہادتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ انیسویں صدی کے آخر یا بیسویں صدی کے آغاز میں لکھی گئی ہے۔ مصنف کا نام ''نواب عاشق الدولہ'' بتایا گیا ہے۔ یہ فرضی نام ہے جیسا کہ ختم کتاب کے اس شعر سے ظاہر ہے:

پڑھنے والے تجھے کیوں نام بتائیں اپنا
ہر کسے مصلحتے خویش نکو می داند

تنقید القصص میں تنقید کا اصل موضوع، یا نشانہ، انگریزی کے عام پسند بلکہ عامیانہ

Scanned with CamScanner

ناولوں کے وہ ترجمے اور چربے ہیں جن کا اردو میں بہت چلن ہو گیا تھا۔ ''پرانے قصے اور نئے ناول'' کے عنوان سے مختصر تمہید میں مصنف بتاتے ہیں کہ وہ اس موضوع پر شدت سے لکھنا چاہتے تھے، لیکن ڈرتے تھے کہ ''ایک ہلڑ مچ جائے گا اور چاروں طرف سے مخالفت بلکہ مخاصمت کا بادل امنڈ آئے گا۔'' مگر اب ضبط کی تاب نہیں ہے۔ کتاب لکھنے کا مقصد یہ بتاتے ہیں کہ ''پرانے قصوں اور نئے ناولوں کو محققانہ نظر سے دیکھا جائے۔''

کتاب چھ حصوں میں تقسیم کی گئی ہے جن کے عنوان یہ ہیں:

1۔ فرق اور اثر

2۔ ہندوستانی جدید ناول

3۔ مختلف مقامات کے ناول، زبان، معمولی جملے، طرز ادا وغیرہ

4۔ ناولوں کے خصوصیات

5۔ ایک چھوٹا سا محاکمہ

6۔ میری صلاح

ان حصوں کے تحت آنے والے مباحث مختصراً اس طرح ہیں:

1 ''فرق اور اثر''

اردو فارسی کے پرانے ایشیائی قصوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ خلافِ عقل اور مخربِ اخلاق باتوں سے بھرے پڑے ہیں۔ اغلباً انھیں خصوصیات کے ردعمل میں یوروپی انداز کی ناول نگاری کا دور دورہ ہوا اور حقیقت نگاری کو نئے ناولوں کی خاص صفت بنایا گیا ہے لیکن پرانے قصوں کا غیر حقیقی ہونا اتنا بدیہی ہے کہ کم عقل آدمی بھی ان کو جھوٹ سمجھ کر پڑھتا ہے اور اس صورت میں ان قصوں کا اخلاق پر بُرا اثر نہیں پڑ سکتا۔ نوجوانوں کے لیے ان سے کہیں زیادہ مضرت رساں عشقیہ انگریزی ناول ہیں اور ہمارے ''تقلید سرشت'' لکھنے والوں نے انہی کی نقالی شروع کر دی۔

2 ''ہندوستانی جدید ناول''

اردو ناولوں کا ''اصلی مقصود عشق بازیاں ہیں۔'' اگرچہ گاہ گاہ ان میں ''پولیٹکل اور تمدنی چالیں'' بھی دکھانے کی ناکام کوششیں کی جاتی ہیں لیکن ''تماشبینی اور نازآفرینی کے ہتھکنڈے خوب جی کھول کے بنائے جاتے ہیں... اور یہ مضامین اس طرح بیان ہوئے ہیں کہ یہ سب کچھ ہو ہی کے رہا ہوگا۔ ان سے ہمارے پرانے ایشیائی قصے بہتر ہیں جن کے سچ ہونے کا اعتبار ہی نہیں ہوتا۔''

3 ''مختلف مقامات کے ناول...''

یہ کتاب کا سب سے دلچسپ اور اہم حصہ ہے جس میں ہندوستان کے قریب قریب ہر علاقے کی ناول نویسی کا جائزہ لیا گیا ہے، مثلاً:

(1) دہلی میں ناول نویسی کو زیادہ فروغ نہیں ہوا۔ کچھ ناول انگریزی سے ترجمہ ہوئے، طبع زاد کم لکھے گئے مگر وہ بھی ''عام رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں'' البتہ نذیر احمد وغیرہ کے کچھ ناول ہیں جن میں شریفانہ تعلیم اور اعلیٰ اخلاقی مضامین ہیں، ''نجس عشق بازی اور ناپاک تماش بینی'' نہیں ہے۔ ان سے ناول لکھنا سیکھنا چاہیے۔

(2) لکھنؤ میں ناول نویسی کا بازار سب سے زیادہ گرم ہے۔ سب لکھنے والے زبان دانی کے مدعی ہیں اور عجب مصنوعی، آورد سے بھری ہوئی عبارت لکھتے ہیں۔ ہر ناول میں چند مخصوص لفظوں اور فقروں کی بھرمار ہوتی ہے۔ کہیں ذرا سی بات کو کئی صفحوں میں پھیلا دیا جاتا ہے، کبھی مضحکہ خیز طور پر اختصار سے کام لیا جاتا ہے، تکرارِ مضامین ایسی ہوتی ہے کہ کئی کئی صفحے سادہ چھوڑے جاسکتے ہیں۔

(3) پنجاب میں انگریزی سے ترجمے زیادہ ہوئے، طبع زاد ناول کم لکھے گئے۔ یہ زبان کے لحاظ سے ناقص ہیں۔ پنجاب کے مسلمانوں نے ''ہر قسم کے لٹریچر میں'' سب صوبوں سے زیادہ ترقی کی ہے۔ کاش وہ ناولوں کے بجائے دوسرے اور مفید علوم وفنون پر توجہ کرتے۔

(4) بنگال میں بھی اردو ناول کم لکھے گئے۔ بنگلہ ناولوں کے ترجمے ضرور ہوئے ہیں مگر بہتر تھا کہ نہ ہوئے ہوتے۔ مولانا آزاد کی کتابیں [سوانح عمری مولانا آزاد وغیرہ] البتہ بنگال اور

Scanned with CamScanner

بہار کا قابل قدر سرمایہ ہیں، ''گو وہ ناول نہیں ہیں اور ظریفانہ طور پر لکھی گئی ہیں،'' پڑھنے والوں کو اُن سے '' کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔''

(5) دکن کے علاقوں (حیدر آباد، پریزیڈنسی مدراس، بمبئی) میں حیدر آباد ہندوستان بھر کے ناولوں کا سب سے بڑا گاہک ہے۔ یہاں کے نوجوانوں نے ''حسنِ معاشرت اور اعلیٰ تہذیب کی کسوٹی ناول کو سمجھ لیا ہے'' اور فیشن کے طور پر بہ کثرت۔ ناول خریدتے ہیں لیکن پوری طرح پڑھتے نہیں اور جتنا پڑھتے ہیں اُسے سمجھتے نہیں۔ اس کم ذوقی کے باوجود دو چار لوگ ناول نویسی کے میدان میں اُتر پڑے۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کی داد دینا ممکن نہیں۔

(6) مدراس میں ناول نویسی کی جیسی بُری حالت ہے ویسی اور کہیں نظر نہیں آتی۔ یہاں کے ناولوں کی نسبت کچھ کہنے سے بہتر ہے کہ ان کے چند فقرے اور شعر نقل کر دیے جائیں۔ [مضحک مثالیں]

(7) بمبئی کے ناول دیکھنے کا موقع نہیں ملا، اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ وہاں کیا حال ہے، لیکن ممکن نہیں کہ ناول نویسی کی یہ وبا وہاں نہ پہنچی ہو۔

(8) ''ملکِ متوسط میں اردو فارسی پڑھے لکھے لوگ کم ہوتے ہیں، اور وہاں کے ناول ہوں گے بھی تو اپنے ہم سرحدی صوبوں میں مل جل گئے'' ہوں گے۔

(10،9) ''لنکا اور برہما کی خبر نہیں۔ وہاں کی کھیپ ہندوستان میں ابھی نہیں آئی۔ . . کیونکہ ان مقامات پر اس ملک کے صدہا ہزارہا آدمی موجود ہیں، ان میں پڑھے لکھے بھی اگر ہیں تو ضرور یہ تحفہ لائیں گے . . . تب دیکھا جائے گا۔''

4 ''ناولوں کے خصوصیات''

ایشیائی قصے بے شک مبالغے اور جھوٹ سے بھرے ہوئے ہیں اور انھیں خلافِ حقیقت سمجھا بھی جاتا ہے لیکن اس قسم کی لغویتیں جدید ناولوں میں بھی موجود ہیں، البتہ انھیں صداقت کے پیرائے میں بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ [انگریزی ناولوں میں فوق الفطرت اور بعید از قیاس عناصر کی

Scanned with CamScanner

نشاندہی۔]

یوروپی ناولوں کی دیکھا دیکھی ہندوستانی ناولوں میں بھی بے حیائی کے منظر خوب دکھائے جاتے ہیں، بلکہ بعض ہندوستانی ناول تو اس خصوصیت میں یوروپی ناولوں سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں۔

ہندوستانی ناولوں میں ایک عیب یہ بھی ہے کہ ان کو بہ آواز نہیں پڑھا جا سکتا [یعنی زبانی بیانیے کی حیثیت سے یہ ناول ناکام ہیں]۔

5 ''ایک چھوٹا سا محاکمہ''

ان تمام اعتباروں سے کہنا پڑتا ہے کہ ''ہمارے پرانے ایشیائی قصے ہر طرح اچھے، ہزار بار اچھے، لاکھ بار اچھے۔'' بوستانِ خیال، الف لیلہ کا مقابلہ ہندوستان کیا، یوروپ کا بھی کوئی ناول نہیں کر سکتا۔ سب سے زیادہ دھوم مسٹریز آف دی کورٹ آف لندن کی ہے، لیکن کیا یہ بوستانِ خیال کی ایک جلد کا بھی مقابلہ کر سکتا ہے؟

ناول میں پڑھنے والے کی دلچسپی بالکل ویسی ہی ہوتی ہے جیسی کنکوے بازی، بٹیر بازی، ناچ، تھیٹر کے سے تفریحی مشغلوں میں ہوتی ہے، اور اس سے کچھ بھی فائدہ نہیں ہوتا۔

اردو میں تاریخی ناول بھی لکھے جا رہے ہیں لیکن ان میں من گھڑت واقعات جوڑ کر پڑھنے والوں کو گمراہ کر دیا جاتا ہے اور کم استعداد پڑھنے والے ان بے اصل واقعات پر اسی طرح یقین کرنے لگتے ہیں جس طرح تاریخ ابو الفدا قسم کی مستند کتابوں پر یقین کیا جا سکتا ہے۔

6 ''میری صلاح''

اس آخری حصے میں مصنف زور دے کر کہتے ہیں کہ ناول ملک یا زبان کی ترقی کا ذریعہ نہیں بلکہ ''بہت مبتذل چیز ہے اور ایک حد تک مخربِ اخلاق، معین جرائم، موید سیہ کاری ہے۔'' اسی لیے ہمارے بڑے بڑے عالی دماغ عالموں نے اس صنف کی طرف توجہ نہیں کی۔ اس سلسلے میں ایک

Scanned with CamScanner

دلچسپ بات لکھتے ہیں:

''اگر ناول ہندوستان میں کسی کام کا بھی ہوتا اور کچھ بھی اس سے دنیاوی فائدے کی توقع ہوتی تو سب سے پہلے ہندی ناولسٹ سرسید ہوتے۔''

لکھنے والوں کو چاہیے کہ ناول نویسی چھوڑ کر مفید علمی کتابیں ترجمہ یا تصنیف کریں۔ یہ محض عذر لنگ ہے کہ ''اردو زبان الفاظ کی طرف سے ایسی مفلس ہے جس میں علوم وفنون یا اعلیٰ درجے کی عربی انگریزی انشا پردازی کے ترجموں کی پوری گنجائش نہیں'' اور بتاتے ہیں کہ مولوی زوار حسین کنتوری نے کتاب فرہنگِ فرنگ کے دیباچہ (1887) میں اس موضوع پر ''بہت ہی نفیس اور کامل بحث کی ہے۔'' انگریزی وغیرہ کی طرح اردو میں بھی دوسری زبانوں کے لفظوں کو اپنا لینے کی غیر معمولی صلاحیت موجود ہے۔ ''غرض یہ عالی ظرف زبان اتنی سمائی رکھتی ہے اور اس بے قیدی کے ساتھ اتنی ترقی کر سکتی ہے کہ کسی زبان کو ممکن نہیں۔۔۔ ہماری اردو مفلس ہے نہ محتاج، بلکہ دنیا کی تمام دولت مند زبانوں سے بہت زیادہ مالا مال ہے اور ہو سکتی ہے، بشرطیکہ ہم اسے جینے دیں اور صرف ناولوں کی تیرہ وتار قبروں میں نہ دفن کر دیں۔''

مصنف نے پرانے قصوں اور نئے ناولوں کی بحث میں کچھ ناولوں کے تلخیص نما پلاٹ بھی درج کر دیے ہیں۔ یہ طریقہ مرزا رسوا نے بھی اختیار کیا ہے۔ لیکن رسوا اور شہباز کے لہجے میں ٹھہراؤ اور سنجیدگی ہے، ان کے برخلاف تنقید القصص کے مصنف کا لہجہ تیز اور کہیں کہیں تضحیکی ہے۔ ان کے تنقیدی اسلوب کا کچھ اندازہ مندرجہ ذیل اقتباسوں سے کیا جا سکتا ہے:

(پنجاب کے ناول) ''زبان کے اعتبار سے اسی قدر کہنا کافی ہے کہ پنجابیوں سے اتنی توقع بھی نہ تھی۔''

''بنگالہ میں اردو ناول کم ہیں۔ بنگالی زبان میں ہوں گے۔ ان کو مچھلی بھات کے حوالے کرو۔ درگیش نندنی، بشا برکھشا، فاتح بنگالہ وغیرہ ناول بنگالی ماشاؤں کی طباعی ہے جن کا اردو ترجمہ کرنے والوں نے اپنے حسابوں ملک پر احسان کیا ہے، مگر بہتر ہوتا کہ بلی صاحبہ مہربانی کرتیں، مرغا لنڈورا ہی اچھا تھا۔ یہ سب ترجمے اسی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں جس کا ذکر ہو چکا۔''

Scanned with CamScanner

''دہلی کو رخصت کیجیے اور لکھنؤ چلیے:

این شعلہ ''وہاں پہ'' گرم خیز است
این جاست کہ آفتاب تیز است

یہاں کے تکلفات اور چناں چنیں نے جہاں اور باتوں میں چار چاند لگا دیے ہیں، ناول پر بھی وہی مہربانی کی ہے... وہاں زبان دانی کی عام ہوا کچھ ایسی چلی ہے کہ ہر شخص اس کی لٹک میں جھومتا ملے گا... جتنے ناول میں نے یہاں کے دیکھے اُن کی تیزی زبان اور آورد کی سینہ زوریاں ایسی ہیں کہ یقیناً اتنی کسی سے نہ بن پڑیں۔ انداز بیان، طرز ادا، اللہ تیری پناہ، معلوم ہوتا ہے شکنجے میں کسے ہوئے لفظ اور کاٹھ میں دیے ہوئے فقرے ہیں۔ ایک صفحہ بھی بغیر کراہے اور آہ اوہ کے آپ نہ دیکھیں گے۔ ضمائر، اشارات، تشبیہ، استعارات گردن مڑوڑ کے کہیں سے پکڑ لائے ہیں۔ مبتدا سے خبر اتنی دور جیسے لکھنؤ سے دہلی۔ سچے جذبات ادا کرنے کی دھن میں الجھا ہوا ریشم کاغذ پر پھیلا دیا گیا ہے کہ نہیں سلجھتا، نہیں سلجھتا۔''

''یہ جانتا ہوں کہ ہندوستان بھر کے ناولوں کا گاہک اگر حیدر آباد نہ ہوتا تو مالکانِ مطابع اور خود ناول نگار صاحبوں کا دیوالہ نکل جاتا... جس پڑھے لکھے، بلکہ معمولی شد بد جاننے والے، کو ناول خریدنے کی مقدور ہے، پچاسوں منگوائے ہیں، اور جس کو مقدرت نہیں اس نے مستعار لے کے کام نکالا ہے، مگر سلامتی سے پورا ناول دیکھا ایک نے بھی نہیں۔ اور جس قدر دیکھا، اگر سمجھ لیا ہو تو میں کبھی نہ مانوں گا کیونکہ پتھر کا ایک بھی نہ ہو گیا۔''

''اس طرز میں لکھنے والوں کو جتنی آسانی ہے، پڑھنے والوں کو اتنی ہی مصیبت کا سامنا ہوتا ہے۔ دل ہی دل میں بغیر ہونٹ ہلائے تو خیر پڑھ بھی لو، بلکہ دیکھ جاؤ، لیکن کسی کو سنانے بیٹھو یا بلند آواز سے پڑھنا چاہو، کہیں سے چول ہی نہیں بیٹھتی... جن صاحبوں کو میری بات کا یقین نہ آئے، کسی ناول کو اٹھالیں اور دوسرے کو سنائیں، یا پکار کے پڑھیں، معلوم ہو جائے گا کہ اس سنگلاخ راستے میں زبان کے کتنے پرخچے اڑتے ہیں، یا ہونٹوں پر کتنے جھٹکے پڑتے ہیں اور کانوں میں کیا اُتو ہوتا ہے۔''

''ہمارے حضرات ناول نویسوں نے ایک اور ظلم کیا ہے، یعنی (اپنے ناول کے) نام وہ چھانٹ چھانٹ کے رکھے ہیں کہ صلِّ وجلَّ۔ نازک ادا، نازنین، عصمت، بوسۂ بکر،

بچھڑی دلھن، کامنی وغیرہ وغیرہ۔ اگر کوئی کہہ بیٹھے، ''اپنی نازنین کو آج بھجوا دیجیے گا، میں بڑا مشتاق ہوں''، ''آپ کی شرمیلی دلھن کے تو ہم عاشق ہو گئے، واللہ کیا مزے کی ہے!''، ''ذرا بوسۂ بکر تو عنایت کیجیے''، ''تمھاری کامنی کے اشتیاق میں میں بے چین ہوں''۔۔۔ میں نہیں سمجھتا اس کا جواب کیا ہوگا، اور کوئی بوند لہو کی جسم میں اس وقت تک باقی رہے گی یا نہیں۔ ہاں، جگت بازوں اور پھکو لڑنے والوں کی سند نہیں۔''

شہباز کے مقدمے اور تنقید القصص دونوں کی مشترکہ خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ناول کے موضوع، اس کی سماجی افادیت اور مصلحانہ حیثیت سے زیادہ اس کے اسلوب، تکنیک اور دوسری حرفتوں پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے اور اس ضمن میں کئی کام کی باتیں کہی گئی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ دونوں تحریریں ناول کی روایتی تنقید میں اپنے وقت سے کچھ آگے اور ہمارے زمانے سے قریب تر ہیں۔

انیسویں صدی کے اختتام پر رسوا کا ناول امراو جان ادا شائع ہوا اور رسالہ معیار لکھنؤ کے آٹھویں شمارے (1899) میں ''ریویو'' کے زیر عنوان اس کا تنقیدی جائزہ لیا گیا۔ اس وقت تک اس ناول کی دوررس ادبی اہمیت اور فکشن کی تاریخ میں اس کی یادگاری حیثیت کا اندازہ نہیں کیا جا سکا تھا۔ معیار کے جائزہ نویس نے بھی اسے رینالڈس کے ناولوں کے زمرے کی چیز، اگرچہ اس سے بہتر قرار دیا۔ اس ناول پر غالباً پہلی تنقیدی تحریر ہونے کی وجہ سے اس جائزے کی بھی تاریخی اہمیت ہے اس لیے ذیل میں اسے تمام وکمال نقل کیا جاتا ہے:

''یہ قصہ فی الجملہ اس پرداز پر لکھا گیا ہے جس پرداز پر روزا لیمبرٹ مسٹر رینالڈز نے لکھا ہے، لیکن فرق اتنا ہے کہ روزا لیمبرٹ نے اپنی سوانح عمری اور شرمناک بے باکیاں ہر ایک سے خود ظاہر کی ہیں اور اس ناول میں نہ ایسی شرمناک بے باکیوں کا اظہار ہے جو کسی بہو بیٹی کے سامنے پڑھنے کے لائق نہ ہوں اور نہ خود امراو جان ادا نے اسے تحریر کیا، بلکہ ایک اپنے محرمِ راز (جن کا نام مرزا رسوا صاحب ہے) سے بیان کیا اور انھوں نے اسے شائع کیا۔ علاوہ اس کے وہ ایک فرضی قصہ ہے اور یہ (حسبِ بیانِ مرزا رسوا صاحب) واقعی ہے۔ روزا لیمبرٹ نے پرانے شگون میں اپنی ناک

Scanned with CamScanner

کنائی ہے، امراؤ جان کو مجبوریوں نے باعصمت نہیں رہنے دیا۔ روزا لیمبرٹ میں تشابہِ واقعات سے ناظر کی [توجہ/ نظر] متنفر ہو جاتی ہے، اِس ناول میں ترادفِ واقعات نہ ہونے کے علاوہ انتہا درجے کی دلچسپی ہے، خصوصاً بیچ بیچ کے متانتِ مزاح نے دوگنا لطف پیدا کر دیا ہے۔ کسی مقام پر اشعارِ معنی خیز کی بہار ہے، کہیں پر لطف سینریاں دکھائی ہیں، کسی جگہ محفلِ رقص و سرود کی زیبائش ہے، کہیں میلے کا بیان آسائش [آرائش؟] ہے۔ کہیں مصائب کا تذکرہ، کسی جا مسافرت کی تکلیفیں، فریب و مکر کے حالات، سچی محبت کے فسانے، رئیسوں نوابوں کی بے وقوفیاں اور عقل مندیاں۔

''امراؤ جان چونکہ خود طوائف تھیں اور موسیقی سے واقف کار، تو جا بہ جا رموزِ موسیقی بھی داخل ہوئے ہیں۔ قیافہ شناسی بھی دکھائی دیتی ہے اور بڑی بات یہ ثابت کی گئی ہے کہ صرف طبیعت کے نیک و بد ہونے سے آدمی نیک و بد نہیں ہو سکتا جب تک کہ واقعات مناسبِ حال و حامی نہ ہوں اور یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ رنڈی کو اس وقت تک کوئی موقع عقبیٰ کے درست کرنے کا نہیں ملتا جب تک خود ذی لیاقت یا بد صورت نہ ہو یا بڈھی نہ ہو، یا مصیبتیں نہ پڑی ہوں، کیونکہ اس کے بے عصمت ہونے کے قدردان اور اس کی بے باکیوں اور شرم ناکیوں کو اچھی نظر سے دیکھنے والے بہت ہوتے ہیں اور انہی عیوب کو لوگ ان کے لیے مناسب جانتے ہیں۔ لطفِ بیان و خوبیِ زبان کا اندازہ ناظرین خود کر سکتے ہیں۔ قیمت باتصویر [ایک روپیہ پچھتر پیسے] و بے تصویر [ایک روپیہ پچاس پیسے]''

❄❄

خان چاچا

(رشید حسن خاں)

میں نے 1981 میں رشید حسن خاں کی شخصیت پر ایک مضمون لکھا تھا:

''رشید حسن خان میرے گھر آئے اور آتے ہی انھوں نے میری چھوٹی بچی صائمہ سے دوستی کر لی اور بچی بھی فوراً ان سے مانوس ہوگئی۔ اس سے دیر تک باتیں کرنے کے بعد انھوں نے جیب سے ایک نوٹ نکالا۔ میں نے احتجاج کیا تو بولے:

''آپ براہ کرم اس معاملے میں دخل نہ دیں۔ یہ کوئی تحقیقی مسئلہ نہیں، میرا اور صائمہ کا حساب کتاب ہے۔''

اس کے بعد سے وہ تقریباً ہر خط میں صائمہ کو ضرور یاد کرتے ہیں اور جب بھی مجھ سے ملنے آتے ہیں، فوراً اس کو بلواتے ہیں:

''بھئی آپ کہاں تھیں؟ ہم اتنی دیر سے آپ کو پوچھ رہے تھے۔ آیئے، ہمارے پاس بیٹھیے، یہ بات ہوئی۔ ہاں تو برادر، فسانۂ عجائب کا متن تین سو صفحوں میں آیا ہے اور ملحقات چار سو صفحوں میں، اس صورت میں...''(اظہار، بمبئی، 1984)

صائمہ اس وقت سوا تین سال کی تھی۔ خان صاحب آتے تو وہ چپکے سے آ کر ان کے پیچھے کھڑی ہو جاتی۔ میں اشارے سے ان کو اس کی طرف متوجہ کرتا تو وہ آہستہ سے کہتے، ''دیکھ رہا ہوں'' اور مجھ سے باتیں کرتے رہتے، پھر پوچھتے، ''آج صائمہ نہیں ہیں؟'' بچی اچانک ان کے سامنے آ جاتی اور وہ گویا چونک کر اس کی طرف متوجہ ہو جاتے۔

اس وقت خان صاحب کے خطوں میں صائمہ کا ذکر بار بار ہوتا تھا، مثلاً:

''صائمہ کو پیار۔ بہت پیاری بچی ہے۔''

''بچی کی طبیعت اب کیسی ہے؟ آپ کا خط چونکہ نہیں آیا اس لیے تشویش ہے۔ براہ کرم صورت حال سے مطلع کیجیے۔''

صائمہ کی یہ بیماری طول کھینچ گئی تھی۔ ایک بار اس کی حالت کچھ زیادہ بگڑ گئی۔ بار بار غفلت طاری ہو جاتی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے غفلت سے چونک کر کہا، ''ہمیں خان چاچا کے پاس بھیج دیجیے۔'' جب خان صاحب کو میں نے یہ واقعہ بتایا تو انھوں نے صائمہ کو بیٹی بنا لیا، اور مجھے لکھا:

''صائمہ اب ٹھیک ہیں، اس سے بے حد مسرت ہوئی۔ خود آکر ان کی ضدیں دیکھوں گا۔''

زمانہ وہ تھا کہ فسانۂ عجائب کا قضیہ زوروں پر تھا۔ یہ کتاب دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی طرف سے تیار کی گئی تھی اور اس کی تدوین کا سارا کام تنہا رشید حسن خاں نے کیا تھا، مگر شعبے کا اصرار تھا کہ اس پر مرتب کی حیثیت سے شعبۂ اردو کا نام دیا جائے اور دیباچے میں خان صاحب کا شکریہ ادا کر دیا جائے کہ کتاب کی تیاری میں سب سے زیادہ حصہ ان کا ہے۔ خان صاحب اس پر راضی نہیں تھے اور اس قضیے کی وجہ سے عرصے تک کتاب کی اشاعت التوا میں پڑی رہی۔ اس زمانے میں ان کے خطوں میں اس کا حوالہ بہت ہوتا تھا۔ اسی زمانے میں ان کا ایک خط صائمہ کے نام آیا۔ شفقت آمیز خط تھا جیسا بچوں کو لکھا جاتا ہے۔ میں صائمہ کو خط پڑھ کر سنا رہا تھا کہ اچانک خان صاحب کا تخاطب مجھ سے ہو گیا اور کچھ اس طرح: ''صاحب فسانۂ عجائب تیار ہے، لیکن یہ شعبے کے مخلندوس، گودڑ کے فلاں ...'' وغیرہ، اور اسی طرح کے نادر خطابات سے خط بھرا ہوا تھا۔

2 مارچ 1991 کا لکھا ہوا ایک خط میرے سامنے ہے:

''12 مارچ کو منگل کے دن حاضری دوں گا... اگر صبح تڑکے والی گاڑی مل گئی تو پھر ناشتا آپ کے ساتھ ہوگا، ورنہ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب پہنچوں گا۔ اسٹیشن سے سید حادین دیال روڈ، وہاں سے امین آباد اور پھر وہاں سے اسٹیشن۔ یہ سب یوں لکھا ہے کہ (1) آپ صائمہ کو مطلع کر دیں، (2) ناشتے کا انتظام یا اہتمام احتیاطاً کر رکھیں۔'' (اب صائمہ اتنی بڑی ہو چکی تھی کہ خان صاحب کے ناشتے کے لیے کوئی چیز خود پکاتی تھی۔)

یکم نومبر 1996 کے خط میں لکھتے ہیں:

Scanned with CamScanner

''صائمہ اور ثمرہ کو دعائیں۔ دونوں سے کہیے کہ نیا سال بس آنے ہی والا ہے۔''

ثمرہ میری چھوٹی بیٹی ہے۔ 1996 میں وہ نو سال کی ہوگئی تھی۔ صائمہ کی دیکھا دیکھی وہ بھی خان صاحب کی بیٹی بن بیٹھی تھی۔ دونوں بچیاں باقاعدہ سے خان صاحب کو نئے سال کا (اور کبھی عید کا بھی) کارڈ بھیجتی تھیں۔ خان صاحب ان تہنیت ناموں کا بڑی محبت سے جواب دیتے اور خود بھی کارڈ بھیجتے تھے۔ اگر کسی وجہ سے کارڈ نہیں پہنچتا تھا تو یاددہانی کراتے تھے، مثلاً:

''صائمہ کو بہت سی دعائیں اور ثمرہ کو بھی۔ دونوں نے دنوں سے خبر نہیں لی۔ میں بھی خط نہیں لکھ سکا اس آنے جانے کی رواروی میں اور ہنگاموں میں۔ انھوں نے معمول کے خلاف اب کے نئے سال کا کارڈ بھی نہیں بھیجا۔'' (23 اکتوبر 1997)

اب رشید حسن خاں کی صحت گر گئی تھی۔ اس کے بعد وہ مکمل تندرست نہیں رہے، لیکن اسی حال میں انھوں نے تدوین کے کئی کارنامے انجام دیے اور صائمہ، ثمرہ کو خط بھی لکھتے رہے۔ جب صائمہ نے ایک ٹوٹا پھوٹا افسانہ لکھا تو خان صاحب نے ڈاک کے ذریعے اسے ایک نوٹ انعام میں بھیجا۔ اس کے بعد وہ صائمہ کی تصنیفی سرگرمیوں کے بارے میں برابر پوچھتے تھے۔

کچھ خط حسب ذیل ہیں:

(8 جنوری 97ء)

''ثمرہ بیٹی کو بہت سی دعائیں۔ نیا سال مبارک!

تمھارا بہت پیارا خط ملا۔ پڑھ کر میرا جی بہت خوش ہوا۔ تم نے بہت اچھا خط لکھا ہے۔ جیتی رہو اور خوش رہو۔ تمھاری سالگرہ پر تم کو بہت سے تحفے ملے، اس کا حال پڑھ کر بہت زیادہ خوشی ہوئی۔ میں تو وہاں تھا نہیں اور تم نے مجھے سالگرہ کا بتایا بھی نہیں، ورنہ میں بھی کوئی تحفہ دیتا۔ سالگرہ تو نکل گئی، اب تو وہ ایک سال بعد آئے گی، مگر عید آنے والی ہے۔ تمھاری عیدی کے -/30 اس لفافے میں رکھ دیے ہیں۔ انھیں اپنے پاس رکھنا اور اپنی امی کو نہ دینا، نہیں تو وہ بینک میں جمع کردیں گی۔

اس گھر میں ہماری ایک اور بھتیجی بھی تھی۔ نام تھا صائمہ۔ تم اُن کو جانتی ہو؟ ان سے تمھاری ملاقات ہوتی ہے؟ اگر کسی دن ملاقات ہو تو میری طرف سے بہت سی دعائیں پہنچا دینا۔ تمھارے ایسے ہی پیارے سے خط کا انتظار رہے گا۔ رشید حسن خاں''

Scanned with CamScanner

(13 جنوری 1998)

''پیاری بیٹی صائمہ کو دعائیں!

آج ہی تمھارا بھیجا ہوا کارڈ ملا۔ بہت خوشی ہوئی۔ تم کیسی ہو؟ پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟ تمھارا تو نام ہی ''صائمہ'' ہے۔ یوں تم تو روزے ضرور رکھ رہی ہوگی۔ اب تو سردی کا موسم ہے۔ روزے رکھنا کچھ ایسا مشکل بھی نہیں۔ اللہ میاں تو بہت اچھے اور مہربان ہیں، اسی لیے انھوں نے اپنے بندوں کو بہت سی آسانیاں دی ہیں، خاص کر بچوں کو اور لڑکیوں کو، کہ وہ روزہ رکھ کر بھی چائے پی سکتی ہیں اور سب سے چھپ کر پانی بھی پی سکتی ہیں۔ بس کھانا نہیں کھا سکتیں۔ ہاں لڑائی جھگڑا کرنے پر پابندی ہے، مگر مار پیٹ پر کچھ پابندی نہیں۔

اور ہاں، تم نے کیا مضمون لکھنا اور کہانی لکھنا چھوڑ دیا ہے؟ تم نے اِدھر میرے پاس اپنی لکھی ہوئی کوئی چیز بھیجی نہیں۔ مجھے تو بہت انتظار رہتا ہے۔ کہانیاں لکھنا بہت اچھی بات ہے۔ اب جب کوئی مضمون یا کہانی لکھنا تو مجھے ضرور اطلاع دینا۔ مجھے اس سے بہت خوشی ہوگی۔ بہت سی دعاؤں کے ساتھ۔ رشید حسن خاں''

(30 مارچ 1998)

(''صائمہ کو الگ سے خط لکھوں گا۔ ان کے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانا ضرور کھاؤں گا۔ اس کام کو مکمل کرتے ہی وہاں آؤں گا۔ صائمہ کو مجھ سے ضرور شکایت ہوگی، مگر مطمئن رہیے۔ بہت آسانی سے انھیں منا لوں گا۔ وہ بہت اچھی بٹیا ہے۔'')

(30 مارچ 1998)

''صائمہ کو بہت بہت دعائیں!

توقع ہے کہ تم اچھی طرح ہوگی اور امتحان کی تیاری پوری طرح ہو چکی ہوگی۔ تمھارے ہاتھ کا کھانا کھانے کو بہت جی چاہتا ہے، مگر یہ جانتا ہوں کہ تم آج کل امتحان کی تیاری میں لگی ہوگی، اس

لیے تم کو دو دِلا نہیں کرنا چاہتا۔ جب تم امتحان سے فرصت پالوگی، تب آؤں گا، تاکہ تم اطمینان سے بہت عمدہ کھانا تیار کرسکو۔

ثمرہ کیسی ہیں؟ ان کو بھی دعائیں۔ ان کا بھی امتحان ہو رہا ہوگا۔ ان کو اکثر یاد کرتا ہوں۔ اور ہاں، تم نے ایک دفعہ کے بعد پھر اپنی کوئی تحریر نہیں بھیجی۔ کیا اس کے بعد کچھ نہیں لکھا؟ اب میں نے یہ طے کرلیا ہے کہ جب تم پہلے کی طرح کچھ لکھ کر بھیجو گی تب ہی وہاں آؤں گا۔ بہت سی دعاؤں کے ساتھ۔ رشید حسن خاں"

(11 جنوری 1999)

"پیاری بیٹی صائمہ کو بہت سی دعائیں!

تمھارا بھیجا ہوا کارڈ ملا۔ ایسا خوبصورت کارڈ ہے کہ آنکھوں کی روشنی بڑھ گئی اسے دیکھ کر۔ جیتی رہو اور ہمیشہ خوش رہو۔ دعا کرتا ہوں کہ یہ نیا سال تمھارے لیے کامیابی، مسرتیں اور راحتیں لائے۔ امتحان میں امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کرو۔ اپنی امی سے میرا سلام کہو۔ تم مجھے ہمیشہ یاد آتی ہو۔ اب یہ میری کاہلی ہے کہ تم کو کارڈ نہیں بھیج پاتا، کیا کروں! مگر یہ بات ضرور ہے کہ ہر نئے سال کی آمد پر دل میں یہ خیال ضرور آتا ہے کہ صائمہ بٹیا کا کارڈ آتا ہی ہوگا۔ بہت دن جیو، بہت خوش رہو۔ بہت سی دعاؤں کے ساتھ۔ رشید حسن خاں"

(11 جنوری 1999)

"پیاری بٹیا ثمرہ کے لیے ہزاروں دعائیں اور بے شمار نیک تمنائیں!

تمھارا بھیجا ہوا بہت پیارا کارڈ ملا، جسے دیکھ کر تمھارے لیے دل سے دعا نکلی۔ تم مجھ کو یاد رکھتی ہو اور یاد بھی کرتی ہو۔ ہر نیا سال تمھاری محبت کا نیا پیغام لے کر آتا ہے۔ کسی شخص کے لیے اس سے بڑھ کر خوشی کی بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ اس کو یاد رکھا جائے۔ تمھارے لیے بہت سی دعائیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم اسی طرح ہمیشہ نئے سال پر اپنے خان چاچا کو یاد کرتی رہوگی۔ خدا تم کو ہمیشہ خوش رکھے۔ اپنی امی سے میرا سلام کہو اور اپنے ابو سے بھی۔ رشید حسن خاں"

Scanned with CamScanner

(18 جنوری 1999)

"عزیزہ صائمہ!

میرے دونوں خط تم کو اور ثمرہ کو مل گئے ہوں گے۔ میری پوتی سعدیہ نے تم دونوں کے لیے اپنے ہاتھ سے کارڈ بنائے تھے۔ وہ بھیج رہا ہوں۔ سعدیہ چوتھے درجے میں پڑھتی ہیں اور تم دونوں کو پیار بھرا سلام کہہ رہی ہیں۔ رشید حسن خاں"

(11 جنوری 2000)

بہت پیاری بھتیجیوں صائمہ اور ثمرہ کو بہت بہت دعائیں!

آج تمھارا عید کارڈ ملا۔ بہت جی خوش ہوا اور تم دونوں کے لیے دل سے دعائیں نکلیں کہ خدائے پاک تم کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے، بہت لائق و فائق بنائے اور بہت شہرت عطا کرے کہ تم اپنے گھر کا نام اور روشن کر سکو۔

یہاں سردی بہت پڑ رہی ہے، وہ بات کہ:

صبح نکلے ہے کانپتا خورشید

دن بھر انگیٹھی کے پاس بیٹھا رہتا ہوں۔ لکھنا پڑھنا سب بند ہے دس بارہ دن سے۔ وہاں کا احوال بھی ایسا ہی ہوگا۔ تمھاری تعلیم و تربیت کا احوال تو معلوم ہے، مگر تمھاری مضمون نگاری کا حال دنوں سے معلوم نہیں ہوا۔ بہت دن ہوئے جب تم نے ایک مضمون بھیجا تھا، جسے پڑھ کر بہت مسرت ہوئی تھی۔ اب تک تو کئی اچھے مضمون جمع ہو گئے ہوں گے۔ میں اس دن کا بہت شوق کے ساتھ انتظار کروں گا جب تمھارے مضمون رسالوں میں پڑھوں گا اور پھر تمھاری کتابیں دیکھوں گا۔

اپنی امی سے میرا سلام کہو۔ خدا تم کو ہمیشہ شاد باد رکھے اور تم اسی طرح مجھے مبارکباد کے کارڈ بھیجتی رہو۔ رشید حسن خاں"

(8 جنوری 2000)

"پیاری بیٹی صائمہ کو ڈھیر ساری دعائیں!

Scanned with CamScanner

تمھارا بھیجا ہوا کارڈ مل گیا۔تم ہمیشہ یاد رکھتی ہو اور یاد کرتی ہو۔تمھارے لیے دل سے دعا نکلتی ہے کہ تم خوب پڑھو، خوب لکھو اور ہمیشہ خوش وخرم رہو اور ترقی کرتی رہو۔

کارڈ بہت خوبصورت ہے۔ میں نے اسے حفاظت کے ساتھ اپنی میز کے شیشے کے نیچے محفوظ کرلیا ہے۔ بہت سی دعاؤں کے ساتھ۔رشید حسن خاں"

(23اگست 2000)

"عزیزہ صائمہ! دعائیں۔

اسلم محمود صاحب کا خط کل آیا تھا۔اس سے معلوم ہوا کہ نیر مسعود صاحب بیمار ہیں اور اسپتال میں داخل ہیں۔اس سے بہت تشویش ہوئی۔تم پوری صورت حال لکھ کر بھیجو کہ اب وہ کیسے ہیں۔ خدا کرے بالکل ٹھیک ہو چکے ہوں۔رشید حسن خاں"

(31 دسمبر 2002)

"پیاری بٹیا ثمرہ کو درازیِ عمر کی بہت سی دعائیں!

کارڈ ملا۔ میں تو بس انتظار ہی کر رہا تھا کہ ثمرہ کا کارڈ آتا ہی ہوگا۔ کیسا جی خوش ہوتا ہے تمھارا کارڈ پا کر۔تم یاد رکھتی ہو اپنے خان چاچا کو اور یاد کرتی ہو اس موقعے پر، اس لیے نئے سال کے ساتھ تمھاری یاد بھی آتی ہے اور دل سے دعا نکلتی ہے۔ خدا تم کو ہمیشہ خوش رکھے اور تم ہر سال اسی طرح یاد کرتی رہو۔رشید حسن خاں"

(31 دسمبر 2002)

"پیاری بیٹی صائمہ کو بہت بہت دعائیں!

کارڈ ملا۔اب میں ایسا کارڈ کہاں سے لاؤں۔یوں خط لکھ رہا ہوں۔تم تو اب بڑی ہو گئی ہو گی۔اچھے اچھے کھانے بھی پکانے لگی ہو گی (اپنے گھر کی روایت کے مطابق)۔کوشش کروں گا کہ کبھی وہاں آ کر تمھارے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھاؤں اور تم کو دعائیں دوں۔

Scanned with CamScanner

ہر سال کے خاتمے پر اپنے آپ یہ خیال دل میں آ جاتا ہے کہ صائمہ کا کارڈ آتا ہوگا اور وہ آ جاتا ہے۔ جیتی رہو اور ہمیشہ خوش رہو۔ نیا سال مبارک ہو۔ رشید حسن خاں"

حقیقتاً صائمہ بڑی ہوگئی تھی، اتنی کہ یہ خط ملنے کے دوسرے سال 20 مئی 2003 کو اس کی شادی ہوگئی۔ شادی کا کارڈ رشید حسن خاں کو بھی گیا۔ میں نے کارڈ پر یہ بھی لکھ دیا کہ" آپ کی بیٹی رخصت ہو رہی ہے۔ اسے دعائیں دیجیے۔" 30 مئی کو خان صاحب کا خط آیا:

"نیر صاحب! آداب۔

آج ہی لفافہ ملا۔ اگر ذرا سی سکت ہوتی تو صائمہ کو رخصت کرنے والوں میں ضرور شامل ہوتا۔ میرے لیے اس بچی کی رخصت شاید بہت زیادہ مسرت کی بات ہے کہ وہ اپنی حقیقی زندگی شروع کرے گی۔ خدائے پاک اسے ہمیشہ شادمان و کامران رکھے، اسے نعمتوں سے نوازے اور اس کے شریک حیات کو خوش و خرم اور بامراد رکھے۔

یہ موقع مسرت و غم کا عجیب آمیزہ ہوتا ہے کہ گھر کی رونق جانے کا غم اور ایک اور گھر کی رونق بڑھانے کی دعائیں۔ انسانی زندگی شاید ایسے ہی تضادات سے عبارت ہے۔ جب بھی عید آئے گی اور نیا سال آئے گا، صائمہ مجھے بہت یاد آیا کرے گی۔ میں اسے واقعتاً اپنی بیٹی جیسا سمجھتا رہا ہوں۔ وہ جس طرح مجھے یاد رکھتی تھی، اس کا نقش میرے دل پر ہمیشہ رہے گا۔ خدا اسے ہر حال میں ہمیشہ خوش رکھے اور اپنی نعمتوں سے نوازے اور بہت کامیاب زندگی بسر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ رشید حسن خاں"

صائمہ نے اپنی شادی سے کچھ دن پہلے دو تین افسانے لکھ کر مقامی اخبار میں چھپوائے تھے۔ اپنی سسرال (دہلی) سے اس نے رشید حسن خاں کو ان افسانوں کی عکسی نقلیں بھیجیں۔ عید اور سال نو کے کارڈ بھی ان کو بھیجتی رہی۔ یکم دسمبر 2004 کو اس کے یہاں بیٹا ہوا، اس کی تصویر بھی خان صاحب کو بھیجی۔ خان صاحب کو ان میں سے جو چیز بھی ملی اس کی رسید میں انھوں نے بہت محبت بھرا خط لکھا۔ لیکن یہ خط دہلی بھیجے گئے تھے اور مجھے دیکھنے کو نہیں ملے۔ البتہ جنوری 2005 میں اس نے اور ثمرہ نے انھیں لکھنؤ سے نئے سال کے کارڈ بھیجے اور ان کا جواب لکھنؤ ہی کے پتے پر آیا:

(12 جنوری 2005)

Scanned with CamScanner

"پیاری بیٹیوں صائمہ اور ثمرہ کو بہت بہت دعائیں!

میں کئی دن سے سوچ رہا تھا کہ اب کے صائمہ نے بھلا ہی دیا اور ثمرہ نے بھی انھی کا ساتھ دیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہوا۔ ہر سال کے شروع ہی میں آنکھیں دروازے پر لگی رہتی ہیں کہ صائمہ اور ثمرہ کا لفافہ آتا ہی ہوگا جو اس قدر خوبصورت ہوگا کہ اسے دیکھتے ہی آنکھوں کی روشنی بڑھ جائے گی۔ کئی دن گذر گئے اور کوئی ایسا لفافہ نہیں آیا جسے دور ہی سے دیکھ کر آنکھیں پکار اٹھیں کہ اسے تو ہماری بیٹیوں نے بھیجا ہے۔ سوچتا رہا، سوچتا رہا، پھر اچانک کل گیارہ جنوری کو وہ لفافہ آ گیا، جی خوش ہو گیا اسے دیکھتے ہی۔ دل سے دعا نکلی کہ تم دونوں ہمیشہ خوش وخرم رہو، یہ سال بھی خوشی کا پیام لانے والا بن جائے اور ہر سال زندگی میں کامیابی اور مسرت کا اضافہ کرتا رہے۔ اپنی امی سے بھی میرا سلام کہو...... بہت سی دعاؤں کے ساتھ۔ رشید حسن خاں"

اس سال 2006 میں ثمرہ نے لکھنؤ سے اور صائمہ نے دہلی سے خان صاحب کو تہنیتی کارڈ بھیجے۔ ثمرہ کے کارڈ کا جواب آ گیا۔ (صائمہ کا لفافہ معلوم نہیں کیوں اس کے پتے پر واپس آ گیا۔) ثمرہ کے نام خط میں ان کی تحریر ذرا بگڑی ہوئی ہے۔ اپنا نام بھی انھوں نے خلاف معمول پورا نہیں لکھا۔ خط حسب ذیل ہے:

(6 جنوری 2006)

"پیاری بٹیا ثمرہ! ہمیشہ خوش رہو۔

پرسوں تمھارا بھیجا ہوا بہت خوبصورت کارڈ ملا۔ بہت جی خوش ہوا۔ دل سے دعا نکلی کہ تم ہمیشہ خوش وخرم اور بامراد رہو۔ میری طرف سے بھی نیا سال تم کو اور گھر کے سب لوگوں کو مبارک ہو۔ دعا یہ ہے کہ یہ آنے والا سال پچھلے سال کی طرح نہ ہو۔

صائمہ کہاں ہیں؟ ان کو میں نے اب کے بہت یاد کیا۔ میں دعا کرتا ہوں کہ تم اور صائمہ دونوں اپنے متعلقین کے ساتھ ہمیشہ عافیت کے ساتھ رہو۔ اپنی امی اور اپنے ابا سے میرا سلام کہو۔ تمھارا چاچا رشید حسن"

یہ خط لکھنے کے ایک مہینے بیس دن بعد 26 فروری کو رشید حسن خاں کی وفات ہو گئی۔ واقعی یہ سال پچھلے سال کی طرح نہیں ہے۔ وہ سال جس میں رشید حسن خاں نہ ہوں، پچھلے سال کی طرح

Scanned with CamScanner

کیونکر ہو سکتا ہے۔

خود میرے نام رشید حسن خاں کے بہت سے دلچسپ اور بے تکلفانہ اور عالمانہ خط ہیں۔ اس طرح کے خط اور بھی بہتوں کے نام ہوں گے۔ لیکن یہ خط جو خان چاچا نے اپنی بھتیجیوں کو لکھے ہیں، مجھے ان کے عام خطوں سے زیادہ عزیز ہیں۔

❁❁

Scanned with CamScanner

الہ آباد

(بہ حوالۂ ادیب)

لکھنؤ ادیب کا مسکن تھا۔ اُن کو اس شہر سے ایک ربط خاص رہا ہے۔ لکھنؤ کے علاوہ ان کو جس شہر سے سب سے زیادہ ربط رہا اور جس کا اُن کی شخصیت اور ادبی زندگی کی تشکیل میں اہم کردار رہا، وہ الہ آباد ہے۔

ادیب نے بی اے کی تعلیم کیننگ کالج لکھنؤ میں حاصل کی۔ اس وقت بی اے کا امتحان الہ آباد یونیورسٹی لیتی تھی۔ ادیب نے بھی بی اے کا امتحان الہ آباد یونیورسٹی سے پاس کیا اور وہ الہ آباد کے گریجویٹ تھے۔ بی اے کرنے کے بعد انھوں نے انگریزی میں ایم اے کرنے کا ارادہ کیا، لیکن پہلے سال کا امتحان دینے سے پہلے وہ بیمار ہوگئے اور خاطر خواہ تیاری نہیں کر سکے اس لیے انھوں نے امتحان نہیں دیا۔

اسی زمانے میں حکومت کے محکمۂ تعلیم (پبلک انسٹرکشن) کی طرف سے اس کے کیٹلاگ ڈپارٹمنٹ میں مبصر کی جگہ کا اشتہار نکلا۔ ادیب نے اس جگہ کے لیے درخواست دے دی اور محکمے کے انگریز ڈائرکٹر سے ملے۔ اس نے کچھ سوالات کر کے ان کا تقرر کر دیا۔ ان کی تنخواہ سو روپے ماہوار مقرر ہوئی۔

اپریل 1918 میں ادیب نے یہ ملازمت اختیار کر لی۔ اب وہ الہ آباد میں رہنے لگے۔ ان کی سکونت محلہ رانی منڈی میں تھی۔ الہ آباد کا یہ قیام ان کی زندگی کا اہم دور ثابت ہوا۔ خود ان کا بیان ہے:

میری ادبی زندگی کا سب سے اہم واقعہ میری پہلی سرکاری ملازمت ہے جس میں کام یہ تھا

Scanned with CamScanner

کہ اس صوبے میں جتنی کتابیں کسی موضوع پر کسی زبان میں چھپیں ان کی موضوع وار وضاحتی فہرست تیار کر کے ہر سہ ماہی میں صوبے کے سرکاری گزٹ میں شائع کی جائے اور عوام کے خیالات کا رجحان معلوم کرنے کی غرض سے ان پر تبصرے لکھے جائیں۔ اس ملازمت کی بدولت مختلف موضوعوں پر چھوٹی بڑی کوئی دس ہزار کتابیں نظر سے گذریں۔ اس طرح میری نظر میں وسعت اور دل میں تالیف و تصنیف کا شوق پیدا ہوا اور ادبی مشاغل کی نئی نئی راہیں دکھائی دیں۔

ان کتابوں میں مختلف موضوعات، مذہبیات، اخلاقیات، شعر و شاعری، افسانہ و ناول سے لے کر تاریخ و جغرافیہ، اور دوسرے علوم و فنون پر اردو، ہندی، فارسی، انگریزی میں کتابیں شامل تھیں۔ ادیب نے ان سب کو پڑھا اور ان پر تبصرے لکھے۔ ہندی وہ معمولی طور پر جانتے تھے۔ اب اس ملازمت کی خاطر انھوں نے الہ آباد میں ایک پنڈت کو ملازم رکھ کر ان سے باقاعدہ ہندی پڑھی۔ تلسی داس کی رام چرت مانس ان کو خاص طور پر پسند آئی۔ اس کے بعض حصے ان کو زبانی یاد ہو گئے اور وہ انھیں رامائن کی مخصوص دھن میں سنایا کرتے تھے۔

الہ آباد کے اس قیام میں ادیب کو کتابوں کے علاوہ مختلف لوگوں کا بھی تجربہ ہوا۔ ان میں سب سے اہم شخصیت پنڈت شمبھو ناتھ سکل (شکل) کی تھی۔ ادیب نے اپنی زندگی کے اہم واقعات میں پنڈت جی کی محبت کا بھی شمار کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> سررشتۂ تعلیم کا یہ شعبہ جس میں میں کام کرتا تھا اس کے سپرنٹنڈنٹ پنڈت شمبھو ناتھ سکل ایک بڑے ذی علم اور بلند خیال بزرگ تھے۔ وہ ہندوستان کی مختلف زبانوں سے واقف تھے، فارسی اور سنسکرت میں اچھی دستگاہ تھی، انگریزی لکھنے اور بولنے میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے، انگریزی کے اچھے شاعر تھے، اردو اور ہندی میں بھی شعر کہہ سکتے تھے۔ انھوں نے اپنے ایک خاندانی سرپرست کے انتقال پر ایک بڑا دردناک مرثیہ ہندی میں کہا تھا جس کا آخری شعر مجھ کو اب تک یاد ہے:
>
> پربھو ور بیٹھے سورگ میں دور پرے سکلیس
> کوئی جائے سنائیے اپنو سوگ سندیس

Scanned with CamScanner

پنڈت جی اپنی غیر معمولی قابلیت کے علاوہ ایک ایسی شاندار، بے باک اور بے مثل شخصیت کے مالک تھے جس کو میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ تین چار برس چھ سات گھنٹے روزانہ ان کا ساتھ رہا اور میں نے ان سے بہت کچھ حاصل کیا۔

پنڈت جی بے تحاشا دنیا دیکھے ہوئے تھے۔ اپنے عہد کی بے شمار اہم شخصیتوں سے مل چکے تھے اور اُن کے دلچسپ حالات سناتے تھے۔ ان میں پہلوانوں سے لے کر ادیب اور مرتاض فقیر تک شامل تھے۔ ادیب کو وہ ہم مذاقی کی وجہ سے بہت دوست رکھتے اور ان کو "میر صاحب" کہتے تھے۔ وہ انگریزی میں سگما (Sigma) کے قلمی نام سے نظمیں وغیرہ لکھتے تھے۔ ان کا ایک مجموعہ بھی ادیب کے پاس تھا۔ ادیب پنڈت جی کے واقعات بہت سناتے تھے۔ مثلاً بھارتیندو ہریش چندر سے ان کی پہلی ملاقات کا حال خود پنڈت جی کی زبانی بیان کرتے تھے:

جب میں بھارتیندو سے ملنے پہنچا تو وہ زرد پتامبر کی دھوتی باندھے کھڑاویں پہنے بیٹھے تھے۔ باتیں کرتے کرتے انھوں نے مجھ کو اپنے ہاتھ دکھائے اور ہتھیلیاں مسل مسل کر کہنے لگے: "جانتے ہو انھی ہاتھوں سے نو لاکھ روپیا خرچ کر چکا ہوں، نو لاکھ!" اور واقعی بھارتیندو بڑے ہی شاہ خرچ تھے۔ ان کے پاس سیکڑوں قسم کے تحفے ہر وقت موجود رہتے تھے۔ جو بھی ان سے ملنے جاتا اسے اس کے مرتبے اور مزاج کے مطابق کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور دیتے تھے۔ مثلاً آپ [ادیب] ان سے ملنے جاتے تو وہ آپ کو کوئی بہت عمدہ کتاب یا خوش خط لکھا ہوا قطعہ تحفے میں دیتے، اور اگر ملنے والا کوئی عام سا آدمی ہوتا جس کے لیے کوئی مناسب تحفہ سمجھ میں نہ آتا تو اسے عطر کی شیشی دیتے تھے۔

غلام پہلوان سے ملاقات کا حال یوں بیان کرتے تھے:

پہلوان نے اپنا ہاتھ مجھے دکھایا۔ ہاتھ کیا تھا پتھر تھا جس پر چھوٹی چھوٹی بوٹیاں ابھری ہوئی تھیں جیسے اندر کا گوشت کھال کو توڑ کر باہر آنا چاہ رہا ہو۔ میں نے کہہ دیا، "پہلوان، مجھے تمھارا ہاتھ بالکل پسند نہیں آیا۔" پہلوان نے ہنس کر پوچھا، "وہ کیوں پنڈت جی؟" میں نے کہا، "یہ کسی آدمی کا ہاتھ معلوم ہی نہیں ہوتا۔"

غالباً اسی نشست میں پنڈت جی نے شہباز خان نامی پہلوان سے غلام کی کشتی کا واقعہ بھی سنایا تھا۔ اس

Scanned with CamScanner

مقابلے کی بہت پہلے سے دھوم مچی ہوئی تھی۔ تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ کشتی شروع ہوئی۔ غلام کا قد چھوٹا تھا اور ان کا حریف ان سے وں ڈیڑھ دو گنا اونچا تھا۔ کچھ دیر تک داؤ پیچ ہوتے رہے۔ غلام اپنے داؤں کی تاک میں تھے۔ آخر انھوں نے شہباز خان کو دھوبی پاٹا مار کر چت کر دیا۔ دھوبی پاٹے میں حریف کو اپنی پشت پر لاد کر آگے کی جانب پٹختے ہیں۔ چھوٹے قد کے آدمی کا لمبے قد والے کو دھوبی پاٹا مارنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ غلام کی اس کشتی کا بہت دن تک ہندوستان میں چرچا ہوتا رہا۔

پنڈت جی نے کسی سے مرعوب ہونا نہیں سیکھا تھا۔ ایک بار ان کے ایک انگریز افسر نے ہندوستان کے روایتی نظام تعلیم پر اعتراض کرتے ہوئے اسے ناقص ٹھہرایا، پنڈت جی نے جواب دیا:

''صاحب، ہمارا تعلیمی نظام ہزاروں برس سے جوں کا توں چلا آ رہا ہے اور اس نے کیسے کیسے وِدوان پیدا کر دیے، ہمیں اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں پڑی۔ ایک آپ کا نظام ہے کہ آئے دن بدلا جاتا ہے اور آپ کو اطمینان نہیں ہوتا۔''

اسی شعبے میں مسٹر فلپس اور ایک اور اینگلو انڈین تھے۔ فلپس خوبصورت آدمی تھے۔ دوسرے صاحب بہت کم رُو تھے لیکن کبھی کبھی غصے میں آ کر اپنی خاندانی وجاہت جتانے لگتے۔ فلپس اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے خاص انداز سے کہتے:

''ابے، اپنی صورت تو دیکھ!''

دفتر کے لوگ انگریز افسر کے حکم نامے وغیرہ شارٹ ہینڈ میں لکھتے، پھر جب انھیں ٹائپ کرنے بیٹھتے تو بار بار اٹھ کر پنڈت جی کے پاس جاتے:

''ارے دادا، دیکھو یہ ہم کیا لکھ لائے ہیں۔''

اور پنڈت جی عبارت پر غور کر کے صحیح لفظ بتا دیتے۔ مسٹر فلپس نے ایک بار پنڈت جی سے فرمائش کی:

''دادا، ہمارے مکان کے لیے کوئی اچھا سا نام بتاؤ۔''

پنڈت جی نے فوراً کہا:

''فلپائنس رکھ لو۔''

سنہ 61 کے آس پاس میں نے الہ آباد کے ایک بنگلے پر اس کا نام فلپائنس لکھا ہوا دیکھا تھا۔

ادیب حسین آباد ہائی اسکول لکھنؤ میں اپنے استاد مولوی سید جواد کے بعد پنڈت جی کی

Scanned with CamScanner

شخصیت کا بہت ذکر کرتے تھے اور ان سے بہت متاثر تھے۔ غالباً بنارس میں پنڈت جی کی وفات ہوئی۔ ان کے بیٹے کبیر ناتھ سکل سے ادیب کی خط کتابت بھی ہوئی تھی۔

❁

الہ آباد کی ملازمت کے زمانے میں عبدل نام کا ایک نوجوان ادیب کا ذاتی ملازم تھا۔ یہ بھی عجیب و غریب شخصیت کا مالک تھا۔ ناممکن کا لفظ شاید اس کے بھی لغت میں نہیں تھا۔ ایک بار کسی سپیرے کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس سے معلوم نہیں کیا باتیں کیں کہ اس نے اپنے پاس سے ایک بوٹی اس کو دے دی۔ وہ لیے ہوئے ادیب کے پاس آیا کہ آپ کو تماشا دکھاؤں۔ یہ کہہ کر اس نے بوٹی اپنے ہاتھ پر باندھ لی۔ رومال میں ایک بھڑ پکڑ رکھی تھی، اسے نکال کر اپنے ہاتھ سے لگایا۔ ادیب بتاتے تھے کہ بھڑ بار بار عبدل کے ڈنک مارتی تھی مگر ڈنک اِدھر اُدھر پھسل جاتا تھا اور جلد میں داخل نہیں ہونے پاتا تھا۔ عبدل کو مزید آزمائش کے لیے بچھو کی تلاش تھی، مگر وہ اس کو ملا نہیں۔

عبدل اَن پڑھ تھا لیکن حساب لگانے میں بہت تیز تھا۔ ایک بار ادیب نے اس سے یہ مشہور سوال حل کرنے کو کہا:

''اسی من کا لکڑ، اس پر بیٹھا مکڑ، رتی رتی روز کھائے تو کتنے دن میں کھائے؟''

آٹھ رتی کا ایک ماشہ، بارہ ماشے کا ایک تولہ، پانچ تولے کی ایک چھٹانک، چار چھٹانک کا ایک پاؤ، چار پاؤ کا ایک سیر، چالیس سیر کا ایک من اور اسی من کا لکڑ تھا جو ایک ایک رتی کر کے کھانا تھا۔ ہم لوگ بچپن میں کاغذ قلم لے کر بھی یہ سوال حل نہیں کر پاتے تھے، لیکن عبدل اس کا حل نکالنے پر تُل گیا۔ ایک تنکے سے مٹی پر بہت دیر تک لکیریں کھینچ کھینچ کر حساب لگاتا رہا۔ پھر ادیب کے پاس آیا اور بولا:

''دو کروڑ پینتالیس لاکھ چھہتر ہزار دن میں۔''

ادیب نے کاغذ پنسل لے کر حساب لگایا اور عبدل کے جواب کو صحیح پایا۔

علی عباس حسینی اور مرزا حامد حسین (جو بعد کو ادیب کے بہنوئی ہوئے) لکھنؤ کے شیعہ بورڈنگ ہاؤس میں ادیب کے ساتھی تھے۔ یہ دونوں 1919 میں ایل ٹی کرنے الہ آباد پہنچے۔ حسینی لکھتے ہیں:

مسعود صاحب اس شہر میں پہلے سے موجود تھے۔ وہ اس وقت صیغۂ تعلیم کے کیٹلاگ

Scanned with CamScanner

ڈپارٹمنٹ میں ملازم تھے اور رانی منڈی میں رہتے تھے۔ میں اور مرزا ہر اتوار اور چھٹی کے دن صبح سویرے مسعود صاحب کے یہاں پہنچ جاتے۔ دن بھر اپنے ہاتھ سے طرح طرح کے کھانے پکاتے اور مختلف ادبی موضوعات پر بحث ہوتی رہتی۔ ہم سب غالب و انیس پرست تھے لیکن ایک دوسرے کو جلانے اور تپانے کے لیے ان اصنام ادب وسخن پر بھی کبھی کبھی خشت باری کر دیتے۔ اس ضمن میں ایک دن مرزا نے کہا کہ بعض حیثیتوں سے ذوق غالب سے بڑے شاعر تھے۔ میں نے کہا، وہ سرے سے شاعر ہی نہ تھے۔ موزوں کر لینا اور چیز ہے اور شعر کہہ لینا اور شے۔ بڑی گرما گرم بحث رہی۔ بالآخر حکم مسعود صاحب بنائے گئے۔

❋

1922 میں ادیب نے چھٹی لے کر الہ آباد کے ٹریننگ کالج میں داخلہ لے لیا اور ایل ٹی کی سند حاصل کی۔ ایل ٹی کرنے کے دوران بھی ادیب کو کچھ دلچسپ ساتھی ملے۔ ایک صاحب آدھی رات کو بورڈنگ ہاؤس کے صحن میں کھڑے ہو کر ادق موضوعات پر تقریر کرتے تھے اور اس میں عجیب و غریب منطق سے کام لیتے تھے۔ ایک بار جاڑے کی رات میں کھڑے ہو کر نعرہ بلند کیا:

''ولچورین فلاسفی!''(Vulturian philosophy)

سب طالب علم جاگ کر ان کے گرد جمع ہو گئے۔ انھوں نے چرگِدوں کے عادات واطوار پر ایک پُرمغز تقریر کی، پھر اس کو انسانوں سے ربط دیا، پھر محکمۂ ڈاک سے، اور آخر میں نتیجہ نکالا کہ ڈاک کی اصطلاح وی پی کا مطلب یہی ''ولچورین فلاسفی'' ہے۔

ایک اور صاحب پیچیدہ صوفیانہ مسائل پر تقریر کرتے تھے، مثلاً ''اور لیا مکڑے نے مکھی کو پکڑ'' خاص مثنوی مولانا روم کی دھن میں پڑھتے اور اس مصرعے کے عرفانی مطالب بیان کرتے، بیچ بیچ میں اسی دھن کے ساتھ ''اور لیا مکڑے نے مکھی کو پکڑ'' ادا کرتے جاتے تھے۔

ادیب اور کچھ دوسرے طالب علم مل کر اپنا کھانا خاصے اہتمام کے ساتھ ایک باورچی سے پکواتے تھے۔ باورچی اتنا تیز دست تھا کہ جب دسترخوان بچھ جاتا تب وہ چپاتیاں پکانا شروع کرتا اور

Scanned with CamScanner

اس تواتر کے ساتھ دسترخوان پر پہنچاتا کہ کسی کو چپاتی کے لیے انتظار نہیں کرنا پڑتا تھا۔ مہینے کے آخر میں کھانے کا حساب ہوتا تھا۔ جتنا خرچ نکلتا وہ سب برابر برابر ادا کر دیتے تھے۔ ایک صاحب اپنا کھانا خود پکاتے تھے، لیکن پکانا نہیں جانتے تھے؛ کچی پکی روٹیاں اور الٹی سیدھی دال ترکاری پکا کر پیٹ بھر لیا کرتے تھے۔ ادیب اور ان کے ساتھیوں کو بے چارے پر بڑا ترس آتا تھا۔ آخر ان سے کہا کہ آپ بھی اپنا کھانا ہمارے ہی ساتھ پکوالیا کیجیے، مہینے مہینے حساب ہو جایا کرے گا۔ وہ بہ خوشی تیار ہو گئے اور اب انھیں بھی باورچی کے ہاتھ کے کباب، قورمہ، پراٹھے ملنے لگے۔ کچھ عرصے بعد وہ سخت بیمار پڑے۔ ساتھیوں نے تیمارداری کا حق ادا کر دیا؛ ڈاکٹر کو جا کر حال بتانا، اپنی جیب سے دوا لانا، پرہیزی غذا کا انتظام کرنا ان لوگوں نے اپنے ذمے لے لیا، اور ان میں سے کوئی نہ کوئی دن رات میں ہر وقت ان کے سرہانے موجود رہتا تھا۔ بارے آٹھ دس دن میں وہ چنگے ہو گئے۔ اُدھر مہینہ بھی ختم ہوا اور کھانے کی فردِ حساب ان کو بھی پیش کی گئی۔ انھوں نے اس کو غور سے پڑھا اور کہنے لگے:

''آپ لوگوں نے میرے نام بھی اتنے ہی پیسے لکھے ہیں جتنے اور سب دے رہے ہیں۔''

جواب دیا گیا کہ یہی تو طے ہوا تھا۔

''لیکن میں تو اتنے دن بیمار رہا۔ میرے لیے کھچڑی پکتی تھی۔ گوشت وغیرہ کے پیسے میں کیوں دوں؟''

ساتھیوں نے کہا:

''اچھا صاحب، آپ اتنے دن کی کھچڑی ہی کے پیسے دیجیے۔''

باورچی کو بلایا گیا۔ اس نے حساب لگا کر کھچڑی کے پیسے بتا دیے تو بولے:

''لیکن یہ سب کھچڑی تو میں کھاتا نہیں تھا، روز بچ کر جاتی تھی، پھر سب کے پیسے میں کیوں دوں؟''

پھر باورچی کو زحمت دی گئی۔ اس نے پھر حساب لگایا۔ روز کی بچی ہوئی کھچڑی کے پیسے کم کیے گئے۔ اب جو رقم ان کے ذمے نکلی وہ وصول کی گئی اور یہ بھی کہہ دیا گیا:

''آپ اپنا انتظام الگ کر لیجیے۔ اب سے ہمارا باورچی آپ کا کھانا نہیں پکائے گا۔''

''کیوں؟ میں نے کوئی غلط بات تو کی نہیں۔''

Scanned with CamScanner

"جی نہیں، آپ نے بالکل صحیح بات کی، لیکن آپ کا کھانا ہمارے ساتھ نہیں پکے گا۔"

ناچار بے چارے نے پھر سے روٹیاں ٹھونکنا شروع کر دیں لیکن جب تک ان کا ساتھ رہا وہ یہی کہتے رہے:

"میں نے کوئی غلط بات نہیں کہی۔ اصولاً میری غلطی ہو تو بتائیے۔"

❊

اسی زمانے میں ادیب اپنے دوستوں کے ساتھ اکبر الہ آبادی سے ملنے گئے۔ اکبر کچھ جزرس مشہور تھے لیکن ان نوجوانوں کی تواضع انھوں نے ولایتی بسکٹوں سے کی اور بتایا:

"یہ ہنٹلے پامر کمپنی کے بسکٹ ہیں۔"

بسکٹ واقعی لذیذ تھے۔ ادیب وغیرہ نے تعریف کر کر کے، مگر تکلف کے ساتھ کھائے۔ اکبر نے اپنا کلام سنایا، دلچسپ باتیں کیں اور رخصت کرتے وقت ہنٹلے پامر کے بسکٹ ان لوگوں کے ساتھ کر دیے۔ الہ آباد میں اس بات کا خاصا چرچا ہوا کہ اکبر نے کچھ نوجوانوں کو ولایتی بسکٹ نہ صرف کھلائے بلکہ ساتھ لے جانے کے لیے عنایت بھی کر دیے۔

لیکن الہ آباد کے اس قیام میں ادیب کی خاص اور بالمشافہ ملاقات خدا سے ہوئی۔ ادیب کو معلوم ہوا کہ اسی شہر الہ آباد میں ایک صاحب خدائی کے مدعی ہیں اور ان کے کچھ بندے بھی ہیں۔ پیری اور امامت اور مہدویت کا دعویٰ کرنے والے بہت سے بزرگوں کے حالات سے ادیب واقف تھے، لیکن خدائی کا دعویٰ کرنے والوں میں فرعون، نمرود اور المقنع کے سوا وہ کسی سے واقف نہیں تھے، جب ان کو پتا چلا کہ ان کے اپنے زمانے میں اور اسی شہر میں ایک خدا موجود ہے تو انھیں اس کی بارگاہ میں حاضری دینے اور اس کی معرفت حاصل کرنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ ان کی خدائی کا راز صرف ان کے بندوں پر منکشف تھا۔ ایک بندے کی معرفت انھوں نے ایک دن جا کر خدا سے ملاقات کی۔ وہ پر جلال چہرے والے خاصے ذہین آدمی نکلے۔ دیر تک ادیب کو حیات اور کائنات کے راز سمجھاتے رہے، اور بڑی سنجیدگی سے بتایا کہ میں خدا ہوں، بلکہ ادیب کی گفتگو اور علمیت سے متاثر ہو کر (جو ان کے بندوں سے یقیناً زیادہ تھی) انھیں بھی اپنی بندگی میں آ جانے کی دعوت دے دی۔ ادیب نے ان

Scanned with CamScanner

کی خدائی کے بارے میں کچھ سوال کیے جن کے انھوں نے جواب دیے لیکن اسی سوال جواب میں ادیب کے منھ سے ایک طنزیہ اور تمسخر آمیز فقرہ نکل گیا۔ یہ کفر سن کر خدا پر غیظ طاری ہو گیا اور ڈپٹ کر بولے:

''کیا سمجھتے ہو؟ چاہوں تو انگلی سے آسمان پر دستخط کر سکتا ہوں۔ یہ دیکھو!''

ادیب بتاتے تھے کہ یہ کہہ کر انھوں نے انگلی اوپر اٹھا کر لہرائی تو واقعی صاف آسمان پر بجلی چمکی اور اس سے ایک عبارت سی بن کر غائب ہو گئی۔ اب ادیب گھبرائے۔ خدا سے پھر آنے کا وعدہ کیا اور رخصت ہو کر اپنا ایمان سلامت لیے ہوئے واپس آ گئے۔

❁

الٰہ آباد ہی میں ادیب پہلی مرتبہ صاحبِ کتاب ہوئے۔ الٰہ آباد کی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

میری ادبی زندگی کی ابتدا یہیں سے ہوئی اور یہیں میں نے لارڈ ٹینیسن کے بے نظیر منظوم افسانے اینک آرڈن کا اردو نثر میں ترجمہ کر کے دیباچے اور حاشیوں کے ساتھ امتحان وفا کے نام سے شائع کیا۔

اس پر مترجم کی حیثیت سے اپنا نام ''سید مسعود حسن بی اے ادیب'' اور دیباچۂ کتاب کے آخر میں ''ادیب نیوتنوی'' لکھا ہے۔ اپنے وطن نیوتنی کی نسبت اسی کتاب میں استعمال کی ہے۔ یہ کتاب 1930 میں منشی حامد حسین نے یونانی دواخانہ پریس الٰہ آباد میں چھاپی۔ یونانی دواخانہ الٰہ آباد میں اب بھی موجود ہے لیکن اس کا پریس ختم ہو چکا ہے۔ دواخانے میں میرے بہت اچھے دوست حکیم حُمید عثمانی (نبیرۂ حکیم احمد حسین مترجم تاریخ ابن خلدون) بیٹھتے ہیں۔ جب میں نے ادیب سے ان کا تعارف کرایا تو وہ یہ معلوم کر کے بہت خوش ہوئے کہ حمید صاحب انھی منشی حامد حسین کے بھائی کے پوتے ہیں۔

بعد میں ادیب کی کئی کتابیں الٰہ آباد سے چھپ کر شائع ہوئیں۔ بچوں کے لیے ان کی نصابی کتاب دبستانِ اردو کے ناشر رام پرشاد اینڈ برادرس کتب فروش آگرہ تھے لیکن یہ رمضان علی شاہ

نے نیشنل پریس الہ آباد میں چھاپی۔ اس کتاب کے سولہ نثری اسباق میں سے تیرہ سبق خود ادیب نے لکھے۔ یہ سبق زبان، خصوصاً بچوں کے لیے زبان، پر ادیب کے غیر معمولی عبور کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

سبقوں کی ترتیب میں عبارت اور مطلب دونوں پر نظر رکھی گئی ہے، یعنی سبق جیسے جیسے آگے بڑھتے گئے ہیں وہ زبان اور خیالات دونوں کے اعتبار سے مشکل ہوتے گئے ہیں۔

ادیب نے اس کتاب میں بچوں کی زبان میں انشا پردازی بھی کی ہے، مثلاً

کہاں مقدونیہ اور کہاں پنجاب! مگر سکندر اور اس کے سپاہیوں کی ہمت تو دیکھو کہ راستے کی مصیبتیں جھیلتے ہوئے، لڑائیاں لڑتے ہوئے، فارس کے لق و دق جنگلوں میں گھستے ہوئے، افغانستان کے سرد اور ناہموار میدانوں کو لپیٹتے ہوئے، دریاؤں کو لانگھتے، پہاڑوں کو روندتے، برف کاٹتے یونان سے ہندوستان تک چلے آئے!

بچوں کے لیے لکھنے میں ادیب کے سامنے مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کی درسی کتابوں کا نمونہ تھا جن سے وہ بہت متاثر تھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

مولوی اسماعیل میرٹھی کی اردو کی پانچویں کتاب نصاب میں داخل تھی۔ ان کا اسلوبِ تحریر اتنا پسند آیا کہ ایک ایک سبق کئی کئی دفعہ پڑھا اور ان کے نصابی سلسلے کی اور کتابیں اسی شوق کے ساتھ پڑھ ڈالیں۔ اس میں شک نہیں کہ میرے ادبی ذوق کی بنیاد انھی کتابوں سے پڑی۔

عربی و فارسی ضرب الامثال کا مجموعہ فرہنگِ امثال بھی شانتی پریس الہ آباد میں چھپا۔ یہ جیبی سائز کی مجلد کتاب تھی اور ایک عرصے تک بہت مقبول رہی۔

ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے مولوی محمد مبین کیفی چریاکوٹی کی جواہرِ سخن چار جلدوں میں چھاپی۔ اس کی دوسری جلد کی نظرِ ثانی اور ضروری ترمیمیں ادیب نے کیں۔

لیکن الہ آباد سے ادیب کی جو سب سے اہم کتاب سامنے آئی وہ روحِ انیس ہے۔ یہ انڈین پریس الہ آباد نے بڑے اہتمام سے شائع کی۔ روحِ انیس انیس کے بہترین مرثیوں کا انتخاب ہے۔ اس میں ادیب نے بڑی محنت سے مرثیوں کا متن، مقدمات اور فرہنگ وغیرہ تیار کر کے

Scanned with CamScanner

انیس فہمی کی راہ ہموار کی۔ کتاب میں انیس کی تحریر، محل سرا، مدفن اور ایک مجلس کی تصویروں کے علاوہ ان کی بہت مستند رنگین تصویر بھی شامل ہے۔ کتاب کی جلد بھی بہت خوبصورت ہے۔

❄

الہ آباد میں ادیب کا مستقل قیام قریب ساڑھے تین سال رہا۔ لیکن لکھنؤ یونیورسٹی کی ملازمت کے بعد بھی اس شہر سے ان کا ربط برقرار رہا۔ وہ الہ آباد یونیورسٹی کی مختلف کمیٹیوں، ہندوستانی اکیڈمی اور انٹرمیڈیٹ بورڈ کے بھی ممبر تھے۔ ان کمیٹیوں کے اجلاسوں میں شرکت کے لیے وہ برابر الہ آباد جاتے رہتے اور انھوں نے سب سے زیادہ سفر الہ آباد ہی کے کیے۔

1946 میں ادیب کی بڑی بیٹی کی شادی الہ آباد یونیورسٹی کے ڈاکٹر مسیح الزماں کے ساتھ ہوئی۔ ادیب کے سمدھی سید مہدی الزماں صاحب مہدی جائسی الہ آباد ہی میں وکالت کرتے تھے۔ وہ شاعر بھی تھے اور اچھے عروض داں بھی۔ انھوں نے فن شاعری پر کئی کتابیں بھی لکھیں۔ وہ ادیب کے بڑے قائل تھے اور ادیب بھی ان کی قدر کرتے تھے۔

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی الہ آباد میں ادیب کے سب سے خاص دوست تھے۔ ادیب الہ آباد میں انھی کے یہاں ٹھہرتے اور وہ بھی لکھنؤ آتے تو ادیب کے یہاں ٹھہرتے۔ ان کی یہ ادا مجھے یاد ہے کہ وہ جاڑے، گرمی، برسات، ہر موسم میں گرم پانی سے غسل کرتے تھے اور ہر بار نہانے کے بعد بدن پر ٹھنڈا پانی ڈال لیتے تھے۔ وہ غیر معمولی علمی لیاقت اور دل پذیر شخصیت کے مالک تھے۔ ان سے ادیب کے تقریباً گھریلو تعلقات تھے اور ادیب ان سے مختلف امور میں مشورہ کیا کرتے تھے۔ ان کا خط بھی بہت پاکیزہ تھا۔ لیکن 1971 یا 72 میں جب میں لکھنؤ یونیورسٹی میں پڑھا رہا تھا، ایک دن میرے صدر شعبہ پروفیسر انوارالحسن ہاشمی صاحب کے پاس ڈاک سے ایک پوسٹ کارڈ آیا۔ اسے غور سے پڑھنے کے بعد انھوں نے وہ پوسٹ کارڈ میری طرف بڑھا دیا اور کہا، ''یہ مسعود صاحب کو دکھا دینا۔'' میں نے دیکھا تو اس پر ٹیڑھے میڑھے حرفوں میں عجب بے ربط عبارت لکھی ہوئی تھی۔ ہاشمی صاحب نے کہا، ''یہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب کا خط ہے۔ مسعود صاحب کے پاس ان کے بہت سے خط ہیں، اس خط کو بھی دیکھ لیں۔'' میں نے ادیب کو وہ خط دکھایا تو ان پر حزن و ملال کی کیفیت

Scanned with CamScanner

طاری ہوگئی۔ اسی سال یا دوسرے سال صدیقی صاحب کی وفات ہوگئی۔ ان کے بہت سے خط خطوطِ مشاہیر بہ نام سید مسعود حسن رضوی ادیب میں شامل ہیں۔

مولوی مقبول احمد صمدنی الہ آباد کے جید عالم تھے۔ ان کی کتابیں راجپوت اور مغل زن و شو کی معاشرت، تاریخ الہ آباد، حیاتِ جلیل زبردست تحقیقی کارنامے ہیں جن میں متن کے برابر ہی، کہیں زیادہ، جگہ حواشی گھیرتے ہیں۔ ان کتابوں کو دیکھ کر گبس میموریل کی مطبوعات یاد آتی ہیں۔ صمدنی صاحب کی کتاب میں کسی شخص یا مقام کا نام آجاتا تو حاشیے میں بڑی تحقیق کے ساتھ اس کے متعلق ضروری معلومات بہم پہنچاتے اور کبھی کبھی حاشیے میں آنے والے ناموں پر مزید حاشیے لکھتے تھے۔ ادیب نے ان کی کسی کتاب پر تبصرے میں لکھا تھا کہ دوسروں سے تحقیق کی کمی کی شکایت ہوتی ہے لیکن صمدنی صاحب سے تحقیق کی زیادتی کی شکایت ہوتی ہے۔ میر عبدالجلیل بلگرامی پر ان کی ضخیم کتاب حیاتِ جلیل تحقیق کا شاہکار ہے۔ ادیب صمدنی صاحب سے بہت مانوس تھے اور صمدنی صاحب عمر میں زیادہ ہونے کے باوجود ادیب کو ''سیدی مولائی'' اور ''مولائی المعظم وسیدی المحترم'' کے القاب کے ساتھ خط لکھتے تھے۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں میرے ایک ہم جماعت (نام غالباً سید علی جسیر) نے مجھ سے کہا کہ مقبول احمد صمدنی صاحب مرض الموت میں مبتلا ہیں۔ انھوں نے مجھ سے خاص طور پر تاکید کی ہے کہ مسعود صاحب کو ان کی حالت سے مطلع کر دیا جائے۔ پھر کچھ دن بعد انھوں نے صمدنی صاحب کی وفات کی خبر سنائی۔ ادیب بڑھاپے کی خرابیوں، خصوصاً نسیان، کے ذکر میں صمدنی صاحب کے آخر عمر کا واقعہ بیان کرتے تھے کہ جب ادیب نے ان سے پوچھا کہ آپ فلاں موضوع پر کتاب لکھ رہے تھے اور اس کے لیے بہت سا مواد جمع کر لیا تھا، وہ کہاں تک پہنچی، تو صمدنی صاحب جواب میں دیر تک سوچتے رہے، پھر آہستہ سے بولے:

''ہاں، کچھ لکھ تو رہا تھا۔''

(خود ادیب کو بھی آخر عمر میں یاد نہیں رہا تھا کہ وہ تاریخ مرثیہ پر کام کر رہے تھے، اور انیس کے کلام پر ایک اچھی خاصی کتاب ان کے پاس تیار رکھی ہوئی ہے۔)

مرزا ابوالفضل سے بھی الہ آباد میں ادیب کی ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ مرزا صاحب دوسروں سے الگ ہٹ کے سوچتے تھے، مذہبیات کے متخصص اور صاحب طرز نثر نگار تھے۔ ان کی بعض مذہبی

تحریریں اعتراضوں کا نشانہ بھی بنیں۔ ادیب ان کے دھیمے طرزِ گفتگو اور اسلوبِ نثر کی بہت تعریف کرتے تھے اور ان کی اس خصوصیت کا ذکر کرتے تھے کہ جب دورانِ گفتگو وہ کسی اعتراض کا بہت مسکت جواب دیتے تھے تو ان کے لہجے میں اور بھی عاجزی آ جاتی تھی۔ ادیب ان کے لہجے کی نقل بھی کر کے بتاتے تھے۔

الہ آباد میں مولوی جلال احمد جعفری زینبی مالک انوار احمدی پریس اور مولوی محمد مبین سے بھی ادیب کے اچھے مراسم تھے۔ جلال الدین صاحب بہت سی کتابوں کے مصنف تھے جن کی تصنیف میں مولوی مبین کا خاصا حصہ ہوتا تھا۔ مولوی مبین نے ایک خط میں روحِ انیس کو ناقابل اعتبار اور زبان کی غلطیوں سے پُر بتایا تھا، لیکن ادیب ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔ تاریخ ریختی مع دیوانِ جان صاحب مولوی مبین کی بہت معیاری کتاب ہے۔ انھوں نے منیر شکوہ آبادی کی سنان دل خراش کو بھی مرتب کیا تھا۔ اس پر کچھ حواشی نواب سید محمد جعفر علی خان شمس آبادی عرف پیارے صاحب کے قلم سے ہیں جو اس کی تحریر کے محرک تھے۔ نواب جعفر نے کتاب افضل حسین ثابت کو بھیجی تھی اور ثابت نے بھی اس پر حواشی لکھے تھے۔ یہ قلمی نسخہ مولوی مبین کے پاس پہنچا اور انھوں نے مزید حواشی لکھ کر اسے مرتب کیا، لیکن اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ ادیب نے یہ نسخہ لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری کے لیے خرید لیا۔ اصل نسخہ شمس آباد میں محمد صادق صفوی صاحب کی ملکیت ہے۔

الہ آباد یونیورسٹی کے ڈاکٹر محمد حفیظ سید (مرتب دیوانِ نجری) الہ آباد کی دلچسپ شخصیت تھے۔ وہ صبح کے وقت کچھ پوجا وغیرہ بھی کرتے تھے۔ ہماری ایک ددھیالی عزیزہ (جن سے نوجوانی میں ادیب شادی کے خواہشمند تھے) حفیظ سید صاحب سے منسوب تھیں۔ کچھ اس رشتہ داری کی وجہ سے اور کچھ یونیورسٹی کے تعلق سے ادیب اور ان میں مراسم تھے۔ حفیظ صاحب پر ہر وقت ایک اضطرابی اور اضطراری کیفیت طاری رہتی تھی۔ ان کی ملنے والی ایک خاتون نے ان کی شخصیت کا خاکہ اس طرح کھینچا کہ کسی ٹین کے پیپے میں کچھ پتھر ڈال کر اسے زور سے کھڑکھڑاؤ، بس یہ حفیظ سید ہیں۔ ایک زمانے میں ادیب کو کسی باہر کی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کرنے کا خیال ہوا۔ انھوں نے حفیظ سید صاحب سے مشورہ کیا۔ حفیظ صاحب نے جواب میں لکھا:

اگر آپ واقعی ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینا چاہتے ہیں تو پیرس یونیورسٹی کا راستہ کھلا ہوا ہے۔

Scanned with CamScanner

مزید تحقیقات کے بعد نہایت وثوق کے ساتھ آپ کو لکھ رہا ہوں۔ آپ کو سال یا ڈیڑھ سال کی رخصت نہ لینا ہوگی۔ آپ اس سال یا آئندہ سال جب آپ چاہیں نومبر میں دو مہینے کی رخصت لے کر پیرس تشریف لائیں اور نام داخل کرا کے واپس چلے جائیں۔ دوسرے سال گرمیوں کی تعطیل میں تشریف لائیں اور مقالہ پیش کر کے ڈگری حاصل کرلیں۔

دو بار آنے جانے میں آپ کے بارہ سو خرچ ہوں گے۔ مقالے کی طباعت میں سات سو روپیہ صرف ہوگا۔ کل اخراجات تقریباً تین ہزار ہوں گے۔

خط 13 اگست 1931 کو لکھا گیا تھا۔ اس زمانے میں تین ہزار کی رقم غالباً بہت زیادہ تھی۔ اس لیے ادیب نے پیرس یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کرنے کا خیال چھوڑ دیا۔

❋

ادیب الہ آباد زیادہ تر ایک دو دن کے لیے جاتے تھے لیکن ان کا سامانِ سفر دیکھ کر خیال ہوتا تھا کہ بہت دور اور بہت دن کے لیے جا رہے ہیں۔ ہم بچوں کو بھی الہ آباد پسند تھا، مگر اس لیے کہ ادیب کو وہاں اکثر جانا ہوتا تھا اور اس وقت ہم لوگوں کو بڑی آزادی کا احساس ہوتا تھا۔ وہ سخت گیر باپ بالکل نہیں تھے لیکن ہم لوگوں پر خواہ مخواہ ان کا رعب، بلکہ خوف طاری رہتا تھا اور ان کی موجودگی میں ہم سب دبے دبے رہتے تھے۔ ان کے الہ آباد روانہ ہوتے ہی سب خوب کھل کھیلتے تھے۔ لیکن یہ کیفیت لڑکپن تک رہی۔ اس کے بعد جب وہ الہ آباد یا کہیں بھی جاتے تو ہمیں اپنا گھر خالی محسوس ہوتا تھا۔

❋❋

Scanned with CamScanner

سماجی تنقید و تحقیق

تہذیبی نرگسیت
(پاکستان میں بڑھتی ہوئی مذہبی انتہا پسندی)
مبارک حیدر
قیمت:150 روپے

محاصرے کا روزنامچہ
(بی بی سی کے لیے لکھے گئے کالموں کا انتخاب)
وجاہت مسعود
قیمت:300 روپے

پاکستان اور اقلیتیں
احمد سلیم
قیمت:300 روپے

پاکستان جاگیرداری نظام کے شکنجے میں
محمد نعیم اللہ
قیمت:300 روپے

سرائیکی ثقافت
نسیم اختر
قیمت:180 روپے

لائل پور کہانی: کتاب4
ریگل چوک
اشفاق بخاری
قیمت:200 روپے

تشدد، یادیں اور تعمیر امن
(پاکستان اور بھارت میں مذہبی اقلیتیں)
احمد سلیم، نوشین ڈیسوزا، لیونارڈ ڈیسوزا
قیمت:300 روپے

عشاق کے قافلے
میر یوسف عزیز مگسی
شاہ محمد مری
قیمت:300 روپے

عشاق کے قافلے
میر غوث بخش بزنجو
شاہ محمد مری
قیمت:200 روپے

عشاق کے قافلے
عبداللہ جان جمالدینی
شاہ محمد مری
قیمت:190 روپے

Scanned with CamScanner

شمس الرحمٰن فاروقی کی کتابیں

سوار اور دوسرے افسانے

(کہانیاں)

(دستیاب نہیں)

ساحری، شاہی، صاحبقرانی

(داستانِ امیر حمزہ کا مطالعہ)

شمس الرحمٰن فاروقی

تین جلدوں کے سیٹ کی قیمت: 1000 روپے

اردو کا ابتدائی زمانہ

ادبی تہذیب و تاریخ کے پہلو

قیمت: 120 روپے

غالب پر چار تحریریں

(مضامین)

قیمت: 80 روپے

افسانے کی حمایت میں

(تنقیدی مضامین)

قیمت: 200 روپے

کئی چاند تھے سرِ آسماں

(ناول)

قیمت: 600 روپے

شعر شور انگیز

(غزلیات میر کا انتخاب اور مفصل مطالعہ)

شمس الرحمٰن فاروقی

چار جلدوں کے سیٹ کی قیمت: 1350 روپے

لغات روزمرہ

اردو میں زبان کے غیر معیاری استعمالات

کی فہرست و تنقید

قیمت: (مجلد) 250 روپے

تنقیدی افکار

شمس الرحمٰن فاروقی

قیمت: 250 روپے

تعبیر کی شرح

(تنقیدی مضامین)

قیمت: 250 روپے

Scanned with CamScanner

شمس الرحمٰن فاروقی

نول کشور پریس

مطالعے کے بنیادی پہلو

جامعہ ملیہ کے ہردل عزیز وائس چانسلر اور میرے چھوٹے بھائی سید شاہد مہدی، محترمہ رانی بھار گو صاحبہ، معزز اساتذہ، بزرگو اور دوستو!

بڑی مسرت کی بات ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے منشی نول کشور مرحوم کی حیات اور خدمات پر یہ سیمینار منعقد کیا ہے۔ مشرقی علوم اور ہند اسلامی تہذیب کی جو خدمات منشی صاحب، ان کے اخلاف اور ان کے پریس نے انجام دیں انھوں نے ہماری تہذیبی تاریخ کا نقشہ بدل دیا۔ منشی نول کشور نے ہندوستان ہی نہیں، وسط ایشیائی ممالک اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کی بھی تہذیبوں کی زندگی کو قائم رہنے اور پھلنے پھولنے کے مواقع فراہم کیے۔ انھوں نے اردو کے علاوہ عربی، فارسی اور سنسکرت کی بھی قدیم اور نادر کتابوں کے اچھے نسخے مہیا کیے، ان کی تصحیح کرائی اور انھیں کم قیمت کے ایڈیشنوں میں شائع کیا۔ اسی طرح ہماری ہزاروں قابلِ قدر کتابیں تباہ ہونے اور مٹ جانے سے محفوظ رہیں، اور نہ صرف یہ کہ محفوظ رہیں بلکہ دور دور تک عام بھی ہوئیں۔

میں بانیانِ سیمینار کا ممنون ہوں کہ مجھے اس اہم سیمینار کا کلیدی خطبہ حاضر کرنے کی خدمت

زیرِ نظر متن شمس الرحمٰن فاروقی کے کلیدی خطبے پر مشتمل ہے جو منشی نول کشور (1895-1836) اور ان کے اشاعتی اور دیگر تہذیبی کارناموں کی یاد منانے کے لیے جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، کے شعبۂ اردو کے زیرِ اہتمام 31 مارچ اور یکم اپریل 2003 کو منعقد ہونے والے سیمینار میں دیا گیا۔

Scanned with CamScanner

کے لیے منتخب کیا گیا۔ اچھا تو یہ ہوتا کہ کسی واقعی صاحبِ استعداد عالم کو اس کام کے لیے بلایا جاتا، لیکن اب جب میں یہاں حاضری پر مجبور ہو ہی گیا ہوں گا تو چند باتیں عرض کرنے کوشش کروں گا جو میرے نزدیک منشی نول کشور سے متعلق مطالعات کے لیے بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔ اگرچہ نول کشور کے کاغذات اور دفاتر اس وقت مہر بند ہیں، لیکن میرا خیال ہے کوشش کرنے پر بعض صورتوں میں سب نہیں تو کچھ چیزوں تک رسائی اب بھی ممکن ہے۔ کچھ برس ہوئے محمود توکلی نام کے ایک ایرانی صاحب اپنی مساعی سے پریس کے گوداموں کو کھلوا کر کئی کتابوں کے کئی نسخے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اگر کوئی غیر ملکی یہ کر سکتا ہے تو ہندوستانی طالب علم یا محقق بھی یہ کام کر سکتا ہے۔

سب سے پہلی بات تو یہ کہ نول کشور پریس کی مطبوعات کی مکمل اور محشیٰ فہرست بنائی جائے۔ نول کشور پریس نے عربی، فارسی، اردو، سنسکرت اور ہندی میں کتابیں شائع کیں، لیکن ابھی تک اردو فارسی کی بھی مکمل فہرست تیار نہیں ہو سکی ہے۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ بعض کتابیں نول کشور پریس کی کانپور شاخ ہی سے چھپیں، کسی اور شاخ سے ان کی اشاعت نہ ہوئی۔ الہٰ آباد اور بھوپال کی شاخوں کے بارے میں مجھے کچھ ٹھیک سے نہیں معلوم، سوائے اس کے کہ ان جگہوں کی شاخیں زیادہ فعال اور زیادہ دیرپا نہ تھیں۔ کانپور نے یقیناً ایک زمانے میں لکھنؤ ثانی کا انداز اختیار کر لیا تھا۔ ضرورت ہے کہ لکھنؤ کے صدر پریس اور دوسری تمام شاخوں کی فہرستیں بنا کر مقابلہ کیا جائے اور ایک جامع فہرست بنائی جائے۔ اس فہرست کے دو ابواب ہوں گے۔ پہلے تو تاریخ وار یا کتاب کے نام کے اعتبار سے حروفِ تہجی پر مبنی، مکمل فہرست ہو۔ دوسرے باب میں لکھنؤ کے علاوہ ہر شاخ کی مطبوعات کی فہرست ہو اور اس میں یہ بھی صراحت ہو کہ کون کون سی کتابیں لکھنؤ کی شاخ یا کسی اور شاخ سے بھی شائع ہوئیں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ مطبوعات کی تعدادِ اشاعت کیا تھی؟ ظاہر ہے یہ تعداد مانگ، وسائل اور کتاب کی نوعیت کے اعتبار سے بدلتی اور گھٹتی بڑھتی رہی ہوگی۔ میرا قیاس ہے کہ مذہبی کتابوں کی تعدادِ اشاعت سب سے زیادہ ہوگی اور قرآن پاک کی تعداد اس میں سرفہرست ہوگی۔ یہ بھی گمان گزرتا ہے کہ بعض طرح کی کتابوں، مثلاً داستان، کی اشاعتِ اوّل کی تعداد کم ہوتی ہوگی اور دوسری اشاعت کی تعداد زیادہ ہوتی ہوگی۔ اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے، لیکن ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جو کتابیں کانپور سے چھپتی تھیں ان کی اشاعت کانپور کے حساب سے درج کی جاتی تھی۔ یعنی اگر کوئی کتاب پہلے لکھنؤ سے

چھپی اور بعد میں پھر کانپور سے چھپی تو کانپوری اشاعت کو الگ شمار کر کے اس کو یوں بیان کرتے تھے کہ مطبع نول کشور واقع کانپور سے باراوّل شائع ہوئی۔ لہٰذا اگر طالب علم کو یہ نہ معلوم ہو کہ یہ کتاب پہلے لکھنؤ سے چھپ چکی ہے تو وہ کانپوری اشاعت کو مطلق اعتبار سے اشاعتِ اوّل قرار دے گا اور اگر اسے کانپوری اشاعت کی تعدادِ اشاعت معلوم ہو جائے تو وہ یہ بھی فرض کر سکتا ہے کہ فلاں کتاب کا اوّل ایڈیشن پہلے کانپور سے نکلا اور اس میں اتنے نسخے شائع ہوے۔

اودھ اخبار کا معاملہ اور بھی پیچیدہ ہے لیکن ایک دوسرے اعتبار سے، یعنی ہفتہ وار اور روزانہ اخباروں کی تعداد ہر شمارے کے ساتھ بدل سکتی ہے۔ اس میں صرف اخبار کی مانگ کا معاملہ نہیں، بلکہ کاغذ کی دستیابی، چھپنے کے دوران کتنا کاغذ ضائع ہوا، مناسب تقطیع کے کاغذ کی کافی مقدار کا دستیاب نہ ہونا، وغیرہ تمام باتیں شامل ہیں۔ اغلب ہے کہ اس زمانے کے رجسٹرار برائے اخبارات یا حکومت صوبہ جات متحدہ آگرہ و اودھ (United Provinces of Agra and Awadh) جو یوپی کا پرانا نام تھا، اس کی سالانہ رپورٹوں سے بھی کچھ اعداد و شمار مل سکیں۔ یہ بھی معلوم کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ اخبار کی کھپت کہاں کہاں اور کتنی تھی اور کتنی فروخت براہِ راست ہوتی تھی اور کتنی کتب فروشوں یا اخبار فروشوں کے ذریعے ہوتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے ملک میں کتاب فروشوں کی باقاعدہ دکانوں کے انعقاد میں درسی کتابوں کے علاوہ نول کشور پریس کی کتابوں اور اخبار کا بھی بڑا حصہ ہوگا۔

ایک سوال یہ بھی ابھی تک تحقیق طلب ہے کہ کتابوں کی قیمتیں اس زمانے کو دیکھتے ہوے زیادہ تھیں یا کم؟ ایک اندازے کے مطابق انیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں ہندوستانی روپے کی قیمت اُس وقت کے سوا شلنگ سے کچھ زیادہ تھی، اور اُس وقت کا ایک شلنگ آج کے تقریباً پچاس روپے کے برابر تھا۔ یقین ہے کہ انیسویں صدی کے وسط میں بھی روپے اور شلنگ کی تقابلی قیمتوں میں کچھ خاص فرق نہ آیا ہوگا۔ میرے پاس نول کشور پریس کی ایک فہرست مورخہ 1911 ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پریس کی کتابیں عموماً پانچ روپے سے زیادہ کی نہ ہوتی تھیں۔ اگر اُس وقت کے روپے کو آج کے پچھتر روپے کے برابر فرض کیا جائے تو یہ کتابیں کچھ مہنگی نہیں لگتیں، لیکن انھیں کم قیمت بھی نہیں کہہ سکتے۔

اسی معاملے سے متعلق دو بہت اہم باتیں اور بھی ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ قلم کے ذریعے روئی

Scanned with CamScanner

کمانے کی رسم تمام دنیا میں ہے اور بہت پرانی ہے۔ چھاپے خانے کی ایجاد کے پہلے قلم کے ذریعے روٹی پیدا کرنے کے لیے ادیب کو مربی کی ضرورت تھی (مثلاً شاعر کو) یا پھر عوامی امداد کی (مثلاً داستان گو کو)، لیکن جب پریس آ گیا تو مربیوں کا دور ختم ہونے لگا اور یورپ میں کوئی تین سو برس کے عرصے میں مربی کا ادارہ بالکل ختم ہو گیا۔ ہمارے یہاں پریس بہت دیر میں آیا، لیکن تاریخ کا المیہ یہ ہوا کہ پریس کا آنا اور مربی کا ختم ہونا کم و بیش ایک ہی ساتھ عمل میں آیا۔ مربی اس لیے ختم ہوئے کہ انگریزوں کی لائی ہوئی نئی تہذیب نے مربیوں کی مالی حیثیت بہت کم کر دی اور بہت تیزی سے کم کر دی، یہاں تک کہ پریس کے مقبول اور رائج ہونے اور مربیوں کے معدوم ہو جانے کے درمیان زمانی فصل بمشکل نصف صدی کا تھا۔ مغرب میں تو یہ ہوا کہ پریس (یعنی ناشر، اخبار) نے مربی کی جگہ لے لی، لیکن ہندوستان میں اس کا بالکل الٹا ہوا۔ یہاں پریس نے ادیب کو ذریعۂ آمدنی بنایا، لیکن اپنی ہی شرطوں پر، یعنی پریس کے مالک یا کتاب کے ناشر نے ادیب کو کچھ معاوضہ نہ دینے کی رسم بنالی، بلکہ اکثر تو مصنف کو یہ وعدہ کرنا پڑتا تھا کہ کتاب چھپ جائے گی تو میں کئی جلدیں خرید لوں گا۔ مثلاً غالب نے خود اپنی ایک کتاب کے لیے پچاس جلدوں کی خریداری کا وعدہ کیا ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ ان سے کمتر درجے کے مصنف اور زیادہ خریدتے ہوں۔

لہٰذا سوال یہ ہے کہ منشی نول کشور کے یہاں مصنفوں کو کچھ معاوضہ ملتا تھا کہ نہیں؟ اور اگر ملتا تھا تو کیا اس کی کوئی شرح مقرر تھی؟ داستان گویوں کے بارے میں تو سنا گیا ہے کہ انھیں کچھ معاوضہ ملتا تھا، لیکن اس کی بھی مقدار یا شرائطِ ادائیگی کچھ معلوم نہیں۔ مصنفوں کے معاوضے کی طرح یہ بھی مسئلہ ہے کہ پریس کے مختلف ملازمان کو کیا تنخواہ ملتی تھی؟ ملازموں کی فہرست خاصی طویل ہے اور ان کو چار شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: کتابت، طباعت، تجارت اور صحافت۔ موخر الذکر میں تمام علمی لوگ بھی شامل کیے جا سکتے ہیں، مثلاً مصحح، مترجم، حاشیہ نگار اور فرہنگ نگار، وغیرہ۔ مصحح کا کام شاید سب سے زیادہ اہم ہوتا تھا، کیونکہ وہ پرانے مخطوطے یا مسودے کو پڑھ کر کتابت کی غلطیاں درست کرتا تھا یا متن اگر مغشوش ہو یا کسی غلطی یا لفظ کے چھوٹ جانے کے باعث ٹھیک سے سمجھ میں نہ آئے، جیسا کہ اکثر ہوتا تھا، تو متن کی تصحیح غیر معمولی محنت، قوت، قیاس، حافظہ اور وسعتِ مطالعہ کا تقاضا کرتی تھی، اور فرہنگ نگاری کی مشکلات کو اس کے دل سے پوچھیے جسے خاقانی کے کلیات یا فیضی کی غیر منقوط تفسیر

Scanned with CamScanner

قرآن (جس کے آخر میں ان نادر عربی الفاظ کی فرہنگ بھی درج کی گئی ہے جو فیضی نے تفسیر میں برتے ہیں) یا خسرو کی کسی مثنوی کی تصحیح، یعنی فرہنگ نگاری، کرنی پڑی ہو۔

بعض مصحح حضرات کے نام سے ہم واقف ہیں: حامد شاہ آبادی، ہادی علی الہٰ آبادی، صادق علی، سید تصدق حسین، امیر اللہ تسلیم، وغیرہ۔ یہ سب اپنے وقت کے مشہور لوگ تھے۔ امیر اللہ تسلیم ہندوستان گیر شہرت کے شاعر بھی تھے۔ ان میں سے اکثر کی سوانح عمری لکھنے اور ان کے کارناموں کے تجزیے کی ضرورت ہے۔

طباعت میں سب سے اہم کام مصلح سنگ کا تھا۔ اس کا کام یہ تھا کہ کتابت کو پتھر پر منتقل کرنے میں جہاں کہیں عبارت مٹ جائے یا حروف پوری طرح منتقل نہ ہوں یا چھوٹ جائیں تو وہ انھیں اپنے علم، حافظے اور فراست کی بنا پر درست کرتا تھا۔ مصلح سنگ کے فرائض میں یہ بھی تھا کہ جہاں کہیں پتھر پر کوئی داغ پڑ گیا ہو یا روشنائی ہلکی پڑنے کے سبب سے خوب سیاہ طباعت نہ ہونے کا امکان ہو تو وہ کتابت کو اُجالنے کی ترکیبیں کرتا تھا۔ بار بار استعمال کرنے سے پتھر میں داغ آجانے کا امکان زیادہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح مصلح سنگ میں علم، خوش نویسی اور پریس کے معاملات میں مہارت یکجا ہوتی تھی۔ بہت سے کاتب ایسے ہوتے ہیں جن کا حرف دیکھنے میں بہت اچھا نہیں لگتا، لیکن چھپ کر بہت اچھا آتا ہے۔ مصلح سنگ کو ان باتوں کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا تھا۔

کتابت کے شعبے میں سیدھی کتابت، الٹی یا معکوس کتابت (یعنی عبارت کو براہِ راست پتھر پر الٹا لکھ دینا)، گھنی کتابت کرنا، جلی، خفی، عنوانات، نسخ، نستعلیق، اخبار کی کتابت، فہرست کی کتابت وغیرہ کی مہارت، یہ سب الگ الگ علوم یے (Discipline) تھے اور ان کی الگ الگ قدر تھی۔ فہرست کی کتابت کرنے والے خاص طبقے کے لوگ ہوتے تھے، کیونکہ یہ کتابت بعض فنی مہارتوں کا تقاضا کرتی تھی۔ نہایت گھنی لیکن روشن کتابت فہرست نگاری کی پہلی شرط تھی۔ کالم لمبے لیکن چوڑائی میں نسبتاً تنگ ہوتے تھے۔ ان سب باتوں کے علاوہ فہرست نگار کے لیے وہ شے بہت ضروری تھی جسے ''تہذیبِ کتابت'' کے عمومی نام سے یاد کرتے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ معکوس لکھنے والے سے بڑھ کر ماہر خوش نویس کوئی نہ ہو سکتا تھا۔ نول کشور پریس کے بعض معکوس لکھنے والوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ چار چار سطر یا ایک دو صفحے نہیں، پوری پوری کتاب معکوس لکھ سکتے تھے۔

Scanned with CamScanner

فنی طور پر کتابت اور نقاشی میں بھی روایتی طور پر امتیاز تھا۔ منشی نول کشور کے زمانے میں اور ان کے پریس میں یہ امتیاز کتنا باقی تھا، اس پر بھی چھان بین کرنے کی ضرورت ہے۔ مغل مصوری کی تہذیب میں خوش خطی اور مصوری ساتھ ساتھ چلتی تھیں، لیکن مصوری اور خوش نویسی دو الگ الگ شعبے تھے۔ علوم مثلاً طب، نباتات، جغرافیہ وغیرہ کی کتابیں مصور بھی کی جاتی تھیں۔ بعض کو مطلاً اور مذہب بھی کیا جاتا تھا۔ شعر، مثلاً مثنوی، اور نثر، مثلاً داستان وغیرہ، بھی عموماً ہمیشہ مصور ہوتی تھیں۔ کتابت اور تصویر دونوں میں نہایت نمایاں اور عمدہ رنگ استعمال کیے جاتے تھے۔ طباعت کا رواج ہونے کے بعد یہ باتیں ممکن نہ رہیں۔ مطبوعہ کتابوں میں تصویریں اگر ہوتی بھی تھیں تو محض بے لطف خاکے، جن میں فن کا کچھ خاص لحاظ نہ رکھتے تھے۔ بعد میں شاید دہلی کے مطابع نے ایک رسم ایجاد کی کہ کتاب کے بعض خاکوں میں ہاتھ سے رنگ بھروائے جاتے تھے۔ مجھے نول کشور پریس کی کوئی کتاب ایسی نہیں ملی جس میں یہ طریقہ برتا گیا ہوتا، لیکن اس بات کا ذکر ہر جگہ ملتا ہے کہ پریس میں نقاش بھی ملازم تھے اور ان کی بڑی آؤ بھگت تھی۔ وہ خاکے والی تصویر بنانے کے علاوہ اور کیا کام کرتے تھے، ہمیں اس باب میں زیادہ معلوم نہیں۔ ممکن ہے بعض نقاشوں کے فرائض میں تاریخ اور جغرافیہ کی کتابوں میں نقشے کھینچنا بھی شامل ہو۔ بہر حال، اس معاملے پر مزید معلومات حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔

ہمیں یہ بھی متعین کرنا چاہیے کہ پریس سے شائع شدہ مختلف علوم کی کتابوں کا آپسی تناسب کیا تھا؟ مذہبی کتابیں سب سے زیادہ تھیں یا ادبی کتابیں؟ عربی، فارسی، اردو، ہندی کتابوں کا تناسب کیا تھا اور اس میں وقت کے ساتھ کتنی تبدیلی آئی؟ یہ سوال بھی چھان بین اور نتیجہ سازی کا تقاضا کرتا ہے۔

قرائن بتاتے ہیں کہ منشی نول کشور کے زمانے میں کتابت شدہ پتھر محفوظ رکھے جاتے تھے اور انھیں کتاب کی اگلی اشاعتوں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اگر یہ صحیح ہے تو پتھروں کو محفوظ کرنے اور محفوظ رکھنے میں بہت مہارت اور بہت جگہ درکار ہوتی ہوگی۔ پھر یہ بھی ہے کہ انھیں ترتیب سے اس طرح جمع رکھنا کہ انھیں آسانی سے اور صحیح ترتیب سے واپس نکالا جا سکے، یہ بہت بڑا اور بڑی مہارت کا کام رہا ہوگا۔ ایک پتھر پر چار یا آٹھ صفحے چھپتے ہوں گے، لہٰذا آٹھ سو صفحے کی کتاب کے لیے کم از کم سو بڑے پتھر درکار ہوتے ہوں گے۔ اس حساب سے دیکھیے تو گودام کے اندر کسی ایک وقت میں ہزاروں پتھر رکھے رہتے ہوں گے۔ ان پتھروں کو رکھنا اور نکالنا اور صحیح جگہ پر دوبارہ واپس رکھنا بے

Scanned with CamScanner

شک بڑے انتظامی ڈھب کا تقاضا کرتا تھا۔

اسی مسئلے سے متعلق یہ بات بھی تھی کہ طباعت کے لیے جو کاغذ منگایا یا بنایا جاتا تھا، اسے کہاں اور کس طرح رکھتے ہوں گے کہ وہ آگ اور نمی سے محفوظ بھی رہے اور استعمال کے لیے آسانی سے نکالا بھی جا سکے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، اس وقت تک کاغذ کو بڑے بڑے پہیوں پر لپیٹنے اور Bale کی شکل دینے کا طریقہ ایجاد نہ ہوا تھا یا شاید اس زمانے کا کاغذ ہی اتنا مضبوط نہ رہا ہو کہ اسے بیل کیا جا سکے، لہٰذا کاغذ کی رم (Ream) کو چوکور پیکٹ کی شکل میں چپٹا رکھتے تھے۔ ایک رم میں پانچ سو ورق ہوتے ہیں اور عموماً ایک ورق 23 یا 22 انچ چوڑا اور 36 انچ لمبا یا 18 انچ چوڑا اور 22 انچ لمبا ہوتا تھا۔ ایسے کاغذ کی سیکڑوں رمیں اوپر تلے رکھنا بھی کوئی معمولی بات نہ تھی۔

اسی حساب سے اس بات پر بھی غور کر لیجیے کہ مطبوعہ کتابیں جمع رکھنے اور انھیں فروخت کرنے یا کتاب فروش کے یہاں رسد کے لیے نکالنا بھی آسان کام نہ رہا ہوگا۔ کچھ تعجب کی بات نہ ہوگی اگر منشی نول کشور نے کتابوں کے اسٹاک رجسٹر بنانے اور کتابوں کے آسانی سے نکلوانے کے لیے بالکل نئے طریقے وضع کیے ہوں۔ مثلاً جو کتابیں زیادہ فروخت ہوتی ہوں گی انھیں سامنے رکھا جاتا ہوگا، جو کتابیں متفرق ایک دو کی تعداد میں لیکن تیزی سے فروخت ہوتی ہوں گی انھیں الگ رکھا جاتا ہوگا، وغیرہ۔ ممکن ہے کارپردازانِ مطبع کو اسٹاک بنانے اور اسٹاک شماری کے نئے طریقوں سے واقفیت رہی ہو جو اس زمانے میں ایجاد ہو رہے تھے۔

یہ سوال بھی تحقیق طلب ہے کہ طباعت کے حسن اور درستی کے باب میں نول کشور پریس کی کتابیں دوسرے پریسوں، خاص کر دہلی، کانپور اور میرٹھ کے مطابع اور خود لکھنؤ کے دوسرے مطابع، مثلاً مطبع سلطانی کی کتابوں کے مقابلے میں کہاں ٹھہرتی ہیں؟ غالب نے تو لکھا ہے کہ لکھنؤ کے چھاپہ خانے میں جو کتاب چھپتی ہے اس میں چار چاند لگ جاتے ہیں اور دہلی کے مطابع کا معیارِ طباعت بہت خراب ہے، لیکن دوسری طرف یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ نول کشور کتابوں کی صحتِ متن کا معیار عام طور پر بہت اعلیٰ نہ تھا۔ پھر کاغذ کے معاملے میں بھی نول کشور پریس کا معیار یکساں نہ تھا۔ ان کی زیادہ تر کتابیں خراب کاغذ پر شائع ہوتی تھیں۔ یعنی نول کشور پریس نے کثرت کو مدنظر رکھا اور کثرت کی خاطر کیفیت کا خیال نہ رکھا۔ اس طرح ان کی کتابیں دور دور تک پھیل تو گئیں لیکن اتنی دیرپا

Scanned with CamScanner

نہ رہیں جتنی ہو سکتی تھیں۔ یہ بات بھی تحقیق کا تقاضا کرتی ہے کہ منشی صاحب کے اپنے پریس کا کاغذ بہتر تھا یا وہ کاغذ جسے وہ مثلاً سریرام پور کے کارخانے سے تھوک کے بھاؤ خریدتے تھے، اور اپنا کارخانہ قائم کرنے کی ضرورت انھیں کیوں پیش آئی؟ کیا اس معاملے کا تعلق محض منافع سے تھا یا اس بات سے بھی کہ کاغذ کی کثیر مقدار بازار سے بروقت دستیاب ہونے میں مشکل ہوتی تھی؟ یا پھر بات یہ تھی کہ منشی صاحب کو دوسرے کارخانوں کے کاغذ پسند نہ آتے تھے، لہٰذا انھوں نے اپنا کارخانہ قائم کیا؟

نول کشور پریس کا ایک بہت بڑا کارنامہ داستانِ امیر حمزہ کی چھیالیس جلدوں کی اشاعت ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ دوسرے متون جو پریس سے شائع ہو کر محفوظ ہوئے ان میں سے اکثر ایسی ہیں جنھیں کوئی نہ کوئی ادارہ یہاں سے یا ایران یا مصر و عرب سے شائع کر ہی دیتا، لیکن داستانِ امیر حمزہ ایسا متن ہے جسے نول کشور کے سوا کوئی بھی شائع نہ کر سکتا تھا، لہٰذا اگر نول کشور پریس داستانِ امیر حمزہ کو شائع نہ کرتا تو یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ناپید ہو جاتی اور ہم ایسی شے سے محروم رہ جاتے جسے دنیا کے تخیلاتی ادب کے عظیم ترین کارناموں میں شمار کیا جانا چاہیے۔

داستان کی تحریر اور اشاعت کے متعلق بہت سے مسائل ہیں جو ابھی تک حل نہیں ہو سکے ہیں۔ ان کا ذکر میں نے اپنی کتاب [1] میں بہت تفصیل سے کیا ہے، لہٰذا یہاں ان سے صرفِ نظر کرتا ہوں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا میں کم ایسا ہوا ہوگا کہ ایک ہی ادارے نے کئی تہذیبوں اور کئی ادبی اور علمی روایتوں کی ایسی وسیع الذیل اور دیرپا خدمات انجام دی ہوں۔ منشی نول کشور کو جدید ہندوستان کی تہذیب تاریخ میں مردِ جلیل کی حیثیت حاصل ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ جامعہ اور اس کے شعبۂ اردو نے اس قابل قدر ہستی کی زندگی اور کاموں کے محاکے اور ان پر تبصرے اور مطالعے کی غرض سے اس سیمینار کا انعقاد کیا۔ میں صدر شعبۂ اردو اور ان کے رفقا کو مبارک باد دیتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اس سیمینار کے ذریعے نول کشوری مطالعات میں معتدبہ اضافہ ہوگا۔

❊❊

---

1 ساحری، شاہی، صاحبقرانی: داستانِ امیر حمزہ کا مطالعہ، جلد اوّل: نظری مباحث (1999)، جلد دوم: عملی مباحث (2006)، جلد سوم: جہانِ حمزہ (2006)، ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔ (جلد چہارم ابھی شائع ہونا باقی ہے۔)

Scanned with CamScanner

کچھ کھویا، کچھ پایا

رالف رسل کی خودنوشت سوانح کا دوسرا حصہ

1945 سے 1958 تک

(LOSSES, GAINS)

Part II

of the autobiography of Ralph Russell

1945-1958

مصنف:

رالف رسل

(بہ تعاون میرین مولٹینو)

مترجم:

ارجمند آرا

Scanned with CamScanner

10

سوال ہی سوال، جواب کوئی نہیں

اس تمام عرصے میں میری اور کرس کی ملاقاتیں اکثر ہوتی رہتی تھیں ــ عموماً لنچ کے وقت لندن اسکول آف اکنامکس کے قریب واقع ایک کیفے میں۔ جس موضوع پر ہم اکثر و بیشتر بات کرتے وہ پیچیدہ تر ہوتے ہوئے سیاسی ماحول میں کوئی نمایاں قیادت دینے میں پارٹی لیڈروں کی ناکامی تھا۔ مجھے نہیں لگتا کہ اس عمومی بات سے 1945 کے دور میں کمیونسٹ طرزِ فکر کی خامیوں کی سنگینی اور اس مسئلے پر ہمارے مسلسل غور و فکر کا کوئی مناسب اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ضروری یہ تھا کہ تمام سنجیدہ قسم کے کمیونسٹ اسی نہج پر غور کریں جس پر میں اور کرس سوچ رہے تھے، مگر لگتا ہے کہ ہماری طرح سوچنے والا کوئی اور نہ تھا۔ (اس باب میں شامل حواشی، جو دیباچے میں مذکور قارئین کے ایک خاص حلقے کے لیے بالخصوص تحریر کیے گئے ہیں، شاید ہمارے محسوسات کو قارئین تک پہنچا سکیں۔) ایک بڑا مسئلہ یہ تھا کہ پارٹی نے اپنی گزشتہ پالیسیوں کا از سرِ نو تجزیہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ برطانیہ کے لوگ یہ نہیں بھولے تھے کہ کچھ عرصے کے لیے ہی سہی، لیکن 1939 میں کمیونسٹوں نے جنگ سے حمایت واپس لے لی تھی۔ کمیونسٹ اس مسئلے پر نکتہ چینی کا ہدف تھے، اور اس میں کچھ غلط بھی نہ تھا۔

کرس نے اور میں نے طے کیا کہ اس سلسلے میں ہم ہیری پولٹ (Harry Pollitt) کو خط لکھیں ــ ضرورت تھی کہ کوئی ان کو ہمارے سوالوں اور پالیسی سے متعلق دوسرے گمبھیر سوالوں کا جواب دینے کی ضرورت سمجھا سکے۔ انھوں نے جواب دیا تو لیکن وہ ہمیں یکسر مطمئن نہ کر سکا۔ 1939 کی پالیسی کے بارے میں انھوں نے لکھا:

> ابتدا میں ہم نے اس موضوع پر بحث کی تھی لیکن غور کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ

Scanned with CamScanner

یہ مناسب نہیں ہوگا کہ برطانوی کمیونسٹ پارٹی اس پر باضابطہ بحث کرے اور اپنے خیالات کی اشاعت کرے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر بھی متعلقہ کمیونسٹ پارٹیوں کی مشترکہ فکر سے ہی کسی نتیجے پر پہنچا جاسکتا تھا۔ فی الحال، اور آج کی تاریخ میں یہ بات واضح ہے کہ یہ کوئی مرکزی اہمیت کا حامل سوال نہیں ہے۔ . . . یہ ایسا مسئلہ ہے جس پر مختلف پارٹیوں کی اجتماعی لیڈرشپ کو غور وفکر کرنا ہوگا۔ موجودہ حالات اس قسم کے اجتماعی مباحثے کے لیے سہولیات فراہم کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔

پولٹ کا یہ جواب مجھے صرف حقیر ہی لگا۔ ''مختلف پارٹیوں کی اجتماعی لیڈرشپ کے ذریعے غور وفکر'' سے واضح مراد ''کومنٹرن'' تھی۔ دوسرے الفاظ میں وہ یہ کہہ رہا تھا کہ جب تک کومنٹرن کا احیا نہیں کیا جائے گا (سب جانتے تھے کہ ایسا کبھی نہیں ہوگا) اس وقت تک بین الاقوامی سطح پر معروف رہنماؤں تک کو یہ حق حاصل نہیں کہ اس مسئلے پر وہ اپنے خیالات ظاہر کریں۔

ایک اور مسئلہ جو موجودہ حالات میں کہیں زیادہ اہمیت رکھتا تھا، پارٹی کی جانب سے اس بصیرت کی کمی کا تھا کہ موجودہ برطانوی حالات میں سوشلزم لانے کے لیے کون سا طریقہ اختیار کیا جائے۔ میں نے اور کرس نے پارٹی کے شعبۂ تعلیم کو لکھا: ''ہزارہا برطانوی مزدور یہ مانتے ہیں کہ حکومت میں لیبر پارٹی کی اکثریت کے سبب اس ملک میں سوشلزم کی تعمیر کا کام شروع ہو چکا ہے۔''

ہمیں معلوم تھا کہ لیبر پارٹی کسی قسم کی بنیادی سماجی تبدیلی نہیں لائے گی لیکن ہماری پارٹی کے سامنے تو یہ بالکل بھی واضح نہیں تھا کہ سوشلزم کی راہ کو کیسے عبور کیا جاسکتا ہے۔ اس سے پہلے ہم سدا یہی کہتے رہتے تھے کہ اس کے لیے ''پرولتاریہ کی ڈکٹیٹرشپ'' کا قیام سب سے ضروری ہے۔

یوروپ میں صورتِ حال جس تیزی سے بدل رہی تھی اس سے بھی ایسے سوال پیدا ہو رہے تھے جن کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ان تمام علاقوں میں جو پہلے جرمنی کے قبضے میں تھے، خواہ مغرب میں یا مشرق میں، اب نازی اثرات ختم کرنے (denazifying) کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ سوال یہ تھا کہ ان ملکوں میں اب کس قسم کی حکومتیں قائم ہوں۔ سوویت یونین کے نزدیک بنیادی اہمیت اس بات کی تھی کہ گزشتہ دو عالمی جنگوں میں جرمنی کی طرف سے دوبار حملے جھیلنے کے بعد وہ اب اپنے سرحدی

Scanned with CamScanner

ممالک میں ایسی حکومتوں کو برداشت نہیں کر سکتا تھا جو اس کی دشمن ہوں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مشرقی یوروپ میں ایسی حکومتوں کی ضرورت تھی جو اگر کمیونسٹ نہ بھی ہوں تو کم از کم کمیونسٹ دشمن نہ ہوں۔ لیکن جنگ کے بعد کے حالات میں ایسی ترکیبیں کرنے کی اسے کوئی خاص آزادی نہیں رہ گئی تھی۔ جنگ کے سبب اس کی معیشت تباہ ہو چکی تھی اور صنعتی نظام تقریباً پوری طرح تباہ ہو چکا تھا۔ کمزور پڑ جانے کے سبب پہلی ضرورت یہ تھی کہ وہ پہلے سکون سے تعمیر نو کے کام میں لگ جائے۔ اس کے لیے بین الاقوامی تعلقات میں ترجیح اس بات کو دی جانی ضروری تھی کہ ہر ممکن حد تک جنگ کے زمانے کے اتحادی ممالک کے ساتھ بہتر سے بہتر رشتے استوار رکھے جائیں۔ برطانیہ کی معیشت بھی کمزور ہو گئی تھی اور اس کی دورانِ جنگ کی ضرورتوں کی بھرپائی امریکی قرضوں سے ہو رہی تھی۔ ہندستان میں آزادی کی تحریک زوروں پر تھی جس کا مسلسل دباؤ بھی برطانیہ پر پڑ رہا تھا۔ اس لیے برطانیہ بھی اس حالت میں نہیں تھا کہ یوروپ میں اسی قسم کی محاذ آرائی کا متحمل ہو سکے۔

اس صورتِ حال میں ابتدا میں دونوں اتحادیوں نے بڑی احتیاط سے کام لیتے ہوئے ایسی حکومتیں قائم کیں جن کے لیے وہ ایک دوسرے پر اعتراض نہ کر سکیں۔ مغرب میں (فرانس، اٹلی، آسٹریا، ناروے، بلجیم اور ڈنمارک) کی نو ساختہ حکومتوں میں کمیونسٹ بھی شامل کیے گئے۔ سوویت یونین نے بھی اس بات کا پورا خیال رکھا کہ مغرب کے مطالبات پورے ہوں۔ 1945 میں اس نے ہنگری میں آزاد انتخاب ہونے دیے جن میں کمیونسٹ ہار گئے۔ انھوں نے صرف سترہ فی صد ووٹ حاصل کیے۔ اسی برس جب امریکہ نے الزام لگایا کہ بلغاریہ کے انتخابات میں دھاندلی ہو رہی ہے تو انتخابات کو ملتوی کیا گیا۔ دوسری جگہ ایسے لوگوں پر مشتمل حکومتیں قائم کی گئیں جنھوں نے فسطائیت کی مخالفت کی تھی۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ کمیونسٹ تھے لیکن غیر کمیونسٹوں کو بھی حکومتوں میں شامل کیا گیا۔

دونوں جانب کے حکمرانوں نے یہ مان لیا تھا کہ نئی ریاستیں 'جمہوری' ہوں گی۔ لیکن تناؤ پیدا ہونا لازمی تھا کیونکہ دونوں کا جمہوریت کا تصور ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھا۔ کمیونسٹ لوگ مغرب کی 'بورژوا ڈیموکریسی' کو ایک ایسا نظام مانتے تھے جس میں ریاست مزدوروں کے مقابلے میں ہمیشہ سرمایہ داروں کے مفادات کا تحفظ کرتی ہے اور صرف اسی وقت تک جمہوری آزادیوں کو فروغ دیتی ہے جب تک کہ سرمایہ داروں کی حکمرانی معرضِ خطر میں نہیں آتی۔ (ہمارا یہ خیال بالکل

Scanned with CamScanner

درست تھا، جیسا کہ 1936 میں اسپین کی مثال سے ثابت تھا۔) اس کے برخلاف، میرا اور کرس کا خیال تھا (جیسا کہ اس وقت سوویت یونین سے باہر کے تمام کمیونسٹ مانتے تھے)، سوویت ڈیموکریسی عام لوگوں کی اکثریت کے مفادات کے لیے کام کرتی ہے۔ ہم یہ بات سمجھتے تھے کہ موجودہ حالات میں اگر سوویت اقتدار نے ان ممالک میں سوویت نظام لانے کی کوشش کی تو مغربی ممالک شدید ردعمل ظاہر کریں گے، لیکن ساتھ ہی ہمیں یہ بھی یقین تھا کہ اس قسم کی تبدیلی ضرور آئے گی اور یہ عام لوگوں کے مفادات کے حق میں ہوگی۔

ان میں سے چند ممالک نے فی الحقیقت اشتراکیت کی سمت میں پیش رفت شروع کردی تھی۔ چیکوسلوواکیہ میں یہ تبدیلی سب سے واضح طور دیکھی جاسکتی تھی جہاں جنگ سے پہلے کمیونسٹ پارٹی خاصی مضبوط تھی اور مزاحمت کے دور میں اپنے قائدانہ رول کے سبب اس کے دائرۂ اثر میں اضافہ ہوا تھا۔ جس وقت جنگ کا خاتمہ ہوا تو مشرقی یوروپی ممالک کی وہ حکمراں قوتیں کمزور پڑگئیں جنھوں نے فسطائی حکومتوں کی حمایت کی تھی اور اب فسطائیت کے زوال نے ان کو شدید طور پر کمزور کردیا تھا۔ اب سوویت نظام ان تمام لوگوں کی کھلے طور پر حمایت کررہا تھا جو فسطائیت مخالف تھے اور اس طرح ترقی پسند قوتوں کو اپنے اپنے ممالک میں اپنی قوت کو مستحکم کرنے کا موقع مل رہا تھا۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ یہ عمل، جو قابض فوجوں کے سبب شروع تو ہوا تھا لیکن وہ اس کی راہ متعین نہیں کررہی تھیں، ایسی حکومتوں کے قیام کا سبب بنے گا جن کو 'عوامی جمہوریت' کا نام دیا جاسکتا ہے — نہ وہ بورژوا جمہوریتیں ہوں گی اور نہ سوویت جمہوریتیں، بلکہ درمیان کی کوئی نئی شے ہوں گی جن کو ابھی تک کوئی نام نہیں دیا گیا ہے۔

اسی دوران مشرقی اور مغربی قوتوں کے درمیان تعلقات میں تناؤ آنا شروع ہوگیا۔ روزویلٹ کا انتقال ہوچکا تھا اور اب ٹرومین اس کا جانشین تھا جس نے اپنے شدید سوویت مخالف نظریات کو چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ مارچ 1947 میں اس نے اپنے اس نظریے کا اعلان کیا جو بعد میں ٹرومین نظریہ (Truman doctrine) کہلایا۔ اس کے مطابق دنیا کو براہِ راست دو خیموں میں تقسیم کردیا گیا — ایک خیمہ ''آزادی سے محبت رکھنے والا'' (freedom loving) اور دوسرا اشتراکی بالادستی والا (communist dominated)۔ اشتراکیت کی حمایت میں اضافے کو، چاہے وہ مشرقی یوروپ میں ہو یا پھر مغربی ممالک میں، اس نے سوویت حملے کے مترادف قرار دیا، اور

یہ بات واضح کردی کہ سوویت یا اشتراکی اثر میں اضافے پر ریاست ہائے متحدہ امریکہ بھی اس ملک کے اندرونی معاملات میں کسی نہ کسی قسم کی مداخلت کرنے میں حق بجانب ہوگا۔ اس سیاسی حملے کے بعد جلد ہی معاشی حملہ مارشل پلان کی صورت میں کیا گیا۔ اس پلان کا مقصد مغربی یوروپ پر امریکہ کا معاشی تسلط قائم کرنا اور مشرقی یوروپ اور سوویت یونین میں قدم جمانا تھا۔ مئی 1947 میں امریکہ کے اشارے پر فرانسیسی حکومت سے کمیونسٹوں کو خارج کردیا گیا اور پھر اٹلی میں بھی ایسا ہی کیا گیا۔

بڑھتی ہوئی سرد جنگ کے ماحول میں مشرقی یوروپ کے بارے میں برطانوی عوام کو اپنے ذرائع اطلاعاتِ عامہ سے یہ پتا چلا کہ سوویت فوجیں جن جن ملکوں میں داخل ہوئی تھیں وہاں وہاں لوگوں کی مرضی کے خلاف وہ اپنا نظامِ حکومت تھوپ رہی تھیں۔ سرمایہ داروں کے اخبار جو کچھ کہتے ہم اس کو گھٹا کر دیکھنے کے عادی تھے لیکن اب ہمارے پاس اس کا جواب دینے کے لیے کسی قسم کی کوئی اطلاع نہیں مل رہی تھی۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ جو کچھ پیش آرہا تھا ہم اس کو سمجھیں اور اس کے بارے میں پارٹی کا موقف جانیں۔

پارٹی کے پاس کہنے کے لیے بہت ہی کم تھا۔ آفیشیل لائن کے تحت ہماری پارٹی اس پر اصرار کرتی تھی کہ مشرقی یوروپ میں جو حکومتیں قائم ہوں گی وہ عوامی جمہوریتیں ہوں گی، لیکن اس کے کیا معنی تھے؟ اگر اس کو اشتراکی سماج کے قیام کی جانب ایک قدم سمجھا جائے تو بھی یہ مقصد کس طرح حاصل کیا جائے گا؟ ان میں مختلف سماجی طبقات کا کیا رول ہوگا؟ جہاں تک ہمیں علم تھا، برطانوی پارٹی میں سے یا کہیں اور کی کمیونسٹ پارٹی کے رہنماؤں میں سے کوئی بھی اس صورتِ حال کا تجزیہ نہیں کر رہا تھا اور نہ کمیونسٹ حکمت عملی کی کوئی تجویز رکھ رہا تھا۔ بین الاقوامی پالیسی سے متعلق معاملات پر پارٹی کے اراکین کا رویہ پریشان کن حد تک منفعل تھا۔ سوویت یونین کی لیڈر شپ کی ہر بات ماننے کی طویل تاریخ کے سبب یہ صورتِ حال ہوگئی تھی کہ پارٹی کے بیشتر اراکین نے ناقدانہ انداز میں سوچنا بند کردیا تھا۔ انھوں نے یہ سوویت یونین پر چھوڑ دیا تھا کہ وہ جو مناسب سمجھے کرے، ان کو اس سلسلے میں سوچنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ عوامی جمہوریت کیا ہے؟ کیا یہ عوامی جمہوریت نہیں ہے؟ ایسے سوالوں پر مزید سوچنے کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔

اپریل 1947 تک آتے آتے کرس نے اور میں نے طے کرلیا کہ اگر پارٹی لیڈر شپ اس

Scanned with CamScanner

چیلنج کو قبول کرنے کو تیار نہ ہوئی تو ہم کریں گے۔ ہم دونوں نے ایک مضمون لکھنا شروع کیا جس کا عنوان تھا: The Transition to Socialism، اور اس میں پارٹی لیڈرشپ اور ان اراکین سے خطاب کیا گیا تھا جو بین الاقوامی معاملات پر ناقدانہ انداز میں سوچتے تھے۔ ان ممالک کے معاشروں میں ہونے والی حقیقی تبدیلیوں کا ہمیں علم نہیں تھا جبکہ صورت حال کے تجزیے کے لیے ہمیں یہ اطلاعات ملنا ضروری تھیں۔ ان ممالک کے باہر کوئی بھی شخص ان کے حالات نہیں جانتا تھا اور جو لوگ وہاں رہتے تھے ان کے لیے بھی مکمل تصویر پیش کرنا مشکل تھا۔ اس لیے ہم نے مارکسی اصولوں کی روشنی میں ان سوالوں کی تشریح کی کوشش کی جن کو واضح کرنے کی ضرورت تھی۔ بحث کے آخر میں ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ دوسرے مواقع پر انقلابی سماجی تبدیلی کے امکانات کی مارکسیت پسندوں نے کس طرح تفہیم کی ہے۔ انیسویں صدی کے یوروپ میں تبدیلی کے امکانات کا جائزہ لیتے ہوئے مارکس نے بتایا تھا کہ یہاں کسی ملک کی حدود میں طویل المدت انقلابی جدوجہد کرنی پڑے گی جو بالآخر سرمایہ داری قوتوں کو شکست دے گی۔ لینن نے 1917 میں روس میں تیزی سے آنے والی تبدیلیوں کے تجزیے کے لیے سوویت نظام کی طرف پیش رفت کے لیے مارکسی نظریات کی مدد لی تھی۔ لیکن اب مشرقی یوروپ میں جو کچھ پیش آ رہا تھا وہ اس پر ان میں سے کوئی بھی ماڈل صادق نہیں آ رہا تھا۔

جب ہم اپنے مضمون پر کام کر رہے تھے تو ٹوگلیاٹی (Togliatti) کا ایک مضمون ہمارے ہاتھ لگا جو اس نے اکتوبر 1936 میں لکھا تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا اگر اسپین میں فرانکو کی بغاوت کو کچل دیا گیا تو ری پبلکن حکومت کس قسم کا انقلاب لائے گی اور اسپین میں کیسی حکومت قائم ہوگی۔ 1936 میں ہم نے اس کو یقیناً پڑھا ہوگا لیکن فی الحال یہ ہمارے لیے 'دریافتِ نو' کی حیثیت رکھتا تھا۔ (یہ واضح ہے کہ کوشش یہ کی گئی تھی کہ کمیونسٹ اس مضمون کو بھول جائیں کیونکہ اسٹالن، اور اس کی وجہ سے کمیونسٹ تحریک کے تمام رہنما، انقلاب کے پہلو پر زور نہیں دینا چاہتے تھے) ہم نے محسوس کیا کہ یہ مضمون مشرقی یوروپ کے واقعات کے حوالے سے اہمیت کا حامل تھا کیونکہ اس میں خصوصاً یہ بتایا گیا تھا کہ فسطائیت کی شکست کے بعد آگے کیا کرنا چاہیے۔

یہ بات درست ہے کہ ایسے کئی پہلو تھے جو 1936 کے اسپین کے حالات سے مختلف تھے۔ اسپین میں اسپینی عوام خود فسطائیت کا خاتمہ کر رہے تھے۔ اس کے برخلاف مشرقی یوروپ میں یہ کام

Scanned with CamScanner

سرخ فوجیں کررہی تھیں۔ جو بھی ہو، نتیجہ یہی تھا کہ فسطائیت کی بیخ کنی ہورہی تھی اور اس کے خاتمے نے ان تبدیلیوں کے در کھول دیے تھے جو ٹوگلیاٹی نے اسپین کے حوالے سے بیان کی تھیں۔

پڑھائی سے جب بھی فرصت ہوتی، میں اور کرس اپنے مضمون پر کام کرتے تھے اور اس طرح ہم نے چار مہینے تک کام کیا۔ اگست 1947 میں ہم نے پارٹی کے شعبۂ تعلیم کو اس امید کے ساتھ یہ مضمون دیا کہ بحث کو آگے بڑھانے میں اس کا استعمال کیا جائے گا۔ آج جب پیچھے دیکھتا ہوں تو اس مضمون کی تمہید کے مودبانہ انداز سے خوب محظوظ ہوتا ہوں۔ ایک طرف تو ہم ان سوالوں سے چشم پوشی کرنے پر پارٹی لیڈرشپ پر بالواسطہ نکتہ چینی کر رہے تھے لیکن دوسری جانب ہم نے ان کو جس طرح چیلنج کیا تھا اس پر بھی متوقع تھے کہ ہمارے 'مساوی' کامریڈ اس کو آسانی سے ہضم کرلیں گے جو ہمارے مقابلے میں خود کو کچھ زیادہ ہی مساوی سمجھتے تھے۔ ہم نے اپنی بات کچھ یوں شروع کی تھی: ''ہمیں شاید پیش بندی کے طور پر اس احساس کا جواب دینا چاہیے جو بہت سے کامریڈوں کے دلوں میں پیدا ہورہا ہے۔ وہ یہ کہ اگر برطانیہ میں ہمارے رہنما ان مسائل پر کسی قسم کی وضاحت پیش کرنے کی ذمہ داری محسوس نہیں کرتے تو پھر...'' اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہم نے باسٹھ صفحات اور چودہ ہزار سے زائد الفاظ پر مشتمل دستاویز لکھنے میں کس قدر دیدہ ریزی سے کام لیا ہوگا۔

جیسا کہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے، شعبۂ تعلیم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کے پاس بڑے مضبوط ڈپلومیٹک اسباب تھے کہ وہ اس سے چشم پوشی کریں، جیسا کہ پولٹ نے بھی کہا تھا۔ اس کے بعد کئی مہینوں تک میں اور کرس اس مضمون کی نقلیں پارٹی کے ہر ایسے رکن کو دیتے رہے جس کے بارے میں ہمیں خیال گزرتا کہ وہ دلچسپی ضرور لے گا۔ لیکن ہر بار نتیجہ یہی تھا کہ کسی نے جواب نہیں دیا۔ افسوس کہ پارٹی کے اندر ناقدانہ بحث و تمحیص کے ماحول کو گھن لگ چکا تھا۔

جب ہم اپنے مضمون پر کام کررہے تھے انھی دنوں پراگ میں ایسے واقعے کی تیاریاں ہورہی تھیں جس سے مشرق اور مغرب کے درمیان دوستانہ مراسم بنائے رکھنے کی عوامی خواہش کا اظہار ہوتا ہے، گو کہ سرد جنگ شروع ہوچکی تھی۔ یہ واقعہ تھا جمہوریت پسند نوجوانوں کی عالمی فیڈریشن (World Federation of Democratic Youth) کے زیر اہتمام منعقدہ ورلڈ یوتھ فیسٹول۔

Scanned with CamScanner

یہ ان چند عالمی تنظیموں میں سے ایک تھی جن کو واقعی ان معنوں میں عالمی فیڈریشن کہا جا سکتا ہے کہ اس میں مختلف سیاسی نظریات رکھنے والی بہت سی تنظیموں کو رکنیت حاصل تھی۔ سرد جنگ میں یقین رکھنے والے ممالک خود بھی دوستانہ ماحول کے قیام کے اس عوامی جذبے کی جانب دھیان دینے کی ضرورت کو محسوس کرتے رہے ہوں گے لیکن صرف اسی وقت تک جب تک کہ لوگوں کو یہ یقین نہ دلا دیں کہ مشرق اور مغرب کے درمیان کشیدگی میں سوویت یونین کی غلطی ہے، ان کی نہیں — اور بالآخر وہ ایسا کرنے میں کامیاب بھی ہوے۔

نوجوانوں کے اس جشن کے خیال نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ ایک عام شہری کے طور پر انگلینڈ سے باہر جانے کا چونکہ یہ میرا پہلا موقع تھا اس لیے مجھے پاسپورٹ بنوانے کی ضرورت پڑی۔ اس کے لیے مجھے ایک ریفری چاہیے تھا، چنانچہ یہ بہتر معلوم ہوا کہ میں اپنے کمیونسٹ دوستوں کے بجاے کسی ایسے شخص کا نام دوں جو حکمرانوں کے لیے قابل قبول ہو۔ اس لیے میں نے روپر (Roper) کا نام دیا جو چگویل میں چیپلن رہ چکے تھے اور میرے دوست تھے۔ مئی 1947 میں مجھے روپر کا یہ چندرانے والا جواب ملا۔

> میرے عزیز رالف، سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کس شرارت پر اُتارو ہو۔ پچھتر پونڈ میں نہ تو تم بہت دور تک جا سکتے ہو اور نہ زیادہ دن گزارا کر سکتے ہو، اور جہاں تک مجھے معلوم ہے ملک کے باہر کوئی اس سے زیادہ رقم نہیں لے جا سکتا۔ پھر بھی اگر تم پراگ جاؤ تو خود کو کھڑکی کے باہر نہ پھنکوا بیٹھنا۔

(انھوں نے defenestrated کا لفظ استعمال کیا تھا جس کے معنی تھے کہ اپنے سیاسی مخالفین کے ہاتھوں کھڑکی سے باہر پھینک دیا جانا۔ یہ پروٹسٹنٹ اور کیتھولک رہنماؤں کے درمیان چلنے والے تیس سالہ معرکے کی جانب اشارہ تھا جس میں پراگ کے قلعے میں دو آدمیوں کو ایک کھڑکی سے باہر پھینک دیا گیا تھا۔ اس واقعے کو کسی صورت برطانیہ کی مکتبی طرز کی تاریخ کی کتابوں میں جگہ مل گئی تھی۔)

جب میں نے مزگروور ی میں اپنے ارادے کے بارے میں بات کی تو مولی مزگروف نے بھی اس فیسٹول میں شرکت کا فیصلہ کیا۔ تقریباً ایک برس سے ہم لوگ ایک دوسرے کے نزدیک رہائش پذیر تھے اور ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف تھے اس لیے یہ خیال مجھے اچھا ہی لگا۔ میرے ذہن

میں دھندلا سا خیال ہے کہ اس کے اخراجات سفر کی ذمہ داری میں نے لے لی تھی کیونکہ اس کے لیے یہ مصارف برداشت کرنا ممکن نہیں تھا۔

یوں جولائی 1947 میں ہم لوگ ساتھ ساتھ نکل پڑے۔ اتفاق سے لیڈز کا میرا پرانا دوست پیٹر چیپل (Peter Chapple) اور اردو گفتگو میں حصہ لینے والا ساتھی اسرار بھی راستے میں ہمارے ساتھ آ ملے۔ ہم سب نے ایک بے حد خوشگوار اور تفریح سے بھرپور سفر طے کیا۔ پیٹر اور مولی کا ساتھ بڑا مزے دار رہا۔ ہوا یوں کہ مذاق مذاق میں اس نے مولی کا ایک جوتا اٹھا کر ٹرین سے باہر پھینک دیا لیکن اس کے پاس چونکہ ایک جوڑی جوتے اور تھے اس لیے اس واقعے کو اس نے تفریح کا حصہ سمجھ کر ٹال دیا۔ اسرار شاید پہلا ہندستانی تھا جس سے اس کی ملاقات ہوئی اور مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ وہ اس سے اپنے فطری انداز ہی میں ملی۔ وہ ہر شخص سے اسی طرح ملتی تھی اور اس کے ہاں نسلی تعصب نام کو بھی نہ تھا۔

جنگ ختم ہوئے دو برس ہو گئے تھے لیکن اب بھی ہر جگہ اس کے اثرات باقی تھے۔ جب ہم پیرس میں رکے تو ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ سڑکوں پر تازہ پھول ان جگہوں پر رکھے ہوئے تھے جہاں مزاحم جنگجو مارے گئے تھے۔ جن مضافاتی علاقوں سے ہمارا گزر ہوا وہاں جنگ سے پہنچنے والے نقصانات کا اثر ابھی تک باقی تھا۔ ہم سستے کوئلے کے انجن والی ٹرینوں سے سفر کر رہے تھے جن سے نکلنے والا دھواں اور دھول مٹی ہم سب پر گرتی رہتی تھی۔ ہمیں معلوم تھا کہ جب تک ہم پہنچیں گے تب تک ہم بالکل گندے ہو چکے ہوں گے لیکن اس کی کسے پروا تھی۔

ایسا ہی جوش و خروش میلے میں بھی دیکھنے کو ملا۔ ہم بڑے بڑے کمروں میں سوئے جن میں سے ایک کمرہ عورتوں کے لیے اور ایک مردوں کے لیے مخصوص تھا۔ ہر ملک کی ایک ایک ٹکڑی کو اس فیسٹول میں حصہ لینے کا موقع دیا گیا تھا جس میں اس کے اراکین اپنی اپنی سیاسی وابستگیوں سے قطع نظر ایسے گیت پیش کر سکتے تھے جن کو وہ متفقہ طور پر اپنا قومی گیت سمجھتے ہوں۔ برطانوی لوگوں کے لیے یہ سچ مچ ایک چیلنج تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ انھوں نے اپنے بیشتر لوک گیت خارج کر دیے کیونکہ ان میں تقریباً سبھی گیت یا تو اسکاٹ تھے، یا آئرش، ویلز، یا پھر انگلش۔ ایسا گیت جس پر کسی طرح سب متفق ہو سکے What shall we do with a drunken sailor جس کا ایک معقول سا فرانسیسی

Scanned with CamScanner

ترجمہ وہاں کے لوگوں کی سہولت کے لیے کرلیا گیا۔ فرانسیسی ہمیشہ اسی تاک میں رہتے تھے کہ ان کی تمام ضرورتیں پوری ہوتی رہیں۔ جب ان کو یہ لگتا کہ فرانسیسی ترجمہ پیش نہیں کیا جائے گا تو وہ بیک آواز چلانے لگتے تھے: !En Francais! En Francais برطانوی وفد میں خاصی تعداد میں کنزرویٹو نوجوان بھی شامل تھے جو بعض اوقات صرف اپنے اراکین کے لیے سیر کا اہتمام کرتے تھے۔ بہت سے لوگوں کو محسوس ہوا کہ یہ رویہ جشن کے ماحول کے منافی ہے، چنانچہ جب ان کو اس مفہوم کے نوٹس بھیجے گئے کہ کیا آپ فلاں مخصوص پروگرام میں شرکت کریں گے تو ان میں سے بعض نے غلط ناموں کا اندراج کردیا، مثلاً جوک اسٹریپ (Jock Strap) اور ولی گالیشر (Willie Gallacher) نے جو ویسٹ فائف سے کمیونسٹ ایم پی تھے۔ لیکن یہ حرکت مذاق کے طور پر کی گئی تھی کسی سنجیدہ عداوت کے سبب نہیں۔

ستمبر 1947 میں بالآخر سوویت یونین کے رہنماؤں نے یہ مانا کہ ایک بین الاقوامی کمیونسٹ تنظیم ضروری ہے اور اس لیے ایک نئی تنظیم بنائی گئی — (کمیونسٹ) انفارمیشن بیورو، جس کو جلد ہی ''کومنفورم'' (Cominform) کے نام سے شہرت مل گئی۔ دوسرے کمیونسٹوں کی طرح میں نے، اور کرس نے بھی، اس کی سرگرمیوں کا دلچسپی کے ساتھ مشاہدہ کیا۔ ہم توقع کررہے تھے کہ شاید اب بین الاقوامی صورت حال کا تجزیہ زیادہ توجہ سے کیا جائے گا جس کی بنیاد پر کمیونسٹ تحریک کے لیے کوئی منصوبہ بندی ہوسکے گی۔

لیکن شروع میں ہی بات واضح ہوگئی کہ یہ تنظیم سبھی تنظیموں کو متحد کرنے والی نہیں بنے گی جیسی کہ کومنٹرن تھی۔ اول تو یہ ہے کہ اس کی رکنیت محدود تھی۔ سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کے علاوہ اس میں چند عوامی جمہوریتوں مثلاً یوگوسلاویہ، پولینڈ، چیکوسلواکیہ کو شامل کیا گیا تھا۔ ان کے علاوہ اس کی سرحد پر واقع بلغاریہ، رومانیہ، اور ہنگری کو بھی شامل کیا گیا جنھیں ''ممالک جنھوں نے سامراجیت سے ناطہ توڑ لیا'' کا نام دیا گیا۔ سرمایہ دار ممالک میں سے صرف ان پارٹیوں کو شامل کیا گیا جو اپنے ممالک میں خاصی اہمیت رکھتی تھیں۔ یہ پارٹیاں فرانس اور اٹلی کی تھیں، ایشیائی پارٹیوں میں سے کوئی بھی اس میں شامل نہیں کی گئی۔ اس طرح اس تنظیم کو کسی طور بھی کومنٹرن کی مانند عالمی کمیونسٹ تحریک کی

Scanned with CamScanner

قائم مقام تنظیم ہرگز نہیں بن سکتا تھا۔

دوئم یہ کہ اس کا دائرۂ کار بہت محدود تھا — مختلف جماعتوں کے تجربات کا تبادلہ اور حسبِ ضرورت ان کی سرگرمیوں میں تال میل قائم کرنے تک۔ ستمبر 1947 میں ہونے والی اس کی فارمیشن میٹنگ کی اہم ترین بات یہ تھی کہ اس میں مسائل پر سرے سے بات ہی نہیں ہوئی، اور اس میں شامل رہنماؤں نے ایسی خبروں کا کوئی ذکر نہیں کیا جو وہ دنیا بھر کی دوسری کمیونسٹ پارٹیوں کو بتانا نہیں چاہتے تھے۔ زدانوف نے، جو سوویت پارٹی کے دو نمائندوں میں سے ایک تھے، بین الاقوامی صورتِ حال پر جو رپورٹ پیش کی تھی، اس کو نا معلوم اسباب سے آفیشیل کمیونسٹ مطبوعات میں شائع نہیں کیا گیا۔[1] اس کے علاوہ عالمی کمیونسٹ تحریک کے کچھ نزاعی مسائل تھے جن پر کوئی گفتگو نہیں کی گئی۔ ان میں سے ایک مسئلہ اس سوال سے متعلق تھا کہ جنگ کے زمانے کی مزاحمتی تحریکوں کو (جن میں سے بیشتر کی قیادت کمیونسٹ کر رہے تھے) کیا اپنے ہتھیار ڈال دینے چاہیے تھے؟ برطانوی اور امریکی فوجوں نے ایسا کرنے کا مطالبہ کیا تھا، جبکہ فرانس کی اندرونی فوجیں (forces of the interior) اگست 1944 ہی میں ایسا کر چکی تھیں۔ افواہیں یہ بھی گرم تھیں کہ ان میں شامل چند اہم کمیونسٹوں کا خیال یہ تھا کہ انھیں ہتھیار ڈالنے کے بجائے جنگ جاری رکھنی چاہیے تھی، اور اتحادیوں کے قبضے کی مخالفت کرنی چاہیے تھی، مثلاً جرمنی پر قبضے کی۔ لیکن یہ کون لوگ تھے ہمیں پتا نہیں چلا۔ اس کے بین السطور ہمارا اندازہ یہ تھا کہ یوگوسلاویہ نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ فرانسیسی اور اطالوی کمیونسٹوں نے برطانیہ اور امریکہ کے مطالبات کچھ زیادہ ہی مان لیے ہیں۔ کچھ لوگوں نے یہ بھی کہا کہ اٹلی میں چھاپہ ماروں نے خاموشی سے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ یونان میں کمیونسٹوں کی قیادت میں مزاحم افواج نے 1944 تک اپنے ملک کے ایک بڑے حصے کو جرمنی کے قبضے سے آزاد کرا لیا تھا۔ جب برطانوی فوجیں داخل ہوئیں تو انھوں نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا اور اب وہ اقتدار کے لیے برسرِ جنگ تھے۔ اس میں انھیں سوویت یونین کی کوئی حمایت حاصل نہ ہوئی۔ یہ حمایت کیوں نہیں مل رہی تھی؟

---

[1] اس سلسلے کا واحد متن جو ہم برطانیہ میں دیکھ سکے وہ کسی ڈبلیو بی کوٹس (W.B. Coats) کی جانب سے چھاپا گیا خلاصہ تھا، اور اہمیت کے اعتبار سے یہ تجزیہ اس کے پاسنگ بھی نہ تھا جو 1935 میں کومنٹرن کی ساتویں لیکن آخری عالمی کانگریس کے موقعے پر شائع ہوا تھا۔

Scanned with CamScanner

کومنفورم کے رہنماؤں کے حلقے کے باہر ان میں سے کسی سوال سے متعلق کوئی سچائی کسی کو معلوم نہ تھی اور وہ اس پر کچھ بھی کہنے کو تیار نہ تھے۔

ستمبر کی کانفرنس میں بھی چین کے بارے میں ان کے پاس کچھ کہنے کو نہ تھا۔ جاپان کی شکست کے بعد لوٹتی ہوئی سوویت فوجیں مفتوحہ علاقے چینی کمیونسٹوں کے بجائے کومنتانگ کے سپرد کر رہی تھیں۔ حالانکہ بڑی آسانی سے وہ یہ کر سکتی تھیں کہ خالی علاقے وہ پیش قدمی کرتی ہوئی پیپلز لبریشن آرمی کے حوالے کرتے جاتے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ انھوں نے ایسا کیوں نہیں کیا اور چینی کمیونسٹوں نے اس پر اعتراض کیوں نہیں کیا۔ میرے خیال میں ہمیں ہلکا سا اندازہ تھا کہ کومنٹرن کی قیادت کو باضابطہ تسلیم کر لینے کے باوجود وہ درحقیقت اپنے فیصلوں میں خود مختار تھے اور ظاہر ہے کہ وہ اب بھی اسی پر کاربند تھے۔

یہ بات بالکل عیاں تھی کہ بین الاقوامی منظرنامہ جس میں ہمیں کام کرنا تھا، تیزی سے بدل رہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سوویت کمیونسٹ اور پرانے کومنٹرن کے دوسرے رہنما، مثلاً اطالوی لیڈر ٹوگلیاٹی وغیرہ اس پوری صورتِ حال کا جائزہ لے رہے تھے، لیکن وہ اس جائزے سے ہمیں آگاہ نہیں کر رہے تھے۔

جیسا کہ ہوتا ہے کہ واقعات گزرنے کے بعد ان پر غور کرنا ہمیشہ آسان ہوا کرتا ہے۔ اس کی تہہ میں کارفرما مسئلہ یہ تھا کہ جنگ نے عالمی کمیونسٹ تحریک کی فوجوں کی صف بندی کو بدل ڈالا تھا۔ کمیونسٹوں کی قیادت میں ان مزاحمتی تحریکوں کے سامنے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اپنی اپنی جنگی منصوبہ بندی آزادانہ طور پر کریں۔ یوگوسلاویہ میں، سوویت یونین کی حمایت یا اس کے کسی حوالے کے بغیر، کمیونسٹ قیادت والی حکومت کا قیام عمل میں آیا تھا۔ چین میں انقلاب اور دوسرے ایشیائی ممالک میں مزاحمتی تحریکیں اپنے اپنے راستے پر خود آگے بڑھ رہی تھیں۔ ان تبدیلیوں کو عالمی کمیونزم کی کامیابی کے طور پر دیکھنے کے بجائے اسٹالن نے انھیں سوویت یونین کی بالادستی کے تئیں ممکنہ خطرے کے طور پر دیکھا۔ برسوں بعد مجھے یہ بھی پتا چلا کہ اسٹالن نے بغیر کسی لاگ لپیٹ کے چرچل اور روزویلٹ کو یقین دلایا تھا کہ ان کے زیر اثر ممالک میں ہم انقلاب کو ہوا دینا نہیں چاہتے۔ 1944 میں اسٹالن نے

چرچل کے ساتھ یہ معاہدہ کیا کہ یوروپ کو الگ الگ دائرۂ اثر والے حصوں میں بانٹ لیا جائے، بالکل اسی طرح جیسے سامراجی قوتوں نے پہلی جنگ عظیم کے بعد بانٹ لیا تھا۔ سوویت یونین کی سرحدوں پر واقع ممالک اسٹالن کے دائرۂ اثر میں رہیں گے اور یونان سمیت دوسرے ممالک چرچل کے دائرۂ اثر میں۔ چرچل نے اس کی توثیق کی تھی کہ اسٹالن نے معاہدے کا لحاظ کیا اور برسوں بعد یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ اس نے (اسٹالن نے) یونانی کمیونسٹوں کو نہ صرف اپنی جنگ لڑنے کو تنہا چھوڑ دیا بلکہ یونان کی شمالی سرحد سے لگی کمیونسٹ قیادت والی ریاستوں سے کہا کہ وہ برطانیہ کے خلاف یونانیوں کی مزاحمت کو دبانے میں مدد کریں۔ ہوروِوز (Horowitz) نے 1956 میں تحریر کردہ اپنی کتاب From Yalta to Vietnam میں اس ضمن میں امریکہ کے ایک اہم سیاست کار کینن (Kennan) کا قول نقل کرتے ہوئے بتایا کہ برطانوی اور امریکہ کے دائرۂ اثر والی ریاستوں میں اسٹالن کمزور حکومتوں کی عملداری چاہتا تھا، کمیونسٹ حکومتوں کی نہیں۔

ان معاملات سے متعلق، اور جنگ کے بعد کی سوویت پالیسی کے بارے میں، حقائق عالمی کمیونسٹوں کو قطعی نہیں بتائے گئے۔ اس وقت میرا وہی تجربہ جس سے میں دو برس قبل برطانوی کمیونسٹ پارٹی میں گزرا تھا، خود کو دہرا رہا تھا (فرق صرف یہ تھا کہ یہ تجربہ بین الاقوامی سطح پر تھا) جب میں نے پارٹی کانگریس میں پولٹ کو یہ کہتے ہوئے سنا تھا: ''اگر کوئی یہ سوچتا ہے کہ دوسری کمیونسٹ پارٹیوں کے ساتھ اپنے اختلافات کی ہم ہوا بھی لگنے دیں گے، تو وہ غلطی پر ہے''۔

Scanned with CamScanner

11

مولی سے اظہارِ الفت

ایڈیس (Ades) اور جوسیپاوِی (Josipovici) کے ایک غیر معروف ناول Gohar, the Fool کا ایک کردار، جو شادی کا خواہاں ہے، اپنے بارے میں کہتا ہے، ''مجھے محبت ہو گئی ہے، لیکن نہیں جانتا کہ کس سے۔'' بالکل یہی حال میرا بھی تھا۔ میں محبت کرنا چاہتا تھا اور چاہتا تھا کہ کوئی مجھ سے محبت کرے۔ میری عمر انتیس سال ہو چکی تھی، میں عورتوں میں دلچسپی لیتا تھا۔ لیکن کوئی مخصوص عورت نہ تھی جس سے مجھے محبت ہوتی۔ لگتا تھا کہ میں صرف مردوں کے درمیان رہتا ہوں، کہ مسز مزگروف کے تمام کرایہ دار مرد ہی تھے۔ پارٹی میں جن لوگوں سے میں قربت محسوس کرتا تھا وہ سب بھی مرد تھے۔ پارٹی کی اسٹارچ گرین شاخ میں شامل عورتیں ادھیڑ عمر اور شادی شدہ تھیں، اور چند جو جوان تھیں اور رسائی میں تھیں، میرے نزدیک کوئی کشش نہ رکھتی تھیں۔

کیمبرج کے زمانے کی میری بیشتر دوستوں کی شادی ہو چکی تھی۔ ویلیک ایبی کے کورسوں کے زمانے میں جن سے دوستی ہوئی تھیں ان میں بھی کوئی امکانات نظر نہیں آتے تھے۔ ٹوِگ (Twigg) میرے لیے اشتیاق رکھتی تھی لیکن مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اب وہ مزاجاً شکایتی اور بدحال ہو گئی تھی۔ اس نے کلاسکس میں ڈگری لینا طے کیا تھا اور مجھ سے ڈھیر کتابیں مستعار لے گئی تھی (جنھیں لوٹانے وہ کبھی نہیں پلٹی)۔ وہ ایک یہودی سے شادی کرنا چاہتی تھی جس کی ماں نے دھمکی دے رکھی تھی کہ اگر انھوں نے شادی کی تو وہ اپنا سر گیس کے چولھے میں جھونک دے گی۔ میرے خیال میں یہ

Scanned with CamScanner

بات انتہائی ناممکنات میں سے تھی کہ اس کی ماں کوئی ایسا قدم اٹھائے گی اور ٹوگ کو میں نے مضبوط لہجے میں مشورہ دیا تھا کہ شادی کر لو۔ جین ٹرزاب ایڈمنڈ پیننگ راؤسل (Edmund Penning Rowsell) کے ساتھ رہتی تھی۔ ایڈمنڈ کے پاس دیہات میں ایک گھر تھا (گھر کے ساتھ ایک بیوی بھی) اور لندن میں فلیٹ تھا (فلیٹ کے ساتھ جین)۔ اپنی سادگی میں مجھے صحیح صورتِ حال کا اندازہ لگانے میں وقت لگا۔ جب اس نے مجھے ''میرے اور جین کے ساتھ'' کہہ کر کھانے پر مدعو کیا تو میں نے اس کا یہ مطلب نکالا کہ پہلے اس کی جین سے ملاقات ہوئی ہوگئی اور اب مجھ سے ملاقات پر اس نے سوچا کہ تینوں ساتھ کھانا کھائیں تو اور بھی بہتر رہے گا۔ میں جب وہاں پہنچا اور جین کو کھانا بناتے ہوئے دیکھا تو بھی یہ بات میرے ذہن میں فوری طور پر نہیں آئی کہ وہ ساتھ رہتے ہیں۔

میرے آس پاس جتنے لوگ تھے، عملاً سب کے سب اپنے ساتھی تلاش کر چکے تھے۔ میں شادی کرنا چاہتا تھا، بچے چاہتا تھا اور زندگی کے لمبے سفر کے لیے ایک ساتھی کا متلاشی تھا لیکن کوئی نہیں تھی جس کو میں ممکنہ امیدوار سمجھتا۔

میں اس صورت حال سے گزر رہا تھا کہ ایک دن مزگرووری میں ایک غیر متوقع واقعہ پیش آیا۔ میں باورچی خانہ سے نکل کر اس تنگ راستے سے گزر رہا تھا جو زینے اور دیوار کے درمیان سے ہو کر صدر دروازے تک جاتا تھا۔ مولی کام پر جارہی تھی اور میں نے اس کا راستہ گھیر رکھا تھا۔ اس نے کہا، ''مجھے راستہ دو،'' تو میں جواب میں بول پڑا، ''تب پہلے بوسہ دو،'' اور اس نے میرا کہا مان لیا۔ تقریباً ایک برس کے بعد میں نے پہلی بار کسی عورت کو چوما تھا۔ یہ احساس میرے لیے بہت ہوشربا تھا اور میرے دل میں اور خواہش پیدا ہوئی۔ میں نے اب مولی کو ایک نئے انداز سے دیکھنا شروع کردیا۔ جب سے میں نے مزگرووری میں قدم رکھا تھا، ہم لوگ ہر روز شام کے کھانے پر ملتے تھے۔ لیکن میں نے اس کو ہمیشہ اس ماحول کا محض ایک حصہ ہی سمجھا تھا۔ باورچی خانے میں ہم گپ شپ کرتے تھے، پراگ میں ہم لوگوں نے ایک ہفتہ ساتھ ساتھ گزارا تھا۔ لیکن گروپ کے ساتھی کے طور پر، جوڑے کی صورت میں نہیں، پھر بھی وہ ہمارا ایسا مشترکہ تجربہ تھا اور ہم ایک دوسرے کی صحبت سے ہم محظوظ ہوتے تھے۔ ہم دونوں میں سے کسی نے بھی کوئی ایسا اشارہ نہیں دیا تھا کہ ہمیں ایک دوسرے کی ذات سے کوئی دلچسپی ہے۔ لیکن اب میرا جو اندازِ نظر بدلا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک پرکشش نوجوان عورت ہے جو اسی

Scanned with CamScanner

مکان میں رہتی ہے جہاں میں رہتا ہوں اور ادھر میں ہوں جسے محبت کی تلاش ہے۔

میں نے اس کی ان خوبیوں کے بارے میں غور کرنا شروع کیا جو مجھے پسند تھیں۔ اس میں بناوٹ نام کو نہ تھی، وہ ہر قسم کے لوگوں کے ساتھ بہ آسانی بات چیت شروع کر دیتی تھی، چاہے وہ بس کی قطار میں لگے اجنبی ہوں یا دوکانوں میں آئے ہوئے لوگ۔ وہ لوگوں سے انھی کی سطح پر ملتی اور جو کچھ اس کے ذہن میں آتا بلا جھجک کہہ دیتی تھی۔ ہم نے اپنی شامیں ساتھ ساتھ گزارنی شروع کر دیں — کبھی فلم دیکھنے میں، اور کبھی میرے کسی دوست کے ہاں۔ ایک روز میں اسے اور اس کی ماں کو سوشلسٹ یونٹی تھیٹر کے ایک موسیقی کے پروگرام میں لے کر گیا۔ ڈیوڈ ہاربرگ کے ساتھ ہم لوگ ایک ہندوستانی رقاص سے ملنے گئے، یہاں تک کہ ایک روز ہم لوگ طلبا کے رقص میں گئے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مولی نے مجھ سے اصرار کرنا شروع کر دیا کہ رقص کی کلاس میں داخلہ لے لوں۔ اس کلاس میں ہمیں quick step سکھایا گیا جس میں میں نے دیکھا کہ ہر آدمی سارے کمرے میں بلا سعی گھوم لیتا ہے لیکن میرے قدموں نے مجھے ایک چھوٹے سے مستطیل حصے تک محدود کر دیا تھا اور مجھے اس مسئلے کا کوئی حل نظر نہ آتا تھا۔ بالآخر مولی نے ہار مان لی اور ہم نے صرف فلمیں دیکھنے پر اکتفا کر لیا۔

میں جانتا تھا کہ مجھے ایسی محبت نہیں ہے جیسی میں نے میری یا جین سے کی تھی۔ لیکن مجھے یہ توقع بھی نہیں تھی کہ مجھ میں ایسا جذبہ از سر نو پیدا ہوگا۔ میں اس کے نتائج پر زیادہ سنجیدگی سے غور نہیں کر رہا تھا۔ بس اتنا کافی تھا کہ میں جنس نازک کی صحبت میں ہوں اور جنسی کشش شدت سے محسوس کرتا ہوں۔ محبت کے اظہار کے لیے کسی الگ مقام کی تلاش میں مجھے قوتِ ایجاد سے کام لینا پڑا۔ مز گروری اس کام کے لیے یقیناً مناسب جگہ نہیں تھی۔ مجھے خیال آیا کہ مولی کو ایپنگ فارسٹ (Epping Forest) لے جاؤں جہاں میں بچپن میں گھنٹوں مٹر گشتی کیا کرتا تھا۔ اس مقام سے مجھے محبت تھی اور گیارہ برس پہلے جب میں نے لاکٹن (Loughton) چھوڑا تھا، تب سے اب تک میں یہاں نہیں آیا تھا۔ یہ بہت بڑا علاقہ تھا اور یہاں ایسے بہتیرے مواقع تھے جب ہم لوگوں کی گھورتی ہوئی نظروں سے دور رہ سکتے تھے۔

لیکن تنہائی میں ملنے کے مواقع عنقا تھے، اور اس پر بھی مسز مز گروف اپنی غیر موجودگی میں بھی مولی کو مسلسل تاکید کرتی ہوئی محسوس ہوتیں کہ دیکھو شرمندہ کرنے والا کوئی کام نہ کرنا۔

Scanned with CamScanner

1947 کے اواخر تک میری اور مولی کی دوستی کو کئی مہینے گزر گئے۔ مجھے احساس تھا کہ اب کوئی فیصلہ کرنا ہی ہوگا۔ کیا یہ وقتی جذبہ تھا، یا پھر ہم واقعی شادی کرنے والے تھے؟

یہ کوئی سادہ سوال نہیں تھا۔ ہم کسی ایسے نقطۂ آغاز پر نہیں تھے جہاں دونوں کو دیوانہ وار محبت ہو۔ مولی مجھے پسند تھی اور اس کے لیے جنسی کشش کا جذبہ بھی تھا۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ شادی کی یہ کوئی معقول وجہ نہیں۔ مجھے وہی جنسی تعلق منظور تھا جس میں باہمی محبت بھی شامل ہو۔ میں ان اسباب کا اندازہ لگانا چاہتا تھا جو اس قسم کے رشتے کو بنانے میں معاون ہو سکتے ہوں اور جن کے سبب ہم مستقبل میں خوش رہ سکیں۔

اس حقیقت سے کوئی مفر نہ ہو سکتا تھا کہ ہم دونوں میں مماثل چیزیں بڑی ہی محدود تھیں۔ مولی کو رقص کرنا پسند تھا، جس سے میں واقف نہیں تھا۔ اسے دکانوں پر جانا پسند تھا، جبکہ اپنی پسند سے میں جہاں جاتا تھا وہ صرف کتابوں کی دکانیں تھیں۔ مطالعہ کرنا میرے نزدیک جینے کا ایک طریقہ تھا؛ اس کے برخلاف مولی بھی کبھار ہی پڑھتی تھی، صرف وقتی تفریح کے لیے۔ میں اپنی تعلیم میں پوری طرح ڈوبا ہوا تھا جبکہ مولی کو کچھ اندازہ نہ تھا کہ اس تعلیم کی نوعیت کیا ہے اور نہ اسے جاننے میں دلچسپی تھی۔ ہم دونوں ہی کمیونسٹ تھے — لیکن میرے نزدیک کمیونزم میری زندگی کی روح تھی جبکہ مولی محض مزدور طبقے کے کمیونسٹ والدین کی اولاد ہونے کے سبب کمیونسٹ تھی۔ اس نے جیسا سنا تھا کہ کمیونزم اچھا ہے، تو وہ اسے اچھا مانتی تھی اور بعض اوقات برانچ میٹنگوں میں میرے ساتھ شریک ہوتی تھی لیکن سیاسی سرگرمیوں میں کوئی خاص حصہ نہیں لیتی تھی۔ اچھی گفتگو کے معنی میرے نزدیک مارکسی تھیوری پر بحث کرنا تھے جبکہ مولی کا یہ خیال یقیناً نہیں تھا۔

مجھے لیکن یہ نہیں لگتا کہ ہمارے اختلافات قطعی نوعیت کے تھے۔ اسی قسم کی صورتِ حال سے میں میری کے ساتھ بھی دوچار ہوا تھا۔ وہ ایک الھڑسی دیہاتی عورت تھی۔ اس کے باوجود مجھے یقین تھا کہ ہم ایک ساتھ خوش رہ سکیں گے۔ میں مولی کے معاملے میں یہ اعتماد محسوس نہیں کر رہا تھا۔ ایک تو شدید محبت کا وہ گہرا جذبہ محسوس نہیں ہو رہا تھا جو میں نے میری کے لیے محسوس کیا تھا اور میں نے خود کو یا مولی کو کبھی اس وہم میں مبتلا نہیں کیا۔ لیکن میں یہ بھی نہیں سوچتا تھا کہ خوش رہنے کے لیے ہماری

دلچسپیوں کا یکساں ہونا ضروری ہے۔ میں یہ مانتا تھا کہ ہمیں ایک دوسرے کی دلچسپیوں اور طرزِ فکر کو معقولیت کے ساتھ تسلیم کرنا ہوگا۔

بہر حال جو بھی ہو، مولی ابھی نو عمر تھی اور میں نے محسوس کیا کہ وہ کئی معنوں میں ان گڑھ ہے۔ اس کا بچپن اور اسکولی تعلیم جنگ کے سبب چھوٹ گئے تھے۔ گیارہ برس کی عمر میں اسے ویلز کے ایک گھرانے میں بھیج دیا گیا لیکن جب یہ لگا کہ لندن میں قیام کے خطرات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جا رہا ہے تو دوسرے بہت سے بچوں کی طرح واپس بلا لیا گیا، بعد میں پھر سے ویلز بھیج دیا گیا۔ یہ کوئی خوشگوار تجربہ نہ تھا۔ اپنے والد کی چہیتی ہونے کے سبب وہ خصوصی توجہ پانے کی عادی تھی، لیکن اب اسے ایک ایسے گھرانے میں غیر کی طرح رہنا پڑا جہاں اس کی ضرورت نہیں تھی۔ مقامی اسکول کے بچوں نے لندن سے آنے والے بچوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا اور جتا دیا کہ وہ ناپسندیدہ ہیں۔ مولی نے بتایا کہ اساتذہ ان کو نظر انداز کرتے تھے۔ جب وہ لندن واپس لوٹی تب تک اسکول چھوڑنے کی عمر ہو چکی تھی، یعنی چودہ سال کی عمر — اور ابھی تک اس نے بہت کم سیکھا تھا۔ اس کو لگا کہ ان بچے کچھے چند مہینوں میں اسکول جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ گھر واپس لوٹنے کے بعد بہت کم عرصے کے اندر اس کے باپ کی موت واقع ہوگئی۔

اب مولی کی عمر انیس برس تھی لیکن اس میں کئی طرح سے اب بھی بچپنا تھا — وہ توجہ چاہتی تھی اور اپنی ماں کے کہے میں آسانی سے آجاتی تھی۔ لیکن دوسرے معنوں میں وہ ایک مکمل بالغ عورت تھی۔ زندگی نے مجھے جو مواقع دیے تھے، ویسا کوئی موقع مولی کو نہیں ملا تھا — وسیع مطالعے کا موقع، طرح طرح کے لوگوں سے ملنے کا موقع، جس سے وہ اپنی صلاحیتوں کو پہچان سکتی۔ مجھے توقع تھی کہ ذرا سی حوصلہ افزائی کر کے اسے نئی سمتوں کی جانب موڑا جا سکتا ہے اور وہ سب ڈھونڈنے میں اس کی مدد کی جا سکتی ہے جو وہ زندگی میں کرنا چاہتی ہے۔

حقیقت میں ایسا لگ رہا تھا گویا میں اپنی شادی کرانے کی، جیسے ہندستانی والدین اپنے بچوں کے لیے کرتے ہیں، خود ہی کوشش کر رہا تھا۔ ہندستان میں قیام کے سبب میں یہ جان گیا تھا کہ مغربی طریقوں کے برخلاف، اگر دونوں جانب سے نیک نیتی شامل رہے تو یہ طریقہ مکمل طور پر کامیاب رہتا ہے۔ ایسے والدین جنھیں اپنے لڑکے اور لڑکیوں کے مفاد کا دل سے خیال رہتا ہے وہ ایسے رشتے

کی تلاش میں رہتے ہیں جو ان کے مزاج سے میل کھاتا ہو، اور رشتہ طے کرتے وقت بہت سے عملی معاملات کا بھی خیال رکھتے ہیں جن کی وجہ سے شادی کی کامیابی کی راہ پہلے ہی ہموار ہو جاتی ہے۔ اگر نوجوان پہلے ہی اپنا ذہن بنالیں کہ ایک دوسرے کا خیال رکھیں گے اور شادی کو کامیاب بنانے کی تمنا رکھیں گے، تو پھر آہستہ آہستہ ان میں محبت ہو جاتی ہے، بلکہ بعض اوقات تو انھیں بہت کم عرصے میں محبت ہو جاتی ہے۔ ہمارے یونٹ کے دو ہندوستانی افسروں میں ایک نے، جس نے مجھے اپنی نجی زندگی کے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا، اپنے والدین کی پسند کی لڑکی سے شادی کی تھی۔ شادی سے پہلے وہ ایک دوسرے سے کبھی نہیں ملے تھے۔ شادی کے بعد اسے اپنی بیوی سے شدید محبت ہو گئی اور بعد وہ ہمیشہ خوش وخرم رہا۔

میں اور مولی ایک بالکل ہی مختلف معاشرے میں رہتے تھے، ایسے معاشرے میں جہاں محبت کرنے کو زندگی کا لازمہ سمجھا جاتا ہے اور شادی کے لیے تو پسندیدہ شرط، لیکن ایسی صورت میں کیا کیا جائے جب آپ کو محبت تو نہ ہو لیکن شادی کی خواہش رکھتے ہوں؟ اس موقعے کو ٹھکرانا اور کسی ایسی عورت کا انتظار کرنا جو شاید زندگی میں کبھی نہ آئے، بے وقوفی تھی۔ چنانچہ بہتر یہی تھا کہ عملی انداز میں اس پر غور کیا جائے کہ کیا ہم ساتھ ساتھ خوش رہ سکیں گے؟ مزاجوں کے فرق کے باوجود، لگتا تھا کہ گاڑی چل جائے گی۔ لگتا یہ تھا کہ اگر وہ اپنی ماں کے دائرۂ اثر سے آزاد ہو جائے تو ہم میں باہمی قرب کا اچھا رشتہ قائم ہو سکتا ہے۔ میں اس کو خوش دیکھنا چاہتا تھا اور اس کو خوش رکھنے کے لیے ہر ممکن طریقہ اختیار کر سکتا تھا۔ ہم لوگ ایک ہی چھت کے نیچے تقریباً سال بھر سے رہ رہے تھے اور ایک دوسرے کے بارے میں اتنا کچھ جانتے تھے جتنا بہت سے جوڑے شادی کے ابتدائی دور میں نہیں جانتے۔ وہ جانتی تھی کہ میں کیا ہوں، اور اس نے مجھے اسی طرح قبول کیا تھا۔ اگرچہ اس کی سیاسی وابستگی میری طرح نہیں تھی لیکن یہ بات کم از کم اسے فطری لگتی تھی اور بعد میں اس اعتراض کا خدشہ نہیں تھا کہ میں سیاسی سرگرمیوں کو کتنا وقت دیتا ہوں۔ اگر اسے یہ جاننے سے دلچسپی نہ تھی کہ میں کیا پڑھتا ہوں تو کم از کم اتنا تو وہ سمجھتی ہی تھی کہ میں اپنی تعلیم کے لیے وقت کیوں صرف کر رہا ہوں، اور اسے معلوم تھا کہ ایک اچھی یقینی ملازمت حاصل کرنے کا یہی واحد راستہ ہے۔

ہر اعتبار سے ایمانداری برتنے کے خیال سے میں نے مولی کو میری کے ساتھ اپنی محبت کے

بارے میں بتادیا— اور یہ بھی کہہ دیا کہ مجھے توقع نہیں کہ میں اس طرح سے کسی اور کے بارے میں دوبارہ محسوس کرسکوں گا، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اس کی وجہ سے ہمیں محبت کا رشتہ قائم کرنے اور ایک اچھی ازدواجی زندگی گزارنے سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔ اس نے جواب دیا کہ کناڈین سپاہی جانی کیاگ کے بارے میں وہ بھی اس طرح کا جذبہ رکھتی تھی، ان دونوں کے درمیان کوئی جنسی رشتہ نہیں بلکہ ایک مضبوط رومانی تعلق تھا اور جب اس نے سگائی توڑی تو وہ بہت تکلیف سے گزری تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کے لیے میں بھی ویسا ہی محسوس کرتی ہوں جیسا تم میری کے لیے محسوس کرتے ہو۔ میری طرح مولی کا بھی یہی خیال تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ خوش رہیں گے۔

ان معاملات پر گفتگو کے دوران ایسے کئی موقعے آئے جب ہم دونوں کے رویوں کا فرق بڑی شدت سے ابھرا۔ ایک بار میں نے پوچھا کہ اگر اس کی شادی جانی سے ہوجاتی تو جانی کے کیتھولک ہونے کے سبب وہ کس طرح معاملات کو نباہتی۔ اس نے جواب دیا، میں کوشش کرتی کہ ایک اچھی کیتھولک بن سکوں۔ ظاہر ہے کہ ایسا رویہ اختیار کرنے پر میں اسے ملامت کے قابل ہی سمجھتا اور چونکہ مجھ میں معاملہ فہمی کا فقدان ہے اس لیے میں نے اپنا یہ خیال ظاہر بھی کردیا کہ وہ اتنی آسانی سے ایسے مذہب کو کیسے قبول کرسکتی ہے جس پر اس کا یقین ہی نہیں؟ اس نے جواب نہیں دیا، لیکن میں نے جو کچھ کہا تھا اس سے اس کا حوصلہ بھی پست نہیں ہوا۔ مجھے نہیں لگتا کہ اس نے میری بات کو شدت سے محسوس کیا ہوگا اور یہ سمجھ سکی ہوگی کہ آخر میں نے اتنا شدید ردعمل کیوں ظاہر کیا۔

میرا خیال ہے کہ مولی کے نزدیک حالات کا عملی پہلو یقیناً سب سے اہم تھا۔ اس نے بھی محبت ہونے کا کوئی تاثر نہیں دیا، حالانکہ یہ بات اس کو بھلی ہی لگی ہوگی کہ میں اس کے تئیں زبردست کشش محسوس کرتا تھا۔ لیکن مزدور طبقے کی بہت سی لڑکیوں کی طرح اس کے نزدیک بھی شادی اندھی گلی سے باہر آنے کے مترادف تھی۔ وہ ایسی ملازمت کرنے کو مجبور تھی جو اسے کچھ خاص پسند نہیں تھی، اور وہ ایسے گھر میں رہتی تھی جہاں وہ اپنی ماں کے تابع تھی۔ صرف شادی ہی ایک ایسا راستہ تھا جس پر چل کر وہ ان مسئلوں سے نکلنے کا امکان دیکھ سکتی تھی۔ میں نے اس کے سامنے ایک متبادل پیش کردیا تھا اور اس نے شاید سوچا کہ اس کے سامنے جو بہتر سے بہتر تجویز آسکتی تھی، وہ آچکی ہے۔

پھر بھی، بے یقینی کی کیفیت ایسے لمحات میں پیدا ہوجاتی تھی جب کوئی واقعہ ہمارے مزاجوں

کے فرق کی وجہ سے مجھے بھڑکا دیتا۔ اپنے شبہات کا اظہار میں نے جو کلیمنٹ سے کیا، جس کی شادی جوائس (Joyce) سے ہوئی تھی اور جو اپنی ازدواجی زندگی سے خوش نظر آتا تھا۔ اس نے کہا، ''بے یقینی کا شکار ہونا ایک عام بات ہے۔ شادی کر ہی ڈالو۔'' ایک بار میں نے مسز مزگروف سے بھی بات کی اور انھوں نے بھی یہی کہہ کر میری ہمت بڑھائی کہ اب شادی کر ڈالو۔ یقیناً ان کو یہی کہنا بھی چاہیے تھا کیونکہ انھیں مجھ میں مولی کا امکانی شوہر نظر آتا تھا۔ میں ان کا کمیونسٹ ساتھی بھی تھا، برتن دھونے میں ان کی مدد کرتا تھا اور توقع تھی کہ مجھے یونیورسٹی کے استاد کے طور پر ملازمت بھی مل جائے گی، جس کے معنی یہ تھے کہ روزگار کی اور اتنی آمدنی کی گارنٹی ہو جائے گی کہ میں مولی کا نہ صرف موجودہ معیارِ زندگی برقرار رکھ سکوں گا بلکہ اس سے بہتر زندگی دے سکوں گا۔ جب میں نے کہا کہ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ مولی مجھ سے اتنی بھی محبت کرتی ہے جو ایک اچھی ازدواجی زندگی کی ضمانت کے لیے کافی ہو، تو مسز مزگروف نے قطعی طور پر یہ تو نہیں کہا تھا کہ تم کو ان رومانی خیالات پر کوئی توجہ نہیں دینی چاہیے، لیکن ان کی بات میں یہی پیغام مضمر تھا۔ اپنے زمانے کے مزدور طبقے کی بہت سی عورتوں کی طرح مسز مزگروف کو بھی ایک عدد شوہر ڈھونڈنے، اسے پانے اور اس کی وفادار رہنے کے تجربے نے اس نتیجے پر نہیں پہنچایا تھا کہ محبت، ان معنوں میں جو میں نے سمجھے تھے، شادی کا ایک لازمی جزو ہے۔ شادی کے بعد مرد اور عورت کے رول کے بارے میں ان کے خیالات بالکل واضح تھے اور ان کی عملی زندگی کے تجربے پر مبنی تھے۔ مردوں کو اتنے پہلوؤں سے عورتوں پر بالادستی حاصل ہے کہ اپنی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے وہ تمام ممکنہ حکمتِ عملیاں اختیار کرتی ہیں۔ سیکس کے بارے میں کوئی رومانی خوش فہمیاں انھوں نے نہیں پال رکھی تھیں۔ ان کے نزدیک سیکس ایسا ہتھیار تھا جس کا حسبِ ضرورت بروقت استعمال کرنا چاہیے۔ شادی شدہ عورت کے پاس سیکس کی اجازت دینا یا انکار کرنا ایسا طاقتور ہتھیار ہے جس کی مدد سے وہ اپنے شوہر کو اپنی مرضی کے مطابق چلا سکتی ہے۔ (ایسی عورت کے لیے جو شوہر سے کہنا منوانے میں ناکام ہو جاتی ہے ان کا لگا بندھا مشورہ یہ ہوتا تھا کہ اس کا میوے والا راشن بند کر دو۔) مولی جیسی غیر شادی شدہ لڑکی کے نزدیک بھی یہ اتنا ہی طاقتور ہتھیار تھا تا کہ اس بات کو یقینی بنایا جا سکے کہ مرد شادی کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔

آج جب مزگرووری میں گزرے ان دنوں کو یاد کرتا ہوں، برسوں پہلے وہاں ہم تینوں جس

Scanned with CamScanner

طرح رہتے تھے تو کچھ یوں محسوس کرتا ہوں: ایک طرف میں تھا، انتیس برس کا آدمی جسے محبت کی تلاش تھی اور توقع کر رہا تھا کہ شاید مولی ہی وہ محبت ہے۔ میں ایسی نوجوان عورت کے ساتھ رشتے کا خیال کر کے ہیجان میں مبتلا تھا جو مجھے جنسی طور پر پرکشش لگتی تھی اور مجھے شوہر کے طور پر قبول کرنے کو تیار تھی۔ دوسری طرف مولی تھی، انیس برس کی لڑکی، ابھی تک بے فکر و بے نیاز، جسے زندگی میں اس کا بھی ڈھنگ کا تجربہ نہ تھا کہ اسے کیا چاہیے۔ وہ دل لگی سے خوش تھی، بغیر کسی گہری محبت کے — لیکن وہ یہ سوچتی تھی کہ مجھ سے بہتر کوئی آدمی اس کی زندگی میں نہیں آئے گا۔ اور پھر مسز گروف تھیں جو اس صورتِ حال کو اپنی بیٹی کے لیے غیر متوقع طور پر اچھا موقع سمجھ رہی تھیں اور معاملات کو آگے بڑھانے کے لیے جو کچھ وہ کر سکتی تھیں، کر رہی تھیں۔

12

مسائل کی یلغار

اگست 1947 کا مہینہ، جب مولی اور میں پراگ میں تھے، وہ مہینہ تھا جس میں ہندستان آزاد ہوا۔ برطانیہ میں اس آزادی کو ہندستانیوں کے لیے برطانیہ کے ایک بے نظیر اور شاندار تحفے کی صورت میں پیش کیا جارہا تھا۔ یہ ایک ایسا جھوٹا پروپیگنڈا تھا جو ساٹھ برس گزرنے کے بعد اب بھی جاری ہے، بلکہ اسے تب کے مقابلے میں زیادہ وسیع پیمانے پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک تاریخ داں اینڈیو رابرٹس (Andrew Roberts) ہے جو 1994 میں یوں لکھتا ہے: ''تاریخ میں پہلی بار ایک عظیم سلطنت رضاکارانہ طور پر دے دی گئی، اور اس کے بدلے میں کچھ بھی مطالبہ نہیں کیا گیا۔''

اقتدار کی منتقلی کے بارے میں دت کے تجزیے نے، جو بالکل درست ہے، سچی تصویر سامنے لانے والے سوالات اٹھا کر اس قسم کی بکواس کو رد کر دیا ہے۔ حقیقت یہی تھی کہ انگریزوں کے لیے ہندستان پر قبضہ جمائے رکھنا ناممکن ہو چکا تھا۔ اس کا سب سے زیادہ کھلا اعتراف 1942 میں ہندستان بھیجے جانے والے مشن کے سربراہ اسٹیفرڈ کرپس (Stafford Cripps) نے اپنے اس بیان میں کیا جو اس نے 5 مارچ 1947 کو پارلیامنٹ میں دیا۔ بیان یہ تھا:

> ہمارے سامنے کون سے متبادل تھے؟ بنیادی طور پر بس دو ہی متبادل تھے۔ اوّل یہ کہ ہندستانی میں برطانوی کنٹرول کو زیادہ مستحکم کرنے کے لیے سکریٹری آف اسٹیٹ سروس کے عملے میں اضافہ کریں اور قابل لحاظ تعداد میں برطانوی فوجیں ہندستان

بھیجیں۔ اس قسم کی پالیسی کے لیے یہ قطعی فیصلہ کرنا ہوگا کہ ہم اس کے بعد ہم ہندستان میں کم از کم پندرہ بیس برسوں تک ٹکے رہیں گے۔ دوسرا متبادل یہ ہے کہ ہم اس حقیقت کو تسلیم کرلیں کہ پہلے متبادل کو عملی جامہ پہنانا غیر ممکن ہے۔

اس طرح 'دو متبادل' نہیں تھے، درحقیقت یہ ایک ہی تھا۔

حکومت سونپنے کے آخری مراحل بہت ہی جلد بازی میں طے کیے گئے، جس کے بڑے تباہ کن نتائج برآمد ہوئے۔ آخری انگریز وائسرائے ماؤنٹ بیٹن (Mountbatten) نے آزادی کا اعلان صرف چند ہفتے پہلے کیا، جو دو ریاستوں — ہندستان اور پاکستان — کی صورت میں تقسیم پر مبنی تھا۔ دونوں جانب کی اقلیتوں میں خوف و ہراس چھایا ہوا تھا۔ ہزار ہا لوگوں نے سرحدیں پار کیں جس میں انتہائی دہشت ناک قتلِ عام ہوا۔ اُس علاقے میں جہاں پاکستان بنا، وہ ہندو اور سکھ قتل کر دیے گئے جو ہندستان نہیں جا سکے، اور سرحد پار ہندستان میں مسلمانوں کو اسی بدنصیبی کا سامنا کرنا پڑا۔ اگر ماؤنٹ بیٹن نے اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے کام کیا ہوتا تو اس خوفناک قتلِ عام اور بڑے پیمانے پر ہونے والی ہجرت کو ممکنہ حد تک یقیناً روکا جا سکتا تھا، گو کہ اُس وقت اس صورتِ حال کا ہمیں اندازہ نہ تھا۔

برطانیہ اور نو آزاد ریاستیں اب ایک دوسرے کے ساتھ ایک الگ قسم کے بے ڈھب رشتے میں منسلک ہوگئیں۔ ہندستان اور پاکستان، دونوں ملکوں کے ہائی کمشنر لندن پہنچے اور دستور کے مطابق ان کا باقاعدہ استقبال کیا گیا۔ 13 ستمبر کو میں اپنے سوالیس کے دوست ڈیوڈ ہاربرگ (جوز بانوں کے بین الاقوامی کلب کا رکن تھا) کے ساتھ ایک گارڈن پارٹی میں گیا جو کرویڈن (Croydon) میں رکھی گئی تھی، تو میں نے دیکھا کہ دونوں ہائی کمشنر اس میں اعزازی مہمان کے طور پر شریک تھے۔ مہمانوں کی آفیشیل فہرست میں بھانت بھانت کے ملکوں کے سفیروں کے نام شامل تھے (ان میں مشرقی یوروپ کی نوزائیدہ ریاستوں کے سفیر بھی شامل تھے)۔ اس موقعے پر ہندستان اور پاکستان، دونوں ممالک کے قومی ترانوں کی دُھنیں اسکاٹس گارڈز (Scots Guards) کے بینڈ نے بجائیں۔ یہ غالباً پہلا اور آخری موقع تھا جب دونوں ملکوں کے ترانے، ایک ہی تقریب میں ایک ساتھ گائے گئے۔

Scanned with CamScanner

سوا ایس میں داخلے کا دوسرا سال شروع ہوتے ہوتے مجھے پارٹی میں ایک ایسا نیا کام مل گیا جسے میں بہتر طور پر انجام دے سکتا تھا اور اس سے لطف اندوز بھی ہوتا۔ لندن کے طلبا پر مشتمل پارٹی کی تنظیم نے مجھ سے معلوم کیا کہ آیا میں ہندستانی طالب علموں پر مشتمل نئے اراکین کے ایک گروپ کو مارکسی لینِنی نظریات کی کلاس پڑھا سکوں گا۔ میں راضی ہو گیا، اور اس طرح ہم لوگ ہر ہفتے، جمعرات کی شام کو، ملنے لگے۔ ان میں سے وہ پانچ پابندی سے آتے تھے جو لندن یونیورسٹی کے مختلف کالجوں میں زیرِ تعلیم تھے۔ ایک اور صاحب نورالحسن تھے جو آکسفرڈ سے ڈی فل کر رہے تھے، اور انھیں جب جب فرصت ہوتی، ان میٹنگوں میں شرکت کرتے تھے۔ ان کلاسوں کی تیاری میں بڑی محنت سے کرتا تھا، اور اس وقت کے بنائے ہوئے نوٹس میرے پاس اب بھی محفوظ ہیں۔ ان کلاسوں میں میں نے ایسے تمام کلیدی تصورات کا احاطہ کیا جو مارکسی لوگ سماج کے تجزیے کے لیے، اور ان سماجی عوامل کی تفہیم کے لیے بروے کار لاتے ہیں جن کی مدد سے معاشرے میں انقلابی تبدیلیاں لائی جا سکتی ہیں۔ ہم نے انیسویں صدی کے اواخر میں شروع ہونے والے 'سامراجیت کے دور' کی ابتدا سے لے کر حالاتِ حاضرہ تک کا احاطہ کیا۔ پھر 'سرمایہ داری کے عمومی بحران' پر بحث کی (جس کی شروعات رائج کمیونسٹ نظریے کے مطابق جنگوں اور انقلابوں کے 'پہلے دور'، یعنی 21-1914 کے عرصے میں ہوئی اور اب بھی جاری تھی)۔ اس کے علاوہ بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں بین الاقوامی سطح پر کمیونسٹ تحریک کے لائحۂ عمل، 'عوامی محاذ کا دور'، فاشزم کے فروغ کو روکنے کے لیے بنایا گیا اتحاد، دوسری جنگِ عظیم، مشرقی یوروپ کی 'عوامی جمہوریتیں' جیسے موضوعات پر گفتگو کی۔ میں نے ان موضوعات پر بات کرتے ہوئے اپنے ہی نظریات رکھے، پارٹی کا نظریہ ابھی تک سامنے نہیں آیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ میں نے اس بات کی وضاحت نہیں کی۔

ان کلاسوں سے میں اور طلبا، دونوں نے خوب لطف اٹھایا۔ سب سے زیادہ خوش کن بات میرے لیے یہ تھی کہ میں کلاس کے شرکا کو خود سے غور و فکر کرنے پر آمادہ کرتا تھا تا کہ یہ اندازہ لگا سکوں کہ عملی تجربے کے مقابلے میں ان کے ہاں نظریاتی تصورات کی فہم کس حد تک پیدا ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ میں انھیں اس کی بھی ترغیب دیتا تھا کہ جس بات سے وہ مطمئن نہ ہوں اس پر بے خوف ہو کر کھلی بحث کریں۔ لیکچر دینے کے مروجہ طریقے سے میں نے اجتناب برتا، اس کے مقابلے میں وہ طریقہ

Scanned with CamScanner

اختیار کیا جس کو پارٹی کا شعبۂ تعلیم 'کنٹرولڈ ڈسکشن' سے تعبیر کرتا تھا، یعنی ایسی بحث جو قابو سے باہر نہ ہونے پائے۔ یہ طریقہ میں نے فطری طور پر اپنے ہندستانی سپاہیوں کے ساتھ بحثوں کے دوران اپنایا تھا۔ جس میں میں یہ جاننے کی کوشش کرتا تھا کہ کسی مسئلے پر یہ لوگ کیا جانتے ہیں، اور اس کے بعد دقیق جناتی الفاظ سے بچتے ہوئے عام فہم زبان میں ان سے بات شروع کرتا تھا۔ اور اس طرح ان کی معلومات کی خامیوں اور کمیوں کو منطقی ربط کے ساتھ دور کرنے اور درست معلومات فراہم کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اِن کلاسوں کے لیے بھی میں نے یہی طریقہ اختیار کیا، لیکن ظاہر ہے کہ تعلیم کی بالکل مختلف سطح پر یہ کام کیا گیا۔ میں نے بات شروع کرتے ہوئے کہا کہ حالانکہ لوگوں کے ساتھ روزمرہ کی گفتگو میں مارکسی زبان کا استعمال کرنا مناسب نہیں لیکن مارکس نے چند کلیدی تصورات کے لیے ایسے الفاظ دیے ہیں جنھیں ہم تکنیکی اصطلاحیں کہہ سکتے ہیں، اور جو معاشرے کے تجزیے اور یہ سمجھنے کے لیے بڑے مفید ہیں کہ انقلابات کیونکر رونما ہوتے ہیں۔ ضروری ہے کہ ہم ان تکنیکی اصطلاحوں کا مفہوم اچھی طرح سمجھتے ہوں تاکہ ان کا صحیح استعمال جان سکیں۔ اس کے بعد میں نے کوشش کی کہ وہی لوگ ان اصطلاحوں کا مطلب بتائیں۔ بات چیت عموماً کچھ اس طرح ہوتی تھی:

رالف: مثلاً ہم 'پرولتاریہ' کی بات کریں گے۔ 'پرولتاریہ' کے کیا معنی ہیں؟ 'پرولتاری' کسے کہتے ہیں؟

الف: پرولتاریہ کے معنی ہیں مزدور، وہ لوگ جو کام کرتے ہیں۔

رالف: کیا کام کرنے والے تمام لوگ اس زمرے میں شامل ہیں؟

الف: جی ہاں، میرے خیال میں۔

رالف: کسانوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟ ہمارے ملک میں وہ کوئی بڑا طبقہ نہیں ہیں، لیکن ایسے بھی ممالک ہیں جہاں ایک بڑا طبقہ کسانوں پر مشتمل ہے؟ کیا کسان بھی پرولتاری ہیں؟

الف: جی ہاں میرے خیال میں ایسا ہی ہے۔

ب: نہیں، میرے خیال میں یہ بات درست نہیں۔

رالف: کیوں درست نہیں ہے؟

Scanned with CamScanner

ب: وجہ تو نہیں معلوم، لیکن مجھے نہیں لگتا کہ ان کا شمار پرولتاریہ میں کرنا چاہیے۔

رالف: تمھاری بات درست ہے۔ ہم انھیں شامل نہیں کرتے۔ لیکن اس موضوع پر ہم بعد میں بات کریں گے۔ فی الحال اتنا جاننا کافی ہے کہ پرولتاریہ طبقے میں کسان شامل نہیں کیے جاتے۔ اب بتائیے کہ پرولتاریہ میں کون لوگ شامل ہوں گے؟

ج: فیکٹری مزدور، صنعتی طبقہ۔

رالف: کوئی اور؟ کیا آفس میں کام کرنے والے پرولتاری نہیں ہیں؟

د: جی ہاں، وہ بھی ہیں۔

رالف: وہ کیسے؟

د: کیونکہ وہ بھی اجرت پر کام کرتے ہیں۔

رالف: تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو بھی اجرت پر کام کرے، وہ پرولتاری ہے؟

د: جی ہاں۔

رالف: میں یونیورسٹی میں طالب علم ہوں اور لیکچرر بننے کی تیاری کر رہا ہوں۔ کیا میں بھی پرولتاری ہوا؟

د: جی ہاں... جی نہیں... یقین سے نہیں کہہ سکتا۔

اور اس طرح گفتگو آگے بڑھتی جاتی، یہاں تک کہ وہ سطح آجاتی جب میں کمیونسٹ منشور میں شامل مارکس اور اینگلس کی دی ہوئی پرولتاریہ کی تعریف نقل کرتا اور وضاحت کرتا تھا کہ اس قسم کی اصطلاحوں کا درست مفہوم سمجھنا ایک مارکسی فرد کے لیے کیوں ضروری ہے۔[1] اس بحث میں ہر شخص سرگرم حصہ لیتا اور محسوس کرتا تھا کہ مارکسی نظریے کی بہتر تفہیم میں اس نے بھی پوری کلاس کی مدد کی ہے۔

---

[1] کمیونسٹ مینی فیسٹو میں پرولتاریہ کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:
'The Class of modern wage-labourers who, having no means of production of their own, are reduced to selling their labour power in order to live.'

Scanned with CamScanner

ہندستانی کمیونسٹوں کے ساتھ ازسرِنو باقاعدہ رابطے میں آنا اور یہ جاننا کہ وہ کن معاملات سے وابستہ ہیں، میرے لیے بڑا جوش انگیز تھا۔ برطانوی کمیونسٹ پارٹی نے ان کو منظم ضرور کیا تھا لیکن اس کی توجہ کا مرکز برطانیہ میں ہندستانی طلبہ کی غیر سیاسی تنظیمیں اور ان کی وسیع تر سرگرمیاں تھیں۔ ہندستان اور پاکستان کی آزاد مملکتوں کے قیام کے بعد ان کی سرگرمیوں کے سیاسی سیاق و سباق میں انقلابی تبدیلی آچکی تھی، اور اب بہت سے عملی معاملات تھے جن پر غور کرنے کی ضرورت تھی۔ قومی آزادی عام ہندستانیوں کے لیے بہت سی مثبت تبدیلیوں کا پیش خیمہ تھی لیکن اس سے اُن اقتصادی اور سیاسی ڈھانچوں میں کوئی بدلاؤ آنے والا نہیں تھا جنھوں نے دسیوں لاکھ ہندستانیوں کو مفلس اور کمزور بنا رکھا تھا۔ ایسے حالات میں جب کہ مقبولِ عام رویہ یہ کہنے کا تھا کہ جدوجہد کے دن ختم ہوئے، ہندو پاکستان کی کمیونسٹ پارٹیوں کے سامنے مشکل ترین کام مزید انقلابی تبدیلیاں لانے کی کوششیں کرنے کا تھا۔

ابتداً اس گروپ کا سربراہ برطانوی پارٹی کا ایک رکن جان سیویلے (John Saville) تھا جو جنگ کے زمانے میں ہندستان میں رہ چکا تھا۔ یہ کام اس کو پارٹی ہیڈکوارٹر نے سونپا تھا لیکن یہ بات میری فہم سے بالاتر تھی کہ آخر اس گروپ کی رہنمائی کا کام کوئی ہندستانی طالب علم کیوں نہیں سنبھال سکتا۔ مجھے یہ دیکھ کر متلی سی آتی کہ وہ ایک گرو کی مانند اس کی پرستش کرتے تھے۔ اس سے بھی زیادہ بری بات یہ تھی کہ وہ اپنی اس برخود غلط حیثیت سے خوب لطف اندوز ہوتا محسوس ہوتا تھا۔ برطانوی اور ہندستانی کمیونسٹوں کے باہمی تعاون میں درآنے والی اس غیر کمیونسٹ اور قابلِ نفرین صورتِ حال سے میں دونوں کو ہی نجات دلانا چاہتا تھا۔ اسی لیے میں نے بڑے پُرزور انداز میں یہ بات رکھی کہ جان کے بجائے کسی ہندستانی کو اس گروپ کی قیادت کا بار سونپا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس بار ایک اور کمیونسٹ برائن پیئرس (Brian Pearce) کو، جو ہندستان میں رہ چکا تھا، گروپ کا سربراہ بنا دیا گیا۔ وہاں برائن سے میری کوئی شناسائی نہ ہوئی تھی لیکن برطانیہ لوٹنے کے بعد اس سے متعارف ہوا تھا۔ میں نے ایک بار پھر کسی ہندستانی کو گروپ کی قیادت سونپنے کی بات اٹھائی، اور میں نہیں جانتا کہ یہ میری دلیلوں کا نتیجہ تھا یا کچھ اور، بہرحال قیادت ایک ہندستانی کمیونسٹ دلیپ بوس کو سونپ دی گئی۔

افسوس کا مقام ہے کہ اس کے بعد بھی ایسی تبدیلیاں نہیں آئیں جن کی میں توقع کر رہا تھا۔ انگریز گروؤں کی جگہ دلیپ نے لی تو اس نے خود کو دوسرے درجے کے گرو کی صورت میں پیش کیا، اور

Scanned with CamScanner

ایک خاص مستقل مزاجی کے ساتھ مہمان آر پام دت کے ہاں اپنی خوشامدانہ حاضر باشی کے ذریعے اپنا نام کنگ اسٹریٹ کی گڈ بک میں بھی درج کرالیا اور اپنے رفیق ہندستانی طالب علموں کی گڈ بک میں بھی، یہ ظاہر کر کے کہ وہ دت کے قریبی لوگوں میں سے ہے۔

اسی دوران 1947 کے آخری مہینوں میں میری سیاسی زندگی کا بحران شدید تر ہوتا گیا۔ مارکسزم کی جو کلاسیں میں پڑھا رہا تھا، غالباً وہی اس بحران کا سبب بھی بنیں۔ ایسے نئے اراکین کے ساتھ کام کرنا جو پارٹی تنظیم کے بنیادی مسائل سمجھنے میں زیادہ دلچسپی لیتے ہوں، مجھے موری لیویٹاس (Morry Levitas) کے کام سے زیادہ مفید کام نظر آتا تھا جس کے ساتھ میں ہفتے کے روز ایسے راہگیروں کو روک کر بات کرتا تھا جو ہماری بات سننے کو تیار نہ تھے۔ بات یہ بھی تھی کہ مجھے اپنی پسند کے اہم موضوعات پڑھانے کی مکمل آزادی تھی، اور اس کی وجہ سے میں یہ دیکھنے میں کامیاب ہوا کہ طالب علموں کو جو تربیت میں دے رہا ہوں اس میں اور دوسرے عام ممبروں کے درمیان ایسی ہی رغبت پیدا نہ ہونے کے درمیان کس قدر بڑا فاصلہ ہے۔ پارٹی کو درپیش مسائل کو حل کرنے کے بارے میں غور کرنے کی بات تو جانے ہی دیں، مجھے اس بات کا بھی کوئی اشارہ کہیں سے نہیں ملا کہ پارٹی لیڈرشپ کو یہ معلوم رہا ہو کہ پارٹی کو کس قسم کی مشکلات درپیش ہیں۔ ان تمام معاملات نے مل کر ایک شدید قسم کا احساس اس فریب سے نکلنے کا میرے دل میں پیدا کر دیا، اور یہ احساس بھی کہ اب تو کچھ نہ کچھ ہونا ہی چاہیے۔

دسمبر 1947 کے آتے آتے یہ احساس شدید ہو چلا تھا کہ اب کسی سینئر حیثیت والے لیڈر سے بات کروں جو میرے تفکرات کو سنجیدگی سے لے۔ چنانچہ میں نے جیمز کلگمین سے رابطہ کیا اور کرسمس کی چھٹیوں کا ایک دن ان کے ساتھ گزارا۔ اس دن کی گفتگو کے نوٹس آج بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔ اس ملاقات میں مقامی شاخوں کی تمام بڑی خامیوں کا میں نے ذکر کیا تھا۔ یہ بھی کہ سب سے زیادہ تجربہ رکھنے والے کمیونسٹ اپنا وقت برانچ لیڈرشپ کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کی کوششوں میں صرف کرنے کے بجائے دوسرے کاموں میں لگاتے ہیں، مقامی شاخ کے لیڈروں کے ہاں اس کا کوئی تصور نہیں کہ ان کے علاقے میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے اُن کا بھی کوئی واسطہ ہے۔ ان کو اوپر

Scanned with CamScanner

سے جو ہدایات دی جاتی ہیں وہ فی الحقیقت انھیں اپنے مقامی مسائل پر کام کرنے سے تو نہیں روکتیں لیکن قومی اور بین الاقوامی مسائل پر ان کے مطالبات اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ اور کچھ کرنے کا وقت ہی نہیں بچتا۔ نظریاتی کمزوری مستقل صورت میں تھی۔ قومی پیمانے پر تو لیڈرشپ نے زبانی طور پر اپنے نظریے کو فروغ دینے کی ضرورت کو تسلیم کیا لیکن عملی سطح پر ان کمیونسٹ دانشوروں کے ساتھ معاندانہ رویہ رکھتی تھی جنھوں نے اس کی کوشش کی۔

پارٹی کا اس سوال کی غیر معمولی اہمیت کو نہ دیکھ پانا، بنیادی یونٹوں کی صحیح صورتِ حال سے ناواقف رہنا، اور اس سے بھی بری بات ان خامیوں سے جان بوجھ کر چشم پوشی کرنا میرے نزدیک قابلِ گرفت تھا۔ میرا خیال تھا کہ 'اس صورتِ حال کو ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے، جبکہ برسوں پہلے ہی اس کا مداوا کیا جانا چاہیے تھا۔'

اس کے بعد میں اپنا یہ تصور رکھا کہ پارٹی کے مقامی یونٹ کو کس طرح کام کرنا چاہیے، اور صورتِ حال کو بدلنے کے لیے قومی لیڈرشپ کو کیا کیا اقدامات کرنے چاہییں۔ پہلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ مقامی شاخ کی لیڈرشپ میں باصلاحیت کیڈر بھیجے جائیں اور ان کو مناسب تربیت دی جائے۔ مرکزی پارٹی کی جانب سے ان پر کام کا بار کم کیا جائے اور مقامی سرگرمیاں شروع کرنے کے سلسلے میں ان کی مزید رہنمائی کی جائے۔ اس کے علاوہ ماس پارٹی یا عوامی جماعت کے سوال کی بھی پارٹی وضاحت کرے۔

آخر میں میں نے یہ بتایا کہ کن بنیادوں پر میں یہ سوچتا ہوں کہ پارٹی یہ سب کام نہیں کر رہی ہے — ''وجہ یہ ہے کہ خود ان کے ذہنوں میں یہ مسائل واضح نہیں ہیں، اور کسی ایسے کیڈر کی تربیت کے وہ اہل ہی نہیں ہیں جس کو ان باتوں کی فہم ہے — ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ ہاں میں ہاں ملانے والے اور ایسے کمزور یا زبان بند رکھنے والے لوگوں کو بڑھاوا دیتے ہیں جو لیڈرشپ پر کوئی نکتہ چینی نہیں کرتے۔'' ضرورت اس بات کی ہے کہ پارٹی کے ایسے اراکین کو، جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان حالات کو درست کرنے کے لیے کیا کرنا چاہیے، آگے آ کر کام شروع کر دینا چاہیے۔ اس میں وہ لیڈرشپ کے کم، اور اصولوں کے زیادہ وفادار بن کر کام کریں۔

اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر کے مجھے اچھا ہی لگا۔

Scanned with CamScanner

جیمز نے میری باتیں سنیں، سمجھیں، ہمدردی کا اظہار کیا، لیکن ساتھ ہی اس سے اختلاف کیا کہ تصویر اتنی سیاہ ہے جتنی میں نے پیش کی ہے۔ لیڈرشپ کی خامیوں کے بارے میں انھوں نے صرف اتنا ہی کہا کہ ''لیڈرشپ مجموعی طور پر پارٹی کا ہی عکس ہوتی ہے۔'' انھوں نے اس بات کو تسلیم نہیں کیا کہ پارٹی نے اچھے لوگوں کی حوصلہ شکنی کی ہے، اور کہا کہ پارٹی میں بارسوخ حیثیت تک پہنچنا خاصا آسان کام ہے۔ میری تمام باتوں میں سے انھوں نے صرف اس سے اتفاق کیا کہ لیڈرشپ مقامی شاخوں سے بہت زیادہ مطالبات کرتی ہے۔ انھوں نے کہا، ''برانچ سکریٹری کو دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے — ذہنی پختگی اور ایک بڑی سی ردّی کی ٹوکری کی۔''

اس گفتگو کے بعد میرے نزدیک ایک دور کا خاتمہ ہوگیا۔ ہندستان سے میری واپسی کے بعد دو برس کے عرصے میں میری سیاسی فکر میں بڑی دوررس تبدیلیاں آگئی تھیں۔ میرے آئیڈیل اور ان کے تئیں میری وفاداری اپنی جگہ برقرار تھی لیکن پارٹی کے تئیں میرا یہ ولولہ خیز اعتماد ٹوٹ چکا تھا کہ وہ اِن مقاصد کے حصول کا مناسب آلہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میرا ذہن اُس فیصلہ کن موڑ پر پہنچ گیا تھا جہاں میں پرانی روش پر چل کر اپنی وفاداری کا کوئی عملی مظاہرہ نہیں کرسکتا تھا۔

اس تمام دور میں مجھ پر جو بھی ردِعمل ہوا، میں نے اس پر اپنے کمیونسٹ دوستوں سے ضرور گفتگو کی۔ ان میں سے پارٹی کے ساتھ چند دوستوں کی وفاداریاں قدیم طرز کی تھیں، چنانچہ میں ان سے جو کچھ بھی کہتا وہ اس سے متفق ہونے کے اہل ہی نہیں تھے۔ کرس اور اس جیسے دوسرے لوگ میرے باتوں سے اتفاق رکھتے تھے لیکن مجھے نہیں لگتا کہ کرس نے بھی کوئی ایسا صدمہ محسوس کیا ہو جس سے میں دوچار تھا۔ کرس کی ایمانداری پر مجھے پورا اعتماد تھا لیکن ایسے دوسرے لوگوں کے بارے میں میں مشکوک ہوگیا جن پر ان حقائق کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ اگر وہ پہلے سے یہ بات جانتے تھے کہ لیڈرشپ میں کیا کیا خرابیاں ہیں، تو وہ ان سے دوبدو کیوں نہیں ہوئے؟ میں نے ایک کمیونسٹ ساتھی سے، جس سے ہندستان میں مختصر سی ملاقات ہوئی تھی، پوچھا کہ کیا تم اس سلسلے میں کچھ کروگے تو اس نے جواب دیا، ''نہیں، میں اس جھنجھٹ میں ہرگز نہیں پڑوں گا۔'' کیا پارٹی کے ایمانداری اور خوداحتسابی کے اُن اصولوں کا اس شخص کے نزدیک کوئی بھی مطلب نہ تھا جن کو میں نے اس قدر سینچ کر رکھا تھا؟

Scanned with CamScanner

مجھے کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ پارٹی کے کئی لیڈروں کے لیے میرے دل میں جو تحسین کا جذبہ تھا وہ غلط تھا۔ مثلاً پولٹ اور دت، دونوں کے لیے میں اپنے دل میں کئی اعتبار سے تعظیم محسوس کرتا تھا، اور یہ جذبہ اب بھی برقرار تھا۔ شاید یہ بھی ایک سبب تھا کہ ان کی ناپسندیدہ صفات پتا چلنے پر مجھ پر اس قدر شدید ردِ عمل ہوا تھا۔ مجھے اس تکلیف دہ حقیقت کا سامنا بار بار کرنا پڑا تھا کہ کمیونسٹ رہ نماؤں میں اور عام کارکنوں میں بھی قابلِ تحسین اور ناپسندیدہ دونوں قسم کی صفات بیک وقت پائی جاتی ہیں۔ اگر رہ نما کوئی معیار قائم نہیں کر سکتے تو پھر کون یہ توقع کر سکتا ہے کہ تحریک مجموعی طور پر اپنے معیاروں پر پورا اترے گی؟ میں جانتا تھا کہ میں ان کے مطابق جینے کی کوشش کرتا رہوں گا اور جب جب یہ دیکھوں گا کہ لیڈر ان کے مطابق نہیں چل رہے ہیں تو میں ان کو چیلنج بھی کروں گا۔

جو کچھ میں نے کھویا وہ بہر حال ایسا نہیں تھا جس کا میں رونا روتا رہوں، کیونکہ اس کی بنیادیں حقائق کی ناپختہ فہم پر استوار تھیں۔ جو کچھ میں نے پایا وہ ایک زیادہ متوازن احتساب تھا کہ میں کہاں کھڑا ہوا ہوں، اور میرے اطراف و جوانب میں جو چیزیں ہیں وہ کہاں کھڑی ہیں۔ اور اس کے سبب مجھے یہ زمین فراہم ہو گئی کہ میں زندگی کے تئیں اپنا بہترین مصرف طے کر سکوں۔

❋❋

Scanned with CamScanner

نئی کتابیں

مٹی کی کان
(کلیات)
افضال احمد سید
قیمت:500 روپے

کلی منجارو کی برفیں
(منتخب ترجمے)
محمد خالد اختر
قیمت:120 روپے

خودکشی کے موسم میں
(نظمیں)
زاہد امروز
قیمت:120 روپے

ساری نظمیں
(کلیات)
ذی شان ساحل
(زیر طبع)

درخت نشیں
(اطالوی ناول)
اتالو کلوینو
ترجمہ: راشد مفتی
قیمت:175 روپے

شہزادہ احتجاب
(ایرانی ناول)
ہوشنگ گلشیری
ترجمہ: اجمل کمال
قیمت:70 روپے

پریم وانی
میرا بائی
(گیت، ترجمہ اور فرہنگ
مرتبہ: سردار جعفری
قیمت:395 روپے

کبیر بانی
کبیر
(گیت، ترجمہ اور حواشی)
مرتبہ: سردار جعفری
قیمت:395 روپے

Scanned with CamScanner

سٹی پریس بک شاپ میں دستیاب کتابیں

جدید شاعری

کلیاتِ اقبال	اقبال	Rs.300
نسخہ ہائے وفا	فیض احمد فیض	Rs.300
کلیاتِ راشد	ن م راشد	Rs.400
سروادی سینا	فیض احمد فیض	Rs.100
مرے دل مرے مسافر	فیض احمد فیض	Rs.90
برگِ آوارہ	حبیب جالب	Rs.140
سرِ مقتل	حبیب جالب	Rs.100
اس شہرِ خرابی میں	حبیب جالب	Rs.140
عہدِ سزا	حبیب جالب	Rs.130
حرفِ حق	حبیب جالب	Rs.140
پتھر کی زبان	فہمیدہ ریاض	Rs.100
بدن دریدہ	فہمیدہ ریاض	Rs.110
نظمیں	محمد سلیم الرحمٰن	Rs.300
ایک موسم کے پرندے	سہیل احمد خاں	Rs.50
حرفِ شناسائی	ادا جعفری	Rs.165
فرار ہونا حروف کا	حسن عابدی	Rs.150
ترکش	جاوید اختر	Rs.150
قسم ہے کفارے کی	سلیم شہزاد	Rs.200
تیز بارش کے دوران	احمد آزاد	Rs.120
اور میں سوچتا رہ گیا	اجمل سراج	Rs.160

Scanned with CamScanner

نیند کی مسافتیں / میز پر رکھے ہاتھ	عذرا عباس	Rs.150
میں لائنیں کھینچتی ہوں	عذرا عباس	Rs.100
حیرت کے اس پار	عذرا عباس	Rs.100
یہاں کچھ پھول رکھے ہیں	شاہدہ حسن	Rs.150
دھوپ اپنے حصے کی	عشرت آفرین	Rs.200
یادیں بھی اب خواب ہوئیں	فاطمہ حسن	Rs.200
یاد کی بارشیں (کلیات)	فاطمہ حسن	Rs.350
تکرار ساعت	عرفان ستار	Rs.150

غیر ملکی ناولوں کے ترجمے

آمنہ	(نائیجیریا)	محمد کبیر عمر	ترجمہ: ثمر احمد	Rs.220
اور ڈان بہتا رہا	(روس)	میخائل شولوخوف		Rs.350
اعتراف	(جاپان)	فومیو نیوا	نظیر صدیقی	Rs.320
برما کا ستار	(جاپان)	مچیوتا کے یاما	عطا صدیقی	Rs.85
اداسی کی رُت	(الجزائر)	علی غالم	قاضی جاوید	Rs.50
سلطانہ کا خواب	(بنگلہ دیش)	رقیہ سخاوت حسین	عارفہ سیدہ زہرا	Rs.90
دکھ درد کے جزیرے	(انڈونیشیا)	پرمودیہ انتا طور	تنویر اقبال	Rs.250
کانٹوں کی کھیتی	(ملائیشیا)	شاہنان احمد	محمد ارشد رازی	Rs.130
ابابیل	(مراکش)	لیلیٰ ابوزید	عارفہ سیدہ زہرا	Rs.70
ساون دیس	(تھائی لینڈ)	پیرا سدھم	شفقت تنویر مرزا	Rs.200
خاموشی	(جاپان)	سوشا کو اینڈو	مسعود اشعر	Rs.100
کرامازوف برادران	(روس)	فیودر دستوئیفسکی	شاہد حمید	Rs.700
چھوٹا یوفس	(ہالینڈ)	فریڈرک ولم فان ایدن	فاروق خالد	Rs.650

Scanned with CamScanner

آج کی کتابیں

ساری نظمیں
(کلیات)
ذی شان ساحل
(زیرِطبع)

منتخب مضامین
(تنقید و تحقیق)
نیر مسعود
(زیرِطبع)

ایرانی کہانیاں
(جلد دوم)
ترتیب: اجمل کمال
(زیرِطبع)

شہنشاہ
ریشارد کاپوشنسکی
ترجمہ: اجمل کمال
(دوسرا ایڈیشن زیرِطبع)

ثقافتی حبس اور پاکستانی سوسائٹی
(سماجی تنقید)
ارشد محمود
(زیرِطبع)

بارہ ہندوستانی شاعر
(انتخاب)
ترتیب: اجمل کمال
(دوسرا ایڈیشن زیرِطبع)

Scanned with CamScanner

٦٢

قیمت

۱٦۰ روپے

آج کی کتابیں

۳۱٦ مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ،

صدر، کراچی ۷۴۴۰۰

Scanned with CamScanner